بادشاہ نامہ

ہندوستان کے عظیم حکمرانوں کی زندگی، عہد اور کارنامے

ٹی۔ ایس۔ مارٹن

ترجمہ: محمد مجیب

بادشاہ نامہ

ہندوستان کے عظیم حکمرانوں کی زندگی، عہد اور کارنامے

ٹی۔ ایس مارٹن

ترجمہ: محمد مجیب

العصر پبلیکیشنز

5- شوکت پلازہ، 16-B ٹیمپل روڈ، صفانوالہ چوک

لاہور، فون: 042-7005287,6302904

alasrpublications@yahoo.com

کتاب کا نام	:	بادشاہ نامہ
مصنف	:	ٹی۔ایس مارٹن
ترجمہ	:	محمد مجیب
ناشر	:	**العصر پبلیکیشنز**
		5-شوکت پلازہ، 16-B ٹیمپل روڈ
		صفانوالہ چوک لاہور،
		فون: 042-7005287,6302904
اہتمام	:	ایم جمیل انجم
پرنٹرز	:	زین نعمان پرنٹرز
سالِ اشاعت	:	اپریل 2008ء
قیمت	:	350 روپے

فہرست

پیش لفظ

تاریخ اپنے بہاؤ میں متعین منزلوں سے گزرتی اور مستقبل کے لئے نئی راہیں بناتی ہے۔ یہ راہیں حال کے ساتھ ابھرتی اور ماضی کے ساتھ مدھم ہوتی چلی جاتی ہیں۔

سرزمین برصغیر صدیوں کی انسانی تہذیب، تمدن، ادب اور ثقافت کا عظیم الشان گہوارہ ہے۔ یہاں کی تاریخ نویسی کی داستان کا باقاعدہ آغاز مفتی غلام سرور لاہوری سے شروع ہوتا ہے اور ان کے شاگرد منشی کنہیا لال اور اس کے بعد سید محمد لطیف کی تاریخ نویسی کے بعد ایک بہت بڑا خلا نظر آتا ہے۔ البتہ ان سے بہت پہلے سکھوں، مغل شہنشاہوں اور انگریزوں کے عہد سے متعلق فارسی اور انگریزی میں لکھا ہوا بہت سا معاصر اور مابعد کا تاریخی مواد مل جاتا ہے۔

بعض انگریز تاریخ نویسوں بلکہ انگریز افسروں نے بھی سکھوں اور انگریزی دور کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ ان سب فارسی اور انگریزی کتابوں میں بہت سی باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ اور بے شمار سرکردہ اور لائق صد آفرین واقعات کو یک لخت فراموش کر دیا گیا ہے اور اصل حقائق اور واقعات کو بری طرح مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند تاریخ کے جس بہاؤ کے آخری نقطۂ کے طور پر آیا وہ انیسویں صدی کے نصف تک پہنچنے سے پہلے طویل ماضی سے گزرا تھا۔ تاریخی سلسلہ کی یہ کڑیاں

جب تک سامنے نہ ہوں ہم تاریخی حالات و واقعات کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان کڑیوں کو بڑی عرق ریزی، محنت شاقہ اور ٹھوس مطالعہ کے بعد اپنے برسوں کے مشاہدات کو اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے اور واقعات کا ایک تہہ در تہہ سلسلہ جمع ہو گیا ہے۔

چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں برہمنیت کی بالا دستی اور فوقیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک اصلاحی تحریک اٹھی۔ یہ تحریک اپنے عروج پر پہنچ کر بدھ مت روپ اختیار کر گئی۔ جو اس کے بانی بُدھ کے نام سے موسوم ہوئی۔ بُدھمت کے بانی اصل نام ''سدھارتا'' تھا۔ ژولیدہ سر لوگ اپنے ذہنی الجھاؤ کو سلجھانے کی خاطر ان پاس جاتے اور استفسار کرتے: ''کیا تم کوئی خدا ہو؟'' انہیں جواب ملتا: ''نہیں''۔ ''یا تم فرشتہ ہو؟''...... ''نہیں''۔ ''ولی ہو؟'' ''نہیں''۔ ''تو پھر تم کیا ہو؟'' سدھارتا جواب دیتے۔ ''میں بیدار ہوا ہوں۔'' ان کا یہ جواب ان کا لقب بن گیا۔ سنسکرت میں لفظ بُدھ کا ماخذ بیدار ہونے اور جاننے دونوں کا مفہوم پیش کرتا ہے۔ بدھا کے معنی ہیں جو بیدار ہو گیا ہو۔ جو واقف حال ہو گیا ہو۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مقدس رات کو سدھارتا اس پیڑ کے نیچے بیٹھے جو ''بو'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسے ''نخلِ دانش'' بھی کہتے ہیں۔ اس مقدس رات کے گزر جانے کے بعد بدھا اس بو کے نیچے سات دن اور سات راتوں تک حیات کے قانون اول کے بارے میں غور و فکر کرتے رہے۔ وہ قانون اول یا مبادی اولیٰ تھا۔ خیر سے خیر ہی کو نکلنا چاہیے اور شر سے شر کو۔ ۴۷۷ ق م میں بدھا کا ۸۰ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ان کے واعظ اور اقوال کے تین مجموعے مرتب کیے گئے۔ جنہیں ''تری پٹکی'' کہا جاتا ہے۔ ''تری پٹکی'' کے معنی ہیں ''دانش کی تین ٹوکریاں''۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم درہ خیبر کے راستے ہندوستان میں آیا اور راجہ پورس (ایک قبیلہ پروس کا سردار) سے نبرد آزما ہوا۔ اس ہولناک جنگ میں مقدونیہ کی افواج کو سب سے پہلی مرتبہ ہاتھیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن انہوں نے پورس اور اس کے ہاتھیوں کو شکست فاش دی۔ سکندر اعظم کی فوجوں نے آبی کشتیاں اور بحری جہاز تیار کیے اور

دریائے سندھ کے دہانے تک سفر کرنے کے بعد کوئی ۳۲۵ ق م میں کے لگ بھگ ساحل بلوچستان کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہوئے یہ لوگ واپس چلے گئے۔ اس مرحلے پر چندر گپت موریہ تاریخی افق پر نمودار ہوا۔ اس نے مگدھ کی تسخیر کے بعد ہندوستان کے شمال میں ایک بہت بڑی سلطنت قائم کر دی۔ اس کا پوتا اشوک اعظم ۲۷۴ ق م میں شہنشاہ بن کر اس سلطنت کا فرمانروا بنا۔ بُدھ مت سے بے حد عقیدت کی وجہ سے اشوک اعظم نے لاتعداد تبلیغی وفود غیر ممالک میں روانہ کیے۔ اشوک کی فرمانروائی میں سلطنت موریہ اپنے بامِ عروج پر جا پہنچی۔ اس کی سلطنت میں دکن کا بھی بیشتر علاقہ شامل تھا۔ ۲۳۲ ق م میں اشوک کا انتقال ہوا۔ تو سلطنت موریہ کا زوال شروع ہوا اور ۱۸۵ ق م تک موریہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

وسطی ایشیاء کے قبائل ساکس میتھیوں نے اس پر حملہ کیا پھر ''کشن'' خاندان کے لوگوں نے ان پر حملہ کر کے انہیں مغلوب کر لیا۔

لگ بھگ چودہ سو سال تک یہاں سیاسی استحکام کا فقدان رہا۔ کشن خاندان نے شمالی ہندوستان پر اپنا تصرف جما لیا۔ کنشک (۱۲۰ تا ۱۶۲ عیسوی) کی فرمانروائی میں ایک بہت بڑی سرحدی ریاست قائم کی گئی۔ کنشک کی رحلت کے بعد کشن سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ جنوب میں تامل علاقے میں پانڈے چولا اور پلاوا کی سلطنتیں اہمیت کی حامل تھیں۔ شمال میں سیاسی تفرقہ بازی اور عدم اتحاد نے چوتھی صدی عیسوی میں گپتا سلطنت کی (۳۲۰ء) تاسیس کی صورت پیدا کر دی۔ گپتا دور کی سب سے زیادہ دلکش اور مرصع تصویر ایک چینی سیاح اور عالم فاہیان کی نوک قلم کا کرشمہ ہے۔ گپتا دور سنسکرت کا جو برہمنوں کی مقدس و متبرک زبان ہے ''دور زریں'' تھا کالیداس (شکنتلا کا مصنف) سنسکرت کا مستند عالم اور استاد اسی دور کا گوہر نایاب تھا۔ ہندوؤں کی قدیم قانونی کتاب ''منوشاستر'' اسی دور میں دوبارہ مرتب کی گئی۔ کوئی صدی بعد گپتا سلطنت میں انحطاط پیدا ہونا شروع ہوا۔ ۴۵۵ء میں وسطی ایشیا کی بادیہ نورد اقوام سفید ہنون نے سلطنت گپتا

پر پے در پے حملے کرنے شروع کر دیئے اور بالآخر گپتا افواج کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ پنجاب کو تاخت و تاراج کر دیا گیا اور ٹیکسلا کی عظیم درسگاہ مسمار ہو گئی۔ اس جنگ و جدال کے بعد انجام کار ہنوں ہی کو شکست ہوئی۔

۶۰۶ء میں ایک حکمران ہرش نامی شمالی ریاست کے تاج و تخت کا مالک بن گیا۔ اس کے دور حکومت میں تقریباً ۴۱ سال۔ استحکام سلطنت اور امن و خوشحالی کا دور دورہ رہا۔ ۶۴۷ء میں اس کی وفات کے بعد اس کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ بعد ازاں کوئی پانچ سو سال تک ادھر ادھر چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوتی رہیں اور نابود ہوتی رہیں اور افراتفری کا دور دورہ رہا۔ ۷۵۹ء سے ۱۰۰۰ء کے درمیان راجپوتوں نے عملی طور پر آریاؤں کی قدیم سلطنتوں کو یکے بعد دیگرے فتح کر لیا اور قنوج، دہلی اور اجمیر میں اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ راجپوتوں نے بدھ مت کے پیروؤں کو اپنا سخت ترین دشمن قرار دے کر ان سے خوب جدال و قتال کیا اور ان کی سلطنتوں کو تہ و بالا کر کے انہیں بھی تقریباً نیست و نابود کر ڈالا۔

مغربی ساحل سے ہٹ کر مسلمان تجار اور ملاحوں نے ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی بود و باش اختیار کر رکھی تھی۔ حتیٰ کہ شمال میں بھی بالخصوص کشمیر میں اسلام بہت پہلے داخل ہوا۔ ایک شخص مسمی محمد الفی سے جو عربی النسل تھا۔ حجاج ناخوش ہو گیا چنانچہ اس نے محمد بن قاسم کے حملے سے قبل ہی داہر کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ بلوچستان اور مکران اسلامی پرچم تلے آ ہی چکے تھے۔ قیاس غالب ہے کہ مسلمانوں کی سلطنت کے قیام سے پہلے بنگال اور بندرگاہ چٹاگانگ بھی مسلمانوں کے تجارتی اور دینی تبلیغی مراکز بن چکے تھے۔

ہندوستانی ساحل کے خلاف مسلمان عربوں کا وہ پہلا مسلح تصادم جو تاریخ کے صفحات پر رقم کیا گیا ہے ۶۳۶ء میں وقوع پذیر ہوا جبکہ بحرین اور عمان کے عامل نے بمبئی کے قریب تھانہ کے مقام پر ایک مسلح فوج کو مہم سر کرنے کے لیے روانہ کیا۔ مہماتی

افواج بروچ اور دیبل پر بھی روانہ کی گئی تھیں مگر خلیفہ دوئم حضرت عمر فاروقؓ نے مزید بحری مہمات کو روک دیا۔ ہندوستان میں پہلی بار مسلم فتوحات کا آغاز ۷۱۲ء میں یا اس کے لگ بھگ ہوا۔ اموی دور حکومت میں سندھ کے حکمرانوں کے پاس مقامی بحری قزاقوں کی مسلم جہازوں پر لوٹ مار کے خلاف احتجاج روانہ کیا گیا یہ معاملات اس وقت مرکز توجہ بنے جب قزاقوں نے ٹھٹھہ کے مقام پر ان تحائف کو لوٹ لیا جو سیلون کے حکمرانوں نے عراق کے عامل کی خدمت میں روانہ کیے تھے۔ مجرموں کے خلاف کارروائی کے سلسلہ میں سندھ کے حکمران کی ناکامی یا عدمِ استطاعت نے ایک مسلح تصادم کے لیے راہ ہموار کر دی۔ محمد بن قاسم نے جو ایک تیرہ سالہ نوجوان لڑکا تھا اور جسے یہ مہم سپرد کی گئی تھی۔ کمال ہوشیاری اور مستعدی سے اس کو سر کیا اور سندھ کی تسخیر میں پوری طرح کامیاب ہوا۔ اس علاقے میں مسلم حکومت کے قیام نے اسلامی تاریخ اور برصغیر کی تاریخ میں ایک نہایت اہم باب کھول دیا۔

۹۹۹ء اور ۱۰۲۵ء کے درمیانی عرصے میں سبکتگین کے بیٹے سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان کے علاقے پر کوئی سترہ (۱۷) مرتبہ حملے کیے۔ اپنے ایک حملے میں اس نے سومنات کے اس مندر پر قبضہ جما لیا جو شیو سے منسوب تھا۔

۱۱۹۱ء میں محمد غوری نے راجپوتوں کے سردار پرتھوی راج کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اس کا ایک سپہ سالار قطب الدین ایبک بنارس جا پہنچا۔ فاتحین بہار کو روندتے ہوئے بنگال میں جا گھسے اور اسے بھی اپنے زیر نگیں کر لیا۔ محمد غوری پر کامیاب قاتلانہ حملہ کے بعد ''سلاطین دہلی'' کے نام سے بادشاہوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ حملوں کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ التمش کے دور حکومت میں جو شاہان غلامان میں سب سے نمایاں اور ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ (''شاہان غلامان'' کا لقب من گھڑت ہے) چنگیز خان کے منگول جتھے ہندوستان کی جانب بڑھے لیکن وہ دریائے سندھ سے آگے نہیں آئے۔ مشہور شاعر حضرت امیر خسروؒ ان منگول حملہ آوروں کے بارے میں تحریر

فرماتے ہیں کہ ''ان کی آنکھیں اس قدر چھوٹی اور چبھنے والی تھیں کہ وہ ایک پیتل کے برتن پر پڑ جائیں تو اس میں بھی سوراخ کر دیں ان کی رنگت سے کہیں زیادہ وحشت ناک اور ہیبت ناک ان کی بو تھی۔'' چودھویں صدی کے اختتام سے کچھ پہلے تیمور لنگ (جسے انگریزی ادب میں Tamerlane کہا جاتا ہے) دہلی پر نازل ہوا۔ چودھویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک سلطنت دہلی شمال کی جانب سے منگولوں اور راجپوتانہ اور مالوہ کی کچھاروں سے ہندوؤں کے حملوں کا نخچیر بنی رہی۔ ۱۳۱۰ء کے لگ بھگ سلطان علاؤ الدین کی افواج کا ایک سپہ سالار ملک کافور جنوبی ہند میں داخل ہوا اور پیش قدمی کرتا ہوا تامل مملکتوں میں جا پہنچا۔

آریاؤں کی آمد

آریاؤں کے برصغیر میں داخل ہونے سے پہلے پاک وہند میں مختلف قبائل بستے تھے۔ ان قبیلوں میں دو (۲) گروہ اہم تھے۔ ایک وہ جو انتہائی مہذب تھا اور دراوڑ کہلاتا تھا، دوسرا جو غیر مہذب تھا، کول کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ سب لوگ چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں منقسم تھے۔ ان میں مرکزیت کا شعور بہت کم تھا۔ قبیلے کا لیڈر ہی ان کا حکمران ہوتا اور وہ اسی کی اطاعت کرتے تھے۔ ہر قبیلہ خود مختار تھا اور وہ ایک دوسرے سے لڑتے بھی رہتے تھے۔

آریاؤں کے بارے میں ابھی تک وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں سے آئے، کب آئے، کس طرح آئے اور کیوں آئے۔ ان کے بارے میں جو کچھ بھی علم ہوسکا ہے وہ رگ وید اور دیگر مذہبی کتب نے فراہم کیا ہے۔ ہندی کتابوں کو جب دیکھا جاتا ہے تو آریاؤں کی آمد کے بارے میں ان سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ البتہ موجودہ دور کے ہندو مؤرخین نے یہ ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کی ہے کہ آریاؤں کا وطن ہندوستان ہی تھا۔ ابناش چندر بوس جو اس نظریے کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اُن کے قول کے مطابق آریاؤں کا اصلی وطن یہی علاقہ یعنی سپتا سندھو ہی تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ پنجاب باقی ہندوستان سے الگ تھلگ خطہ تھا اور دونوں کے درمیان میں ایک سمندر حائل تھا جو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ خشک ہوگیا۔ اس کے بعد آریا لوگ پنجاب سے نکل کر اِردگرد میں پھیل گئے۔

دوسرا اہم مؤرخ بال گنگا دھر تلک ہے۔ سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ وہ سنسکرت کا عالم بھی تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ آریا ہوت سے پہلے شمالی منطقہ میں رہائش پذیر تھے۔ اس نے یہ نظریہ پارسیوں کی کتابوں اور رگ وید سے اَخذ کیا ہے۔

تیسرا نظریہ پروفیسر میکڈونلڈ کا ہے۔انہوں نے آریاؤں کا اصلی وطن جنوب مشرقی ایشیاء بتایا ہے۔مختلف نظریوں اور تاریخوں کا مطالعہ کرنے کے بعد پروفیسر میکڈونلڈ نے یہ نتیجہ اَخذ کیا ہے کہ یہ لوگ جرمنی، ہنگری اور آسٹریا کے علاوہ اور کسی ملک کے رہنے والے نہیں تھے۔ان ملکوں سے یہ لوگ وسط ایشیاء میں پہنچے اور پھر وہاں سے ایران اِور پاک و ہند میں بکھر گئے۔

چوتھا نظریہ کہ آریاؤں کا اصلی وطن ہی وسط ایشیاء تھا، عام نظریہ ہے۔وہ لوگ صدیوں سے یہاں رہ رہے تھے اور یہ ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔وہ امن کی زندگی گزار رہے تھے۔ایک وقت ایسا آیا کہ انہیں اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑا۔وجوہات کیا تھیں؟ ان میں بھی اختلاف ہے۔بہرحال بعض کا خیال ہے کہ جغرافیائی حالات ان کے موافق نہیں رہے تھے اور یہ خیال سب سے زیادہ قابلِ قبول ہے۔

آریا پنجاب میں

انہیں آریاؤں میں سے کچھ لوگوں نے برصغیر پاک و ہند کا رخ کیا۔افغانستان سے ہوتے ہوئے گومل اور قرم کے درّوں سے وہ پنجاب میں آئے۔وہ ایک حملہ آور ہی کی حثیت سے یہاں نہیں آئے تھے بلکہ مستقل سکونت کے لئے یہاں پہنچے تھے۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے ہمراہ اپنے بیوی بچوں کو بھی لے کر آئے تھے۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لوگ دو راستوں سے یعنی شمال مغرب اور کشمیر سے پنجاب میں داخل ہوئے تھے۔شروع شروع میں انہوں نے یہاں کے لوگوں سے بہت خونریز جنگیں لڑیں، جو جنگیں صدیوں تک جاری رہیں۔آخرکار یہ لوگ مقامی آبادی پر غالب آ گئے۔

پنجاب میں ان لوگوں کی رہائش انتہائی سادگی پر مبنی تھی۔وہ فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے، چونکہ یہ لوگ ایک مرکز کی بجائے مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے، اس لئے ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔رگ وید میں ان کے رہنے سہنے کے طریقوں پر خاصی بحث ملتی ہے۔

یہ لوگ کتنی دیر تک پنجاب میں رہے، اس بات کا فیصلہ نہیں کیا جا سکا، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ وہ یہاں صدیوں تک پڑے رہے اور تہذیب وتمدن، فارغ البالی اور خوشحالی کا دور دورہ دیکھتے رہے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد شاید پھر وہی وقت آ گیا جس نے انہیں اپنا آبائی وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ اسی وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ برصغیر پاک و ہند کے دوسرے حصوں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

اس کی ایک اور بھی وجہ تھی۔ جب وہ پنجاب میں اپنے وطن کی نسبت زیادہ فارغ البال اور خوشحال ہو گئے تو ان کے دل میں اور آگے بڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ دوسری وجہ آبادی کے بڑھ جانے کی ہو سکتی ہے جس کیلئے ضروری تھا کہ وہ نئی جگہوں کی تلاش میں نکل پڑیں۔ اب ان کا پہلا قدم گنگا اور جمنا کے میدانوں کی طرف اٹھا۔ اس کے کافی دیر بعد جنوب مشرقی بنگال اور بہار بھی ان کے تسلط میں آ گئے۔ بنگال اور بہار پر قبضے کے بہت عرصہ بعد انہوں نے دکن کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں شامل کر لیا۔

آریائی تہذیب

آریا لوگ جسمانی لحاظ سے بہت مضبوط، کڑیل، خوبصورت اور دراز قد تھے۔ وہ جو زبان بولتے تھے وہ یورپ کی دیگر زبانوں، یونانی اور اطالوی سے کچھ کچھ ملتی جلتی تھی۔ ابتدا میں جب وہ پنجاب میں داخل ہوئے تو وہ چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک قبیلہ بہت سے کنبوں پر مشتمل ہوتا۔ باپ کو کنبے کا سردار مانا جاتا تھا اور اس کے بعد ماں کا مقام ہوتا۔ ہر کنبہ ایک آزاد اور مُطلق العنان زندگی گزارتا تھا۔ بہت سے کنبے ایک جگہ اگر جمع ہو جاتے تو پھر ایک گاؤں آباد ہو جاتا۔ آریا لوگ شہری زندگی سے واقف تھے۔ ہر قبیلے کا ایک موروثی راجا، سردار یا آقا ہوتا تھا۔ انتظامی اور دفاعی کاموں کا وہ سربراہ ہوتا۔ مختلف کنبوں کے سرداروں کو ملا کر ایک مجلسِ مشاورت تشکیل دی جاتی جو اس کا ہاتھ بٹاتی، غلامی کا رواج عام تھا۔ ہر قبیلہ سینکڑوں غلام قید رکھتا۔

یہ لوگ زراعت سے خاصے واقف تھے۔ انہوں نے گلہ بانی کو زراعت پر ترجیح

دی۔ گائے، بھینس، بکری اور اس طرح کے پالتو جانوروں کو وہ اپنا سب سے قیمتی اور اہم سرمایہ تصور کرتے تھے۔ گائے کو پہلا درجہ حاصل تھا لیکن وہ گائے کا گوشت کھانا جائز سمجھتے تھے۔ گائے کے بعد گھوڑے کا درجہ تھا کیونکہ یہ سرداروں اور راجاؤں کی رتھیں کھینچنے کے کام آتا تھا۔

ویدک اَدب سے پتا چلتا ہے کہ آریا لوگ اُون اور کھال کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ سوتی کپڑے سے وہ واقف نہیں تھے۔ شکار عام کھیلتے تھے۔ تفریح کے سلسلے میں رتھوں کی دَوڑ سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ جوا کھیلنا بھی ان کی عادت میں شامل تھا۔

مذہب کے بارے میں اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ وہ سورج، آگ، آسمان اور دیگر مناظر فطرت کی پرستش کرتے تھے۔ خداؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہ قربانی دیتے۔ مذہبی فلسفے کے بارے میں بھی رگ وید کے دسویں باب میں سے ہمیں انسانی اور آفاقی رموز پر غور وفکر کرنے کا سراغ ملتا ہے۔

رگ ویدک تہذیب اور تمدّن

رگ وید کو دنیا کی قدیم ترین کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب اصل میں بھجنوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ایک ہزار سترہ (۱۰۱۷) بھجن ہیں اور اسکے کل دس حصے ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں یہ متفقہ رائے ہے کہ اس کے مصنفوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہے۔ نہ صرف تعداد زیادہ ہے بلکہ مختلف زمانوں میں اس پر اضافے ہوتے رہے ہیں۔ اس بات کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کے بھجنوں میں ادبی اور لسانی لحاظ سے خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ رگ وید کے لکھنے والوں میں بعض شاعروں کا نام بھی برسبیلِ تذکرہ آتا ہے۔ بہت سے بھجن دیوتاؤں کی شان میں انہیں خوش کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں اور ان بھجنوں میں جو کسی بھی دیوتا سے متعلق نہیں ہیں اس دَور کی اقتصادی اور معاشرتی زندگی کے بارے میں اشارے ملتے ہیں۔ انہی میں قبائلی جنگیں اور روزمرّہ زندگی کے خاکے بھی

موجود ہیں۔ البتہ رگ وید بھی اس بارے میں خاموش ہے کہ آریاؤں نے اپنے اصلی وطن سے پنجاب یا برصغیر ہندو پاک کی طرف کب اور کس وقت ہجرت کی۔ اس کے بہت سے بھجن اس وقت لکھے گئے جبکہ آریا لوگ افغانستان اور گنگا جمنا کے میدانوں تک کے درمیانی علاقوں میں امن وسکون کی زندگی گزار رہے تھے۔ دریائے سوات، دریائے گومل اور دریائے کابل کے بارے میں اکثر مقامات پر ذکر آتا ہے۔ ان دریاؤں کے علاوہ سندھ اور باقی پانچوں معاون دریاؤں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان کے ساتھ ہی دو اور دریا بھی ملتے ہیں جن کے نام سرسوتی اور درسداوتی لکھے ہیں۔ ان دریاؤں کے بارے میں رگ وید میں تفریحی گیت موجود ہیں۔ سرسوتی کا متعدد بار اور گنگا اور جمنا کا صرف ایک بار تذکرہ آیا ہے۔ اس سے بھی یہ پتا چلتا ہے کہ آریا ابھی ان دریاؤں کی طرف جا ہی رہے تھے مگر ابھی انہیں پار نہیں کر پائے تھے۔ رگ وید میں ہمالیہ کے پہاڑوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے مگر بندھیا چل اور دریائے نربدا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

رگ وید کے زمانے میں آریا لوگ منتشر زندگی گزارتے تھے۔ متحد ہونے کی بجائے چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور اکثر ایک دوسرے سے لڑائی میں مصروف رہتے تھے۔ کبھی کبھی ان میں صُلح بھی ہو جاتی اور پھر یہ متحد ہو کر اکثر پرانے باشندوں کی آبادیوں پر حملہ کر دیتے تھے۔ آریائی اور غیر آریائی کا مسئلہ بھی اس وقت بڑا اہم تھا۔ آریا خوبصورت، صحت مند، دراز قد اور جوان ہمت تھے اور ان کے مقابلے میں مقامی لوگ سیاہ فام اور پست قد تھے۔ اس لئے بھی یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی تھی۔ مقامی لوگ آریائی لوگوں کے عقائد سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تفریق کئی سو سال تک قائم رہی۔

سیاسی زندگی

پنجاب میں آریاؤں کی آمد کے بعد صدیوں تک ان میں متحد زندگی کے آثار نہیں ملتے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، وہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر

قبیلہ اس ریاست کا سردار ہوتا جسے وہ راجن کہتے تھے۔ طرزِ حکومت ایک شخصی حکومت___(Monorchy) رائج تھا۔ یہ راجن خاندانی ہوتا تھا مگر بعض قبیلے اپنے راجن کا انتخاب بھی کرتے تھے۔ تخت نشینی کے وقت ہر راجا ایک حلف نامہ پُر کرتا، جس میں اُسے عہد کرنا ہوتا کہ وہ رعایا کی خدمت میں لگا رہے گا۔ آریاؤں میں راجن کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ وہ صرف حکمران ہی نہیں تھا بلکہ لوگ اُسے عقیدت کی نظروں سے بھی دیکھتے تھے۔ اس کا لباس شاہانہ اور زرق برق ہوتا تھا۔ ہڑپا میں جو بڑی بڑی عمارتوں کے کھنڈر ملے ہیں، غالباً وہ راجاؤں کے محلات ہی تھے، جو کہ بہت کشادہ اور وسیع ہوتے تھے۔ بہت سے خدمتگار اس کی خدمت پر مامور ہوتے اور قبیلے کے لوگ اس کی ہر طرح سے خدمت بجا لاتے۔ اسی طرح وہ راجا سے یہ توقع کرتے تھے کہ راجا ان کے جان و مال کی حفاظت کرے اور ساتھ ہی مذہبی لحاظ سے وہ خود یا اپنے نامزد پنڈتوں کا بندوبست بھی کرے۔

راجا کو کسی قسم کا ٹیکس لگانے کا حق حاصل نہیں تھا۔ اس کی آمدنی صرف مفتوحہ علاقوں کے قبیلوں سے خراج اور رعایا سے نذرانے وصول کرنے تک محدود تھی۔ کبھی کبھی مالِ غنیمت سے اس میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ جنگ کے علاوہ زمانۂ امن میں راجا رعایا کی فارغ البالی اور امن و انصاف کے تقاضے پورے کرنے میں مصروف رہتا۔ نہایت ہی معمولی سی خطا کی سزا انتہائی سنگین ہوتی تھی۔ جاسوسی کا عام رواج تھا۔ برہمن کے تقدس کا خیال رکھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ برہمن کو اذیت دینے والے کے جرم کو معاف کر دینا راجا کے بس کی بات نہیں تھی۔ دھوکا دینے والے کے لئے سزائے موت مقرر تھی۔

ریاستیں اگرچہ چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں اور حکومت کے کاروبار میں اتنی پیچیدگی بھی نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی راجا تمام انتظام تن تنہا نہیں سنبھال سکتا تھا۔ اُسے مختلف کاموں کے لئے مختلف لوگوں کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس لئے وہ کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیتا۔ ایسے افراد کو حسبِ ذیل ناموں سے یاد کیا جاتا ہے:

۱۔ سینانی (Senani)، جو فوجوں کا سپہ سالار ہوتا تھا۔

۲۔ گرامانی (Gramani)، جو دیہات سدھار کا انچارج ہوتا تھا۔

۳۔ پروہت (Purohit)، یہ مذہبی سلسلوں میں راجا کو مشورے دیتا تھا۔
راجا کہیں بھی اور کبھی بھی آمر نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ مشاورتی مجلس کے صلاح مشورے سے حکومت کا کاروبار چلاتا تھا۔

معاشرتی زندگی

رگ وید میں اس دور کے آریاؤں کی معاشرتی زندگی کا عکس بھی ملتا ہے۔ لڑائیوں سے تنگ آ کر جب بہت سے قبیلے ایک جگہ مل بیٹھتے تو پھر ایک گاؤں معرضِ وجود میں آ جاتا۔ پھر کچھ گاؤں اکٹھے کر کے ایک ضلع کی تشکیل ہو جاتی۔ پھر بہت سے ضلعوں کو ملا کر ایک جانا ___Jana___ بن جاتا جسے قبیلے کا نام دیا جاتا۔ خاندانی جھگڑوں میں کنبے کا سردار ہی فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ مختلف کنبوں کے جھگڑے ان کنبوں کے سردار مل کر طے کر لیتے تھے، جس سے ان کی اُمن پسندی کا علم بھی ہوتا تھا۔

دوسری پرانی اقوام کی طرح اس زمانہ کے ہندو بھی لڑکی کی پیدائش اور پرورش کو منحوس خیال کرتے تھے۔ مگر کبھی کبھی وہ لڑکیوں کی پروش کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رگ وید میں اس دَور کی کچھ شاعرہ عورتوں کے نام بڑی عزت سے لئے گئے ملتے ہیں۔ جس میں وساوارا (Visarara) اور گھوشالا (Ghoshala) کے نام خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔

لڑکیوں کی شادی ان کی جوانی مین کی جاتی تھی، اور اس بندھن کو ایک مقدس بندھن خیال کیا جاتا تھا۔ اس کا ختم کرنا گناہِ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ طلاق کا تصوّر قطعاً نہیں تھا۔ ایک آدمی ایک وقت میں ایک ہی شادی کر سکتا تھا۔ البتہ امراء طبقے میں یہ رعائیت موجود تھی کہ وہ کئی بیویاں ایک وقت میں رکھ لیں۔ رگ وید کا مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس وقت کی ہندو عورت کا مقام آجکل کی عورت کے مقابلے میں بہت بلند تھا۔ اور یہ کہ عورتیں اپنے خاوندوں کا انتخاب خود کرتی تھیں۔ رسموں میں خاوند کے ساتھ برابر کی شریک ہوتی تھیں۔ امیر لوگ اپنی عورتوں کی تعلیم کا بندوبست خود کرتے تھے۔ سَتی کی رسم کا عِلم رگ وید

سے نہیں ہوتا۔ بیوہ عورت دوسری شادی کر سکتی تھی۔ غیر شادی شدہ لڑکیاں اپنے باپ کی جائیداد کی حقدار ہوتی تھیں۔

معاشی زندگی

دیہاتوں کی تفصیلات کے بارے میں رگ وید تقریباً خاموش ہے۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ ہر گاؤں کا ایک افسر ہوتا تھا۔ جسے وہ گرامانی کہتے تھے۔ یہ فوجداری اور دیوانی دونوں قسم کے مقدمات کے فیصلے کرنے کا مجاز تھا۔ گاؤں کی زمین مختلف کنبوں میں تقسیم ہوتی تھی۔ البتہ چراگاہیں مشترکہ طور پر استعمال ہوتی تھیں۔

زراعت لوگوں کا عام پیشہ تھا۔ آبپاشی کے نظام کو بہتر بنانے کے لئے نہروں کی کھدائی کا رواج بھی تھا، ہل چلانے کے لئے بیلوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ گندم اور جو کی کاشت عام کی جاتی تھی، کیونکہ اُن کی خوراک تقریباً یہی اجناس تھیں۔ گلہ بانی کا رواج عام تھا۔ گائے کو اس زمانے میں بھی قابلِ تعظیم تصوّر کیا جاتا تھا۔ مویشیوں کو گاؤں والے چراگاہوں میں لے جاتے۔ جانوروں کے کانوں کو چھیدنے کا بھی رواج تھا۔ پالتو جانوروں میں گھوڑا، بھیڑ، بکری اور کتا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بھیڑوں اور بکریوں کی اُون سے کپڑے بُننے کا رواج بھی تھا۔ اکثریت اگرچہ زراعت پیشہ تھی مگر وہ تجارت اور صنعت وحرفت سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے۔ تجارت ایک خاص گروہ کرتا تھا، جسے وہ پانی (Pani) کہتے تھے۔ یہ لوگ آریائی نسل سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ تجارت اشیاء کے باہمی تبادلے کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ تجارت کے سامان میں کھالوں اور کپڑے کو خاص مقام حاصل تھا۔ اس دور میں اگرچہ سونے اور چاندی کے سِکوں کا رواج تو نہیں تھا، لیکن ایک دھات کا سِکّہ نما ٹکڑا دستیاب ہوا ہے، جسے وہ نشکا (Nishka) کہتے تھے۔

آریاؤں کی زندگی بہت سادہ تھی۔ ہر آدمی اپنی ضروریات خود ہی پوری کر سکتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ لوگ پیشہ وری کی طرف مائل ہوئے۔ کچھ لوگ مختلف صنعتیں اختیار

کرنے لگے، جیسے کپڑا بننا، چمڑے کا کام، مٹی کے برتن اور رتھیں وغیرہ بنانا۔ ترکھان کا درجہ کاریگروں میں خاصا بلند تھا۔ کیونکہ اس کی صنعت میں رتھ بنانا بھی شامل ہوتا تھا۔ مختلف دھاتوں سے مختلف اوزار بنائے جاتے تھے۔ جو کہ جنگوں میں کام آتے تھے۔ سُنار بھی اس معاشرے کا اہم رُکن تھا، کیونکہ وہ امراء کے لئے زیورات بناتا تھا۔ یہ لوگ رسل ورسائل اور باربرداری کے کاموں سے خوب واقفیت رکھتے تھے۔ اشیاء کی نقل وحرکت کے لئے رتھیں اور بیل گاڑیاں استعمال کی جاتی تھیں۔

رگ وید کے دور ہی میں فنِ شاعری کو بھی عروج حاصل ہوا اور اس کا بہترین ثبوت وہ بھجن ہیں جو رگ وید میں درج ہیں۔ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ آریائی لوگ کچھ لکھ نہیں سکتے تھے، اور ان کے کارنامے ہم تک روایت کے ذریعے سے پہنچے ہیں۔ البتہ پنجاب اور سندھ کی قدیم تہذیب کے لوگ اس فن سے واقف تھے اگرچہ طرزِ تحریر سامی النسل تھا۔ فنِ تعمیر سے بھی یہ لوگ آشنا تھے۔ علمِ طب بھی جانتے تھے مگر ساتھ ہی جادوٹونے سے بھی بیماریاں دُور کرنے کا رواج تھا۔ اس کے علاوہ علم نجوم سے بھی یہ لوگ واقفیت رکھتے تھے۔

پوشاک وخوراک

آریا لوگ جسمانی آرائش کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہ تین قسم کا لباس پہنتے تھے۔ ایک نوی (Nivi) دوسرا واسا (Vasa) اور تیسرے کو ادھی واسا (Adhivasa) کہتے تھے۔ کپڑوں کے رنگ مختلف ہوتے تھے۔ یہ کپڑے سُوت، اُون، اور ہرنوں کی کھالوں سے بنائے جاتے تھے۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی پگڑیاں باندھتی تھیں۔ دونوں کے سروں کے بال لمبے لمبے ہوتے تھے۔ سر منڈوانے اور داڑھی صاف کروانے کی رسم بھی تھی مگر عام لوگ داڑھی رکھتے تھے۔ رگ وید ہمیں اس بات کا پتا بھی دیتا ہے کہ اس وقت کے لوگ ذات پات کے تصوّر سے بالا تھے۔ اگرچہ ۱۰۱۷ بھجنوں میں سے ایک بھجن ایسا بھی مل جاتا ہے جس میں چار بڑی ذاتوں کا ذکر ملتا ہے، یعنی برہمن،

کھشتری، ویش اور شودر، لیکن یہ بات مورخین میں ابھی تک وجہ اختلاف ہے۔

آریاؤں کی خوراک بالکل سادہ ہوتی تھی۔ دہی، دودھ اور مکھن عام استعمال کرتے تھے پھل اور سبزیاں روزانہ خوراک کے اہم اجزاء تھے۔ شراب نوشی معاشرتی اور اخلاقی جرم تھا۔ بیل کی قربانی دی جاتی تھی، چونکہ گائے کو قابلِ عزت تصور کیا جاتا تھا۔ اس لئے اس کی قربانی نہیں دی جاتی تھی۔

مذہب

آریاؤں کا مذہب آج کے ہندو مذہب کی پیچیدگیوں سے بالکل پاک اور صاف تھا۔ وہ کئی ایک دیویوں اور دیوتاؤں کو پوجا کرتے تھے۔ یہ سب دیوتا برصغیر کی پیداوار نہیں تھے بلکہ ان میں سے کچھ وہ اپنے ساتھ اپنے آبائی وطن سے لائے تھے اور کچھ پاک و ہند میں قدیم باشندوں کے دیوتا ہی تھے جنہیں وہ بھی پوجنے لگے۔ جیسے سرسوتی دیوی، یہ اس وقت کے تصور کی پیداوار ہے جبکہ وہ گنگا اور جمنا کے میدانوں میں مستقل رہائش اختیار کر چکے تھے۔

آریا لوگ مناظرِ قدرت کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے بڑے دیوتا تیں سے چالیس تک تھے، جن میں سے مشہور وردنا (آسمان)، سادیلا (سُورج)، اگنی (آگ) وغیرہ تھے۔ ان میں دیوی صرف ایک ہی تھی جس کا نام اوشا تھا۔ ان کے علاوہ بھی وہ بیشمار دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ ہر قبیلے کا ایک ایک اپنا دیوتا بھی تھا۔ ان سب میں وردنا کا درجہ بہت بلند تھا۔ اس کے بعد اندارا جا کا مرتبہ تھا جس کی تعریف میں متعدد بھجن موجود ہیں۔ یہ بارش کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ ویدک دور میں پوجا کے انداز بھی موجودہ ہندوؤں کے طور طریقوں سے مختلف تھے۔ وہ لوگ بُت پرست نہیں تھے اور نہ ہی کسی قسم کا بُت تراشتے تھے۔ قربانی کے وقت گھی، دودھ، گوشت، اناج اور سوم رس دیوتاؤں کی نذر کر دیتے تھے اور یہ فرض صرف برہمن ہی ادا کرتا تھا کیونکہ وہ انسان اور دیوتا کے درمیان ثالث کی حیثیت رکھتا تھا۔

خداؤں کے بارے میں رگ ویدک آریوں کا خیال تھا کہ وہ انسانی شکل میں رتھوں پر بیٹھ کر جاہ وجلال کی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنے خداؤں کو سخی، ہوشیار، عقلمند اور وسیع النظر مانتے تھے۔

بُدھ مت

حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً چھ سو سال پیشتر بنارس سے ایک سو میل کے فاصلے پر کپل وستو کے مقام پر ساکھیہ قبیلہ آباد تھا۔ یہ لوگ بھی آریا ہی تھے۔ اس قبیلے کے راجا شدودھن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام گوتم تھا، یہی بدھ مذہب ٥ بانی ہوا۔ وہ بچپن ہی سے دنیاداری سے متنفر تھا۔ شادی ہو جانے کے بعد اس کا دل اور بھی اکتاہٹ محسوس کرنے لگا۔ اُس کے ہاں ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔ مگر اس کا دل اہل وعیال میں کب لگتا تھا۔ چنانچہ ایک رات اس نے اپنے نوزائیدہ بچے اور بیوی پر آخری نظر ڈالی اور تاج وتخت، جاہ وحشمت، حکومت وثروت کو ٹھکرا کر اپنے ایک وفادار دوست کے ساتھ جنگلوں میں نکل گیا۔ وہاں چند چیلوں کے ساتھ نفس کشی شروع کی جس کی بدولت نوبت یہاں تک پہنچی کہ جسم سوکھ کر کانٹے کی طرح ہو گیا مگر اس عبادت نے ذہنی اور روحانی سکون نہ بخشا۔ اس سے گوتم کو علم ہوا کہ جسمانی آزار اور محض ریاضت انسان کی روح کو راحت نہیں دے سکتی۔ اس طرح اس کے دل ودماغ میں ایک کشمکش شروع ہو گئی۔

آخر کار ایک رات کو اس نے اپنے دل میں نور کی ایک کرن محسوس کی۔ اس وقت گوتم اس نتیجے پر پہنچا کہ رُوح کی ابدی نجات کا راز باطن کی صفائی اور خلقِ خدا سے محبت میں پوشیدہ ہے نہ کہ جنگل جنگل پھرنے اور جسمانی تکالیف برداشت کرنے میں۔ اس واقعہ کے بعد وہ ''بدھ'' کے نام سے مشہور ہونے لگا اور وہ درخت جس کے نیچے اسے نور کی کرن دکھائی دی تھی۔ بودھی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اَب اس نے انسانی محبت کا پرچار شروع کیا۔ بنارس کے قریب سارناتھ کے مقام پر اس نے پہلا لیکچر دیا۔ گوتم کی سادگی اور اس کے اصولوں کا تقدس دیکھ کر اس کے حلقہ اثر میں داخل ہونے والوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔ اس نے ان میں سے کچھ کو

باقاعدہ تعلیم دی اور تبلیغ کے لئے انہیں ملک کے مختلف حصوں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ اس کے منشور میں انسانیت کو بے چارگی اور بیکسی سے نجات دلانا تھا۔ چونکہ اس کی شہرت اس کے آبائی شہر تک بھی پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ سات سال باہر رہنے کے بعد جب گوتم دوبارہ کپل وستو آیا تو شہر میں داخل ہوتے ہی اس کے والد، والدہ، بیوی اور بیٹے نے اس کا مذہب اختیار کرلیا۔ شروع شروع میں گوتم نے کوشالا ماگدھ اور نگ تک اپنی تبلیغ کو جاری رکھا اور یہ سلسلہ کوئی ۴۵ برس تک جاری رہا۔ اس دوران میں ہزار ہا لوگوں نے اس کے مذہب کو اختیار کیا۔ پسماندہ اور برہمن کے ظلم و ستم سے تھکے ہارے لوگ بدھ عقیدے میں تیزی سے شامل ہونے لگے۔

گوتم اَسّی سال کی عمر میں ۴۸۰ ق م میں کاشی نگر ضلع گورکھپور میں فوت ہوئے۔

تبلیغ و تعلیم

بدھ کی تعلیم انتہائی سیدھی سادی تھی۔ وہ ہندو مذہب میں رائج بیشمار قسم کی قربانیوں سے سخت متنفر تھا۔ غیر ضروری اور فرسودہ قسم کی رسمیں بھی اس کے ہاں قابلِ مذمت تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود بھی کوئی نیا فلسفہ حیات نہ پیش کرسکا پھر بھی اس کی تعلیمات بہت جلد عام ہونے لگیں۔ گوتم کی تعلیمات کا لبِ لباب یہ ہے کہ انسان کو دنیا کی تکلیفوں اور برائیوں سے کس طرح نجات حاصل کرنی چاہیے اور ایک پرسکون زندگی کس طرح گزارنی چاہیے۔ اس کے لئے وہ کہتا ہے:

۱۔ یقین کامل ہونا چاہیے۔

۲۔ جھوٹ کو ترک کر دینا چاہیے اور صرف سچ کو اپنانا چاہیے۔

۳۔ کوششوں کا نیک ہونا ضروری ہے۔

۴۔ عمل صحیح اور صالح ہونے چاہئیں۔

۵۔ سوچ کا انداز مثبت اور درست ہونا چاہیے۔

۶۔ رزق حلال طریقے سے کھانا چاہیے۔

۷۔ مُنہ کو غیبت، چغلی اور دوسری برائیوں سے بچانا چاہیے۔

آواگون کے مسئلے کا وہ بھی قائل تھا۔ بدھ مت کے مطابق آنے والی زندگی پر انسان کے اعمال کا بہت اثر ہوتا ہے۔ آہنسا کا اصول بدھ مذہب کی تعلیم کا بنیادی اور سب سے اہم اُصول ہے۔ اس اصول کے تحت کسی جاندار کو مارنا گناہِ عظیم تصور کیا جاتا ہے۔ ان چیزوں کے بعد اخلاقیات کی دنیا آتی ہے۔ بُدھ نے اس پر بھی بہت زور دیا ہے اور بدھوں کو تلقین کی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں، والدین اور عمر میں بڑوں کی عزّت کریں۔ خلقِ خدا سے محبت اور مشکل کے وقت میں دوسروں کی مدد کریں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بدھ مت، ہندومت کے خلاف تبلیغ کا قائل تھا، اس لئے بُدھ نے اپنے ماننے والوں کو دو گروہوں میں بانٹا ہوا تھا۔ ایک اُپاسکا (Upasika) کہلاتے تھے۔ یہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ عام زندگی گزار سکتے تھے۔ دوسرے تارک الدُنیا تھے۔ ان میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے۔ سال میں نو مہینے یہ ملک کے دُور دراز علاقوں میں نکل جاتے اور تبلیغ کرتے۔ انہیں بھکشو کہتے تھے۔ موسمِ برسات آجاتا تو اپنی عبادت گاہوں میں بیٹھ کر مطالعہ اور ریاضت میں مشغول ہو جاتے۔ بھکشوؤں کی زندگی کچھ خاص اصولوں کے مطابق بسر ہوتی تھی۔ یہ اصول یہ قواعد ایک الگ مجلس کے ذریعے ترتیب پاتے تھے۔ مجلس کا ہر فیصلہ رائے شماری سے ہوتا تھا۔ مجرم بھکشو یا جو کسی بھی طرح دنیاداری کی طرف مائل ہوتے تھے، یہی مجلس انہیں مناسب سزا دینے کی مجاز تھی۔ اسے ''سِنگا'' کہا جاتا تھا۔ مذہبی امور کا کام سِنگا کے سُپرد تھا مگر جب بھی کوئی مشکل مسئلہ سامنے آجاتا، جو نتیجہ کے طور میں وسیع اور دیرپا اثر رکھنے والا ہوتا تھا، تو بدھ مت کے پیروکار ایک مجلس کا اہتمام کرلیتے تھے۔ تاکہ وہ مسئلہ حل کرسکیں۔ ایسی مجلسیں بدھ مت کی تاریخ کا اہم حصہ تھیں۔ پہلی مجلس کا انعقاد گوتم بدھ کی وفات کے چند ہی ہفتے بعد ہوا جس میں بدھ کے وعظوں کو ایک جگہ قلمبند کرنے کی تجویز زیرِ غور آئی۔ اس میں پانچ سو سے زیادہ بھکشوؤں نے شرکت کی۔ اس سے تقریباً سو سال بعد ویسالی (Vasali) کے مقام پر دوسری مجلس کا انعقاد ہوا۔ اور بحث کے دوران میں کچھ ایسے عقیدے بدھ مت

میں شامل کر لئے گئے جو اس کی بنیادی تعلیم کے خلاف تھے، جس کی وجہ سے بدھ مت کے پیروکار دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ تیسری مجلس اشوک کے عہد میں پاٹلی پتر کے مقام پر بلائی گئی اور چوتھی اور شاید آخری کنشک کے عہد میں کشمیر میں منعقد ہوئی۔

بُدھ مت کی ترقی کے اسباب

بُدھ مت کی ترقی کے حسبِ ذیل معروف اسباب ہیں:

۱۔ بُدھ مت کے پھیلاؤ اور وسعت کا سب سے اہم راز خود گوتم کی شخصیت میں چھپا ہوا تھا۔ جب اس نے اپنا پیغام لوگوں کو دیا تو اس سے قبل اس کی سادگی، تقدس، عمدگی، نفاست، پرہیزگاری اور پارسائی کا شہرہ دُور دُور تک پھیل چکا تھا۔ لوگوں کو پہلے ہی سے اس کی سچائی اور نیک نیتی کا علم تھا اور اب وہ انہیں اس طرف بُلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی تھی جس نے لوگوں کے دلوں کو اپنا گرویدہ کر لیا، وہ یہ کہ اس نے راجا بننے سے انکار کر دیا تھا اور تاج وتخت اور جاہ وحشمت کو ٹھکرا دیا تھا۔ پھر درویشی اختیار کی اور خدمتِ خلق کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اُسے اپنا نجات دہندہ تصوّر کرنے لگے اور بہی خواہ وغمخوار سمجھنے لگے۔ تیسری یہ کہ وہ ایک زبردست مقرر تھا۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ لوگوں کے دلوں میں اُترے بغیر نہ رہتے تھے۔

۲۔ سنسکرت ایک مشکل اور نہ سمجھ میں آنے والی زبان تھی۔ برہمن ہندومت کا پرچار سنسکرت میں کرتے تھے، جو عام لوگوں کے لئے خاصا مشکل مسئلہ تھا۔ بُدھ نے اپنے پیغام کو اس عام اور سیدھی زبان میں لوگوں تک پہنچایا، جسے وہ آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔

۳۔ سادگی کے لحاظ سے بھی بُدھ مت اپنے سے پہلے مذہبوں سے بہتر تھا۔ اس کے ہاں پیچیدہ رسُومات بالکل نہ تھیں۔ غریب لوگ جو برہمنوں کے عدم

مساوات کے سلوک سے بیزار تھے اس مذہب کی مساوات اور اشتراک کی طرف جوق در جوق بڑھنے لگے۔ شودر اور کھشتری تو خاص طور پر بدھ مت اختیار کر کے برہمن کی غلامی کا جُوا گلے سے اتار دینا چاہتے تھے۔

۴۔ سِنگا مجلس نے بھی بدھ مت کو عام کرنے اور پھیلانے میں بہت کام کیا تھا۔ گوتم کی زندگی ہی میں اس کے بھکشو اس کے پیغام کو لے کر ملک کے کونے کونے میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اور سارے ملک میں بدھ کی تعلیم عام ہونے لگی تھی۔ کچھ بھکشو ملک سے باہر بھی نکل گئے۔ ان کی سچائی، خلوص اور پرہیز گاری نے انہیں وہاں بھی کامیاب کرنے میں خاصی مدد دی۔

۵۔ بدھ مت کو صدہا سال تک حکومت کی حمائیت حاصل رہی۔ اشوک اور کنشک بھی اس مذہب کے ہی پیرکار تھے۔ انہوں نے حکومت کی مشینری کو بروئے کار لا کر اس مذہب کو خوب پھیلایا۔ اشوک نے تو اپنے مبلّغ لنکا، چین، ایران اور مصر تک بھیجے تھے اور وہاں انہوں نے بہت کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

زوال کے اسباب

۱۔ ابتداء میں بدھ مت ایک بہت ہی سادہ مذہب کی حیثیت سے اُبھرا تھا اور یہی بات اس کی ترقی میں مددگار ثابت ہوئی تھی۔ مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سادگی پیچیدگی میں بدلتی چلی گئی۔ عجیب وغریب رسمیں اس میں داخل ہو گئیں۔ غیر ضروری قسم کے مذہبی تکلفات نے لوگوں کو اس سے متنفر کرنا شروع کر دیا۔

۲۔ بدھ کے مذہب میں خدا کا تصوّر نا پید تھا۔ اس کے مقابلے میں ہندو مت میں خدا کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود تھا۔ عوام آہستہ آہستہ بدھ مت کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے۔ جب گوتم کی شخصیت ان میں سے غائب ہو گئی تو یہ شک لوگوں کی زبانوں پر آ گیا، جس کا جواب نہ کسی مبلّغ کے پاس تھا اور نہ

ہی کسی بھکشو کے پاس۔

۳۔ اسلام کے علاوہ پاک و ہند کا ہر مذہب ہندو مذہب سے متاثر ہوا ہے۔ بدھ مت نے بھی آہستہ آہستہ اس کے اثرات و عادات قبول کرنے شروع کر دیئے۔ اور آخر ایک ایسا وقت آیا کہ ہندوؤں نے گوتم بدھ کو اپنا اوتار بنا کر ہندو اور بدھ مت کا فرق مٹا کر رکھ دیا۔

۴۔ بدھ مت کے پھیلانے میں چونکہ حکومت کا ہاتھ بھی شامل رہا تھا، مگر جوں جوں بدھ حکمران طبقہ ختم ہوتا گیا اس کو زوال آتا گیا۔

۵۔ بھکشو اور سدگا جو بدھ مت کے فروغ کا سبب بنے تھے آہستہ آہستہ وہ نیکی و پرہیزگاری کو ترک کرتے گئے۔ ان میں اخلاقی بیماریاں جنم لینے لگیں۔ وہ تعیش اور دولت کے چکر میں پھنس گئے، جس کی وجہ سے ان کی عزت اور قدر عام لوگوں کی نظروں سے گرگئی۔

پنجاب اور سکندر اعظم

برِ صغیر پاک و ہند اور ایران کے تعلق صدیوں پرانے ہیں۔ قبل مسیح سے ہی تجارت کا سلسلہ دونوں ملکوں میں قائم تھا۔ مذہبی لحاظ سے بھی اوستا اور ویدوں میں اشتراک کی فضا ملتی ہے۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں دونوں ملکوں میں تجارتی تعلقات موجود تھے۔ اسی صدی ہی میں جب ماگدھی حکومت نے سارے ہندوستان کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کی کوشش کی، تو ایران نے ہندوستان پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ اس وقت کیانی حکومت ایران میں برسرِ اقتدار تھی۔ کچھ مدت تک ان کا قبضہ پنجاب کے شمال مغربی حصے تک ثابت ہوتا ہے۔ صوبہ سرحت تو کافی دیر تک ان کے قبضے میں رہا۔ کیخسرو (۵۵۸ق م ۔ ۵۳۰ق م) کیانی خاندان کا بانی تھا۔ یہ نہائیت ہی ہوشیار اور زیرک بادشاہ تھا۔ اس نے ۲۰ سال کی مدت میں بابل، لیڈیا، آشور اور میڈیا کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور مشرق میں کوہ ہندوکش تک اپنی سلطنت کو وسیع کر لیا تھا، جس میں موجودہ پاکستان کا شمال مغربی سرحدی صوبہ بھی شامل تھا۔

کیخسرو کے دَور میں ایران اور ہندوستان کے تعلقات میں وہ ہم آہنگی جنم نہ لے سکی، جو کہ دارا (۵۲۱ق م ۔ ۴۸۵ق م) کے دور میں ملتی ہے۔ دارا بھی ایک ہوشیار، بیدار مغز اور دلیر حکمران تھا۔ اس نے فتوحات کا ایک بہت بڑا پروگرام مرتب کیا، جس میں ہندوستان کی مملکت بھی شامل تھی۔ اس نے ایک ماہر تیراک اور سمندری فوج کے افسر کو سمندر کے راستے دریائے سندھ کے دہانے تک سروے کرنے کے لئے بھیجا تاکہ وہ ہندوستان کے ساحلی علاقوں سے واقفیت حاصل کر سکے۔ ازاں بعد اس نے دریائے جہلم تک یہ علاقہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ایران اس وقت ۲۷ صوبوں میں منقسم تھا، جن میں ایک صوبہ پنجاب بھی تھا۔

سکندر مقدونی کا حملہ

یہ بات واضح ہے کہ سکندر کو اتنی دُور حملہ کرنے کی ضرورت جو پیش آئی تو صرف اس لئے کہ ہندوستانی لوگ ایرانیوں کے دوش بدوش یونانیوں کے خلاف جنگوں میں حصہ لیتے تھے۔ یونانی مورخ ہیرڈوٹس اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ پنجاب کسی حد تک، ایران کا ایک صوبہ تھا۔ اس لئے اس نے ضروری سمجھا کہ ایران کی فتح کے بعد پنجاب کا رُخ کرے۔

سکندر نے جس وقت حملہ کیا اس وقت شمالی ہندوستان میں کوئی ایسی طاقت موجود نہیں تھی جو اس کے مقابلے کے لئے آتی۔ برصغیر کا شمالی حصہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور حکومتوں میں بٹا ہوا تھا۔ یہ حکومتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ ان میں کسی قسم کا اتحاد، یگانگت موجود نہ تھی۔ یہاں تک کہ جب بیرونی حملہ آور بھی آتے تو پھر بھی یہ متحد نہ ہوتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جو حملہ آور بھی آتا وہ آسانی سے علاقے پر قابض ہو جاتا۔ سکندر کے حملے کے وقت ـــــ ہندوستان کے شمالی علاقے میں مندرجہ ذیل حکومتیں قابلِ ذکر تھیں:

دریائے بیاس کے مشرقی کنارے کی ریاستوں میں ماگدھ کی ریاست سب سے طاقتور، وسیع اور مالدار تھی۔ یہاں نندا خاندان حکومت کرتا تھا۔ اس کا دارالحکومت پاٹلی پتر تھا۔ ملک کے اس حصے میں نندا حکومت کے علاوہ دو اور نامور حکومتیں بھی تھیں، جنہیں کوشل اور اونتی کہا جاتا تھا۔ اجودھیا اور اُجین ان کے مرکزی مقام تھے۔ پنجاب کا علاقہ بھی اس وقت ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ کمزور اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان ٹیکسلا کی ریاست اس وقت بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس کا دارالحکومت خود ٹیکسلا کا شہر ہی تھا۔ اس کا نام امبھی تھا۔ کشمیر اور ہزارہ کا علاقہ راجا ابی سارا کی مملکت میں تھا۔ چناب اور جہلم کے درمیانی علاقے پر راجا پورس کی حکمرانی تھی۔ اس کی ریاست میں جہلم، گجرات اور شاہ پور کے ضلعے شامل تھے۔ پورس ایک مالدار

اور طاقتور حکمران تھا۔فوجی لحاظ سے بھی یہ پنجاب کی دوسری ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور ریاست تھی۔ دریائے راوی کے مشرقی جانب قبیلہ کھتوئی کی حکومت تھی جس کا صدر مقام سگالا (ضلع گورداسپور) تھا۔اس طرح ملتان اور اس کے اردگرد میں ملوئی قبیلہ حکمران تھا۔

ایرانیوں کے یونانیوں پر مسلسل حملوں نے یونانیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی مدافعت کریں اور اس طرح ان کے جوابی حملوں کا آغاز ہوا۔مقدونیہ کے حاکم فیلقوس کا بیٹا سکندر ۳۵۶ ق م میں پیدا ہوا۔ایک حکمران کی حیثیت سے وہ بڑا اجری اور قوی جرنیل تھا۔ وہ مقدونیہ سے اُٹھا اور ایران کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔

سکندر ابھی بچہ ہی تھا کہ وہاں کے لوگ اس کی ذہانت اور اولوالعزمی سے بہت متاثر تھے۔سکندر نے بچپن ہی میں یہ ارادہ کرلیا تھا کہ وہ ایران کو اس کے سابقہ حملوں اور زیادتیوں کی سزا ضرور دے گا۔اپنی شکستوں کا انتقام لینے کے لئے اس نے بیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوتے ہی اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔۳۳۴ ق م میں اس نے ایشیائے کوچک، ایران اور افغانستان کی طرف پیش قدمی کی۔ پہلے وہ مصر کی طرف گیا۔مصر اس وقت ایرانی حکومت کے ماتحت تھا۔مصر کو اس نے نہائیت ہی قلیل مدّت میں فتح کرلیا۔ دریائے نیل کے دہانے پر اس نے ایک شہر آباد کیا، جو آج بھی سکندریہ کے نام سے موسوم ہے۔

ایران کے اس صوبے کی فتح کے بعد اس نے مرکزی ایران کی طرف توجہ دی۔ داراسوم اپنی فوجیں لے کر اس کے مقابلے کے لئے آگے بڑھا۔ دریائے دجلہ کے کنارے اربیلا کے مقام پر یہ خونریز جنگ لڑی گئی جس میں سکندر کو فتح ہوئی۔ دارا میدانِ جنگ میں مارا گیا۔سکندر نے ایرانی دارالحکومت کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔شاہی محلات کو زمین بوس کر دیا،اس کے بعد پیش قدمی کرتا ہوا وہ افغانستان کی سرحدوں تک پہنچ گیا۔ افغانستان کے چھوٹے قبیلے خود بخود ہی یا نہائیت ہی معمولی مدافعت کے بعد یکے بعد دیگرے سرنگوں ہوتے گئے۔ ۳۲۷ ق م میں اُس نے قندھار میں ایک مضبوط قلعہ بنوایا۔

یہاں سے وہ کابل پہنچا۔ یہاں بیٹھ کر اس نے ہندوستان پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اسی اثناء میں سوات، چترال اور باجوڑ کے علاقوں کو فتح کرتی ہوئی اس کی دوسری افواج بھی اس سے آملیں۔ اس نے ہندوستان پر حملہ کرنے کی تیاری مکمل کر لی۔ چنانچہ اُس نے دریائے سندھ کو اوجور اوہند کے مقام سے عبور کیا اور ٹیکسلا آپہنچا۔ ٹیکسلا کے راجا امبھی نے اُسے خوش آمدید کہا اور اس سے ہر طرح کی مالی اور فوجی امداد کا بھرپور وعدہ کیا۔ راجا امبھی کے زیر ہو جانے کے بعد اب اُسے راجا پورس کا سامنا تھا چونکہ سکندر کو اس کی جانب سے کچھ مدافعت کا خوف تھا۔ اس لئے پہلے اُس نے ایک پیغام کے ذریعے باجگزاری کی تلقین کی، مگر پورس نے نہ صرف یہ کہ اس کی اس پیش کش کو ماننے سے انکار کر دیا بلکہ مقابلے کے لئے اپنی فوجیں لے کر میدان میں اُتر آیا۔ اسی اثناء میں سکندر بھی دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر آپہنچا تھا۔ برسات کا موسم تھا اور دریائے جہلم زبردست طوفان میں تھا۔ اس لئے دونوں فوجوں میں کسی ایک کے لئے فوری طور پر دریا عبور کر لینا انتہائی مشکل تھا۔ اس طرح کئی ہفتے گزر گئے اور جنگ نہ ہو سکی۔ بالآخر سکندر نے ایک تنگ مقام سے دریا کو عبور کر کے پورس کے فوجوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں ہزارہا آدمی کام آئے۔ اس جنگ میں سکندر جیت گیا اور پورس شکست کھا کر گرفتار ہو گیا۔

پورس کی شکست کی وجوہات۔

۱۔ دونوں ملکوں کے فوجی نظام میں بہت فرق تھا۔ یونانی عسکری نظام یہاں کے فوجی نظام سے بدرجہا بہتر تھا۔ پھر یہ کہ یونانی سپاہی مسلسل جنگوں کے بعد کافی تجربہ حاصل کر چکے تھے۔

۲۔ سکندر، پورس کے مقابلے میں بہتر سپہ سالار تھا۔ اگرچہ پورس کی بہادری کے بارے میں بھی کسی کو شک شبہ نہیں تھا مگر سکندر بے حد دُوربین اور تجربہ کار جرنیل تھا۔

۳۔ پنجابی فوجیں رتھوں اور ہاتھیوں کے استعمال سے لڑ رہی تھیں۔ برسات کے

موسم میں اور پھر دریا کے کنارے پر اُن سے پوری مہارت سے لڑنا خاصا محال تھا۔ ابتداء میں تو ہاتھیوں نے یونانیوں کو بہت پریشان کیا مگر جب مُنہ پھیرا تو اپنی ہی فوج کو روندتے ہوئے گزر گئے۔

۴۔ جنگی ہتھیار اور سازوسامان بھی دونوں فوجوں کا مختلف تھا۔ یونانیوں کے پاس ہتھیار زیادہ مضبوط اور بہتر تھے۔ پورس کے سپاہی بے حد وزنی کمانیں رکھتے تھے، جس سے وہ بہت جلد تھک جاتے۔

۵۔ یونانیوں کے پاس لڑنے مرنے اور جیتنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں تھا اور پورس کے سامنے یہ صورتِ حال نہ تھی۔

جنگ ہارنے کے بعد پورس کو سکندر کے پاس لے جایا گیا۔ سکندر نے پورس سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے؟ جواب میں اس نے کہا کہ جو سلوک بادشاہ بادشاہوں سے کرتے ہیں۔ پورس کی اس غیرت مندانہ دلیری اور بے باکی نے سکندر کو خاصا متاثر کیا اور اس نے اس کا فتح کیا ہوا علاقہ واپس کر دیا۔ اب پورس اور سکندر ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ مقامِ جنگ پر سکندر نے دو نئے شہر آباد کئے۔ ان میں سے ایک جہلم ہے۔

یہ جنگ جیتنے کے بعد سکندر نے مشرق کی طرف پیش قدمی کی۔ دریائے راوی کے کنارے پر پہنچ کر اس کی مڈ بھیڑ ایک خونخوار قبیلے ساگلا سے ہوئی، جو بالآخر ہار گیا۔ اس جیت کے بعد اس علاقے کے بہت سے قبیلوں نے سکندر کی اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد سکندر نے دریائے بیاس کا رُخ کیا۔ یہاں اس کا ارادہ نندا کے مضبوط حکمران سے لڑنے کا تھا۔ لیکن فوج میں بے اطمینانی پھیل گئی۔ سالہا سال کی صعوبتوں اور مسلسل جنگوں سے وہ لوگ تنگ آ چکے تھے اور اب وہ واپس وطن جانے کے لئے بیتاب تھے۔ اس طرح وہ مجبور ہو گیا کہ واپسی کا سفر اختیار کرے۔

دریائے سندھ کے کنارے پر پہنچ کر اس نے فوج کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک کو درّہ بولان سے گزر کر خشکی کے راستے واپس جانا تھا اور دوسرے کو اپنے ساتھ لے

کردہ بحری راستے سے واپس لوٹا مگر راستے ہی میں ۳۲۳ ق م میں بابل کے مقام پر اس کا انتقال ہو گیا۔

پنجاب پر یونانی اثرات

اِس ضمن میں سکندر کے حملے کو مؤرخین نے چنداں اہمیت نہیں دی ہے۔ کہتے ہیں کہ دو سال کے قلیل سے عرصے میں وہ پنجاب پر کیا اثرات چھوڑ سکتا تھا۔ بظاہر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ یونانی اثرات پنجاب پر کافی دیر تک رہے۔

سکندر نے پنجاب کو ایک یونانی جرنیل کے حوالے کر دیا تھا۔ کئی ایک نئے شہر آباد کئے تھے، جہاں بہت سے یونانی باشندے بھی آباد ہو گئے تھے۔ ایسے حالات میں پنجاب کے تمدّن اور تہذیب پر یونان کے رہن سہن کا اثر ناگزیر تھا۔

اِس حملے کا سب سے پہلا اور اہم اثر یہ ہوا کہ برصغیر میں تاریخ کے بارے میں مستند قسم کی روایات قلمبند کرنے کا رواج ہوا، جبکہ اس سے پہلے کی تاریخ اندھیروں میں پڑی ہے۔ سکندر کے ساتھ بہت سے سائنسدان، ادیب اور مورّخ بھی آئے تھے۔ ان لوگوں نے بہت دیانتداری سے اس دَور کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ دوسرے اس طرح مشرق و مغرب کے راستے ایک دوسرے پر کھل گئے۔

بہت سے یونانی پنجاب میں آباد ہو گئے تھے، جن کی وجہ سے پنجابی ثقافت بے حد متاثر ہوئی۔ اشوک کے دَور میں ان علاقوں کی آبادی میں یونانی بھی شامل تھے۔ سکندر کے حملے سے دوسرا اثر یہ ہوا کہ سکوں کے ڈھالنے کا فن ترقی کر گیا۔ پنجاب میں سکّے نہایت بھدّے اور وزنی تیار کئے جاتے تھے۔ یونانیوں کی آمد کے بعد اُن میں نفاست آ گئی۔ یہی سنگ تراشی کا عالم تھا۔ پنجاب کے لوگ اس فن میں ماہر نہیں تھے، اس میں حُسن بھی یونانی راہ و رسم کے بعد ہی پیدا ہوا۔

ہندی یونانی فن کے حسین امتزاج نے گندھارا آرٹ کو جنم دیا۔ کشن دورِ

حکومت میں اِس آرٹ کو بہت ترقی ہوئی۔ اس حملے کا سیاسی اثر یہ ہوا کہ یہاں قبیلوں کا سرداری نظام ختم ہو کے رہ گیا۔ جس کے نتیجے میں ایک وسیع اور مضبوط حکومت کی داغ بیل پڑی۔

موریا خاندان

چندر گپت موریا

مگدھ کی ریاست شمالی ہندوستان کی ریاستوں میں سے اس وقت سب سے اہم ریاست تھی۔ جب سکندر حملہ آور ہوا تو اسوقت برصغیر مختلف ریاستوں میں منقسم تھا۔ یہ ساری ریاستیں غیر منظم تھیں اوران کی کمزوری کا باعث بھی یہی تھا۔ سکندر کو شمالی حصّوں پر قبضہ کرنے میں کسی خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ پنجاب پر قابض ہو گیا تھا۔ لیکن چونکہ سکندر کی حکومت یا سکونت مستقل نہ تھی اس لئے جب ۳۲۵ ق م میں اس کی فوجیں واپس جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں، اس وقت برّصغیر کی وہی حالت تھی، جو اس کے حملے کے وقت تھی، البتہ مگدھ میں ایک منظم ریاست کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ آریاؤں کے زمانے میں یہ پٹنا اور گیا پر مشتمل تھی اور ویدک رشیوں کے عہد سے ہی دلیری اور بہادری کے لئے مشہور تھی۔ اس ریاست کے قدیم حکمرانوں نے اپنی قوت کے ذریعے چند کمزور ریاستوں کو اپنے قبضے مین لے لیا تھا۔ سی طرنگ خاندان کے آخری راجا اُود کی حکمرانی کا علم بدھ قرائن سے ہوتا ہے۔ اُود کے انتقال کے بعد سے ریاست مگدھ کی تاریخ پھر اندھیروں میں گم ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد نندا خاندان اس ریاست پر حکمران دکھائی دیتا ہے، جس کا بانی مہا پدم تھا۔ یکے بعد دیگرے نندا خاندان کے آٹھ حکمران برسرِ اقتدار آئے۔ لیکن کوئی بھی ہردلعزیز یا تاریخ ساز حکمران نہ بن سکا۔ یہاں تک کہ نندا خاندان کو زوال آ گیا۔ بعض روایات کے مطابق یہ حکمرانی ۱۰۰ سال کی تھی اور بعض کے مطابق صرف ۲۲ سال۔

ایسے حالات میں فطرت ایسے شخص کو منتخب کرتی ہے جو انقلابی ہو اور عوامی بے سکونی کا علاج کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ یہ شخص چندر گپت موریا کے رُوپ میں سامنے

آیا۔ یہ پنجاب کا پہلا اور با قاعدہ حکمران تھا۔ اس نے مگدھ کی ریاست کی داخلی بدنظمی سے فائدہ اُٹھا کر ریاست پر قبضہ کرلیا۔ قدرت نے اُسے چانکیا جیسا زیرک مشیر بھی دیا تھا، جس کی فہم وفراست کی بدولت اس کی سرحد میں افغانستان بھی شامل ہوگیا۔ چندر گُپت موریا نے نہائیت ہی قلیل عرصے میں مرکزی حکومت کو مضبوط کرلیا۔

چانکیا جب نندا حکمرانوں سے تنگ آکر اور بہت سی دولت لے کر پاٹلی پتر کی طرف نکل گیا تو وہاں اس نے ایک عظیم فوج تیار کی جس کی مدد سے اس نے نہ صرف چندر گپت موریا کے ہاتھ مضبوط کیئے بلکہ پنجاب کی طرف یونانیوں کی نظروں کو بھی اٹھنے سے روک دیا۔ کچھ یونانی سکندر کے وارث بننا چاہتے تھے مگر چندر گپت موریا نے ان کی سرکوبی کر کے پنجاب کو بیرونی تسلّط سے بچالیا۔

۳۰۵ ق م میں سلوکس نے پنجاب پر حملہ کرنے کی ٹھانی تا کہ وہ سکندر کے مفتوحہ علاقوں کو اپنے قبضے میں لے سکے۔ لیکن اس کا یہ خواب پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ اب اس کے سامنے سکندر والا پنجاب نہیں تھا بلکہ ایک مرکزی حکومت سے مضبوطی سے وابستہ پنجاب تھا۔ یونانی افسروں کو عبرتناک شکست ہوئی اور وہ ہندوکش کی طرف بھاگ نکلے۔ بالآخر سلوکس کو صُلح کرنی پڑی۔ اس صلح نامہ کی رو سے چندر گپت موریا کی حکومت پنجاب سے آگے بلوچستان اور افغانستان تک پھیل گئی۔ اس طرح اس حکومت کو بیرونی حملوں سے بچنے کے لئے قدرتی تحفظ مل گیا۔

سلوکس نے تعلقات کو مزید مستحکم کرنے کے لئے اپنی بیٹی کی شادی بھی چندر گپت موریا سے کر دی۔ پھر ان تعلقات کو مزید تقویت دینے کے لئے شاہی دربار میں یونانی سفارت خانہ ۳۰۳ ق م میں قائم کردیا گیا۔ سلوکس کو دربار موریا سے ۵۰۰ ہاتھی انعام میں عطا ہوئے۔ اس کے بعد سلوکس نے سکندر کے مفتوحہ علاقوں کو پھر سے حاصل کرنے کا خیال ترک کردیا۔ اب اس نے مغربی ایشیاء کی تسخیر کا فیصلہ کرلیا۔

سلوکس کا نامور سفیر میگھتھنیز ۳۰۲ ق م میں موریا دربار میں پہنچا۔ یہ پاٹلی پتر میں کافی عرصے تک رہا۔ وہ عمرانیات کا ماہر تھا۔ یہاں وہ انسانی تہذیب وتمدّن، عادات و

خصائل کا مطالعہ کرتا رہا، پھر اس مطالعے کو اس نے کتابی شکل دی جو کہ اس دور کی مستند تاریخ کہلاتی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب مکمل ہم تک نہیں پہنچ سکی لیکن جو حصے ہم تک پہنچ سکے ہیں ان سے ہماری معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق قوت کا سرچشمہ تمام تر بادشاہ وقت ہی ہوتا تھا۔ اس کے احکامات سے سرتابی سب سے بڑا جرم تھی۔ چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی بادشاہ کے علم میں لایا جاتا تھا اور چندر گپت موریا بھی شکایات کو دل و جان سے سُنتا اور انہیں رفع کرنا اپنے فرائض میں شامل سمجھتا تھا۔ اتنی وسیع سلطنت کے چھوٹے چھوٹے واقعات کا اپنے علم میں رکھنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ لیکن چندر گپت موریا اپنی ذہانت اور بُردباری سے سب کام نبھاتا تھا۔

پاٹلی پتر جو کہ مگدھ کا اہم شہر اور دارالحکومت تھا، نہایت عمدہ انتظام کے تحت چل رہا تھا۔ پنجاب میں میگھتنیز کے مطابق ٹیکسلا کی طرف چندر گپت موریا کی توجہ زیادہ تر تھی۔ ٹیکسلا کے انتظام کے لئے میونسپل کمیٹی کی نہج پر ایک کمیٹی تھی، جو کہ شہر کی تمام ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھی۔ رفاہِ عامہ کے کام اسی کمیٹی کے سپرد تھے، جو مندرجہ ذیل شعبوں میں تقسیم تھی:

۱۔ صنعت و حرفت اور محصولات مقرر کرنے والی انتظامی مجلس۔

۲۔ بیرونی سیاحوں اور مسافروں کی خبر رکھنے اور امداد دینے والی انتظامی مجلس۔

۳۔ پیدائش اور موت کا اندراج کرنیوالی کمیٹی۔

۴۔ تجارتی معاملات کا انتظام اور ناپ تول کے نظام کی دیکھ بھال کرنے والی مجلس۔

۵۔ تیار شدہ اشیاء کا معائنہ کرنے والی مجلس۔

۶۔ چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی روکنے والی انتظامی مجلس۔

۷۔ فروخت شدہ اشیاء پر ٹیکس لگانے والی کمیٹی۔

ٹیکسلا کے علاوہ اِردگرد کے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کا انتظام بھی بخوبی چلتا تھا۔ دیہاتوں میں افسر مقرر ہوتے جو کہ گرامک کے نام سے پکارے جاتے۔ یہ اعزازی

طور پر کام سرانجام دیتے تھے۔ عوام کے ذریعے ان کا انتخاب ہوتا تھا۔ ان افسروں کے کاموں کو دیکھنے کے لئے اور مزید ہدایات دینے کے لئے نگہداشت کرنیوالا افسر ہوتا، جو گوپ کے نام سے پکارا جاتا۔ اس طرح ایک گوپ کی نگرانی میں دس گاؤں کا ایک یونٹ ہوتا تھا۔ کئی گاؤں مل کر ایک پرگنہ بنتے تھے۔ گوپ کے انتظام کو جانچنے کے لئے ایک اور افسر ہوتا تھا، جسے استھانک کہتے تھے۔

معاشرے کے مختلف طبقات

۱۔ معاشرہ سات حصّوں میں تقسیم تھا۔ جن کے مرتبوں میں فرق تھا۔ برہمن، پنڈت اور عام لوگ سنیاسی زندگی بسر کرتے تھے۔ مذہب اور مذہبی امور کی دیکھ بھال کرنا ان لوگوں کا کام تھا۔ بادشاہ سال میں ایک بار ان لوگوں کا اجلاس بلاتا اور ان کی کارکردگی کے مطابق ان میں انعامات تقسیم کرتا تھا۔

۲۔ کسانوں کا طبقہ: یہ لوگ زراعت اور کھیتی باڑی کی طرف توجہ دیتے تھے۔ ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔

۳۔ خانہ بدوش: ان میں شکاری اور چرواہے آتے تھے۔ یہ خانہ بدوشوں جیسی زندگی گزارا کرتے تھے۔

۴۔ کچھ لوگ تجارت اور صنعت و حرفت کا کام کرتے تھے۔

۵۔ سپاہی پیشہ لوگ: یہ ایک الگ طبقہ تھا، جن کو سرکاری خزانے سے تنخواہ ملتی تھی۔

۶۔ سراغ رسانی اور خفیہ رضا کار: یہ لوگ سی۔ آئی۔ ڈی کا کام کرتے تھے۔

۷۔ مشیر: یہ وہ طبقہ تھا جو بادشاہ کی مشاورتی کونسل بھی کہلاتا تھا۔ ملکی سیاست میں ان کا خاصا عمل دخل تھا۔

یہ گروہ بندی بڑی سخت تھی۔ کوئی شخص اپنا گروہ یا پیشہ چھوڑ کر دوسرے گروہ میں شامل نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہی کوئی دُوسرا پیشہ اختیار کر سکتا تھا۔ البتہ حکماء میں شمولیت کی اجازت تھی۔ ان کی شادیاں صرف اپنے اپنے گروہوں میں ہی ہوتی تھیں۔

چندر گپت موریا کے دور میں پنجاب بڑا خوشحال صوبہ تھا۔ یہاں کے لوگ سونے اور چاندی کے زیورات پہنتے تھے۔ جلوسوں اور تہواروں میں حصہ لیتے۔ اچھا لباس پہنتے تھے۔ چوری کا کسی کو ڈر نہیں تھا۔ حتیٰ کہ لوگ مکانوں کو تالا تک نہیں لگاتے تھے۔ برہمنوں کو قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ چھوت چھات کی رسم موجود تھی۔ جس وجہ سے برہمن کو افضل مانا جاتا تھا۔ نچلے طبقے کے لوگوں میں اسی وجہ سے نفرت اور بددلی کا جذبہ موجود تھا۔ ستی کا رواج نہیں تھا۔ غلام رکھنے کی اجازت تھی۔ اگرچہ اس میں یونانی انداز اور بربریت موجود نہ تھی۔ البتہ غلاموں سے سلوک کرنے کیلئے کوئی قانون نہ تھا۔ لوگوں کی غذا سادہ تھی۔ لوگ اکثر گھوڑے اور ہاتھی سواری کیلئے استعمال کرتے تھے۔ یہ سفیر لکھتا ہے کہ راجا کے پاس شان و شوکت کے تمام سامان موجود تھے۔ لوگ شیو کی پوجا کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ موریا آتش پرست تھے۔ میگھستنیز راجا کی عظمت کے بیان کے ساتھ ساتھ شاہی اور درباری سازشوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے بادشاہ کی فارغ البالی اور خوشحالی میں خاصا فرق پڑتا تھا۔

تجارت کی ترقی کی وجہ سے ملک خوشحال ہوا جا رہا تھا۔ بہت سی انجمنیں تشکیل پا گئی تھیں۔ تجارتی ترقی کے لئے مواصلات اور ذرائع آمد و رفت میں خاصی دلچسپی لی گئی۔ ایک سرکاری سڑک تعمیر کروالی گئی جو ملک کے اندرون کو صوبہ سرحد اور ٹیکسلا سے ملاتی ہے۔ ان سڑکوں پر میلوں کے لئے خالی پتھر استعمال کئے جاتے تھے۔ تجارت کے علاوہ فوجی نقل و حرکت کے لئے بھی یہ سڑکیں استعمال ہوتی تھیں۔

چندر گپت موریا کی سلطنت کئی صوبوں میں منقسم تھی۔ صوبوں کا انتظام شاہی افسروں کے سپرد تھا۔ مگدھ سے دور دراز کے علاقوں کے انتظام میں خفیہ محکمہ بھی قائم تھا، جو بادشاہ تک خفیہ طور پر خبریں پہنچاتا تھا۔ نظم و نسق کی حالت بہت بہتر تھی۔ بادشاہ مطلق العنان تھا۔ اس کی رائے کو رد کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ فوجی، عدالتی، قانونی اور انتظامی امور میں اگرچہ وہ خود مختار تھا، لیکن ساتھ ہی اسے ان تمام شعبوں میں مہارت بھی حاصل تھی۔ اس لئے اس کی رائے ہر لحاظ سے قابلِ قبول اور اہم ہوتی تھی۔ انصاف کرنا

وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کچھ وزراء تھے جو کہ معاملاتِ سلطنت میں اس کی مدد کرتے تھے۔ یہ خاص وزراء عام وزیروں میں سے انتخاب کے ذریعے چُنے جاتے تھے۔ وہ آٹھ ہزار پانا سالانہ تنخواہ وصول کرتے تھے۔ خاص وزیروں کے ساتھ ساتھ عام وزیر یا مشیر بھی تھے، جو رائے دے سکتے تھے۔ انہیں منتری پرشاد کہا جاتا تھا۔ ان کی سالانہ تنخواہ ۱۲۰۰۰ پانا تھی۔ اہم مسائل کے حل کے وقت ان کی اسمبلی بلائی جاتی۔ راجا اگرچہ خود مختار تھا لیکن اکثر وہ وزیروں کی رائے کو سنتا اور قبول کر لیتا۔ بہت سے محکمے خود مختاری سے کام کرتے تھے۔ رفاہِ عام کے کاموں میں سے قحط کی روک تھام، تعلیم، آبپاشی کا نظام وغیرہ ان کے سُپرد تھا۔

پنجاب کے لوگوں کو بیرونی حملوں نے چاک و چوبند رہنا سکھا دیا تھا۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ لڑائی کے شوقین تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ بلکہ بیرونی حملہ آوروں نے انہیں اپنی حفاظت کرنا سکھا دیا تھا۔ شمالی علاقوں کے انتظام کے لئے ایک عظیم فوج تھی۔ تقریباً ۴۰۰۰۰ پکے سپاہی ــــــ چندر گپت موریا کے پاس تھے۔ ان کے انتظام کے لئے ایک فوجی دفتر قائم تھا، جس کے تحت کچھ بورڈ کام کرتے تھے۔ ہر بورڈ کے چھ ممبر تھے، جن کے سُپرد مختلف کام تھے۔ فوج کے بھی مختلف یونٹ تھے۔ جہاز رانی، ذرائع آمد و رفت، سوار فوج، پیادہ فوج، رتھوں اور ہاتھیوں کا انتظام بھی دفترِ حرب کے سپرد تھا۔ کچھ مورخ کہتے ہیں کہ چندر گپت موریا کی فوج کی تعداد ۶۰۰۰۰۰ پیادہ، ۳۰۰۰۰ سوار، ۹۰۰۰ ہاتھی، ۸۰۰۰ رتھوں پر مشتمل تھی۔ حکومت کے ذمے خاص خاص یہ کام تھے:

۱۔ امن و امان کی بحالی۔

۲۔ علماء کے ذریعے دھرم شاشتر کے مطابق تعلیم دلوانا۔

۳۔ عدلیہ کا محکمہ اور عدل و انصاف کا خاص طور پر خیال رکھنا۔

۴۔ مال گزاری، مالیہ اور دیگر ٹیکس وصول کرنا۔ اس کے لئے بے شمار عملہ کام کرتا تھا جو کہ دیہات سے مالیہ وصول کرتا تھا۔ جن دیہات میں مذہبی اور تعلیمی ادارے موجود تھے ان کو مالیہ معاف تھا۔ پیداوار کا چوتھا حصہ حکومت بطورِ مالیہ وصول

کرنے کی مجاز تھی۔ آبپاشی کے لئے نہروں کا انتظام کیا گیا تھا۔

میگھتنیز کے علاوہ چندر گپت موریا کے وزیر چانکیا نے بھی ایک کتاب ارتھ شاشتر کے نام سے لکھی تھی۔ اس کتاب میں اس نے سیاسی اور انتظامی معاملات کے بارے میں مفصل لکھا ہے۔ وہ بادشاہ کو مطلق العنان دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے خیال میں بادشاہ قانونی اور آئینی پابندیوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ برہمن کے بارے میں وہ بھی عزت کی نظر رکھتا ہے۔ حکومت میں اس کے مطابق بہت سے غیر اخلاقی اصول رائج تھے۔ اردگرد کی ریاستوں سے صلح کرنا یا امن کی پالیسی پر چلنا اس کے خیال میں ناممکن سی بات ہے۔ حکومت کے خاص ہتھیاروں میں طاقت کے ساتھ وہ چالاکی اور فریب کو بھی جائز سمجھتا تھا۔ ہمعصر برابر کے راجا مشکوک ہوتے تھے اور ان پر اعتبار کرنا اس کے نزدیک گناہ ہے۔ قانون کی سختی اس قدر تھی کہ معمولی سے جُرم کی سزا موت یا ہاتھ پاؤں کاٹ دینا تھی۔

چندر گُپت موریا نے ۲۴ سال حکومت کی۔ اس کے تحت پنجاب کے علاوہ افغانستان، یُوپی، مگدھ اور بنگال کے علاقے بھی تھے۔

اشوک

چندر گپت موریا کی وفات کے بعد اس کا بیٹا بندہ سار تخت نشین ہوا۔ اس نے پچیس سال تک حکومت کی۔ چانکیا اب اس کا بھی مشیر تھا۔ اس کے عہد کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ ٹیکسلا میں بندہ سار کے خلاف بغاوت ہوگئی۔ اس نے اپنے بیٹے اشوک کو اس بغاوت کو کچلنے کے لئے روانہ کیا۔ وہ اپنی اس مہم سے کامیاب لوٹا۔

اس کی موت کے چار سال بعد ۲۶۹ ق م میں اشوک تخت نشین ہوا۔ اشوک میں اپنے دادا والی بہت سی خصوصیات تھیں۔ لیکن کچھ انفرادی خوبیاں بھی تھیں۔ وہ بے حد رحم دل، متقی، نیک دل اور رعایا پرور بادشاہ تھا۔ اگرچہ شہزادگی کے زمانے میں وہ بڑا ظالم تھا۔ ٹیکسلا کی گورنری کا عہد اس کی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس دور میں اس نے لڑائی کے سارے ہتھکنڈے سیکھ لئے تھے، جن کی مدد سے وہ اپنے حسب منشاء اپنی

شہرت اور کارنامے دنیا میں پھیلا سکتا تھا۔ جب بادشاہ بنا تو اس نے سوچنا شروع کر دیا کہ طاقت ہی وہ شے نہیں ہے جو دنیا کی ہر شے کو مغلوب کرے۔ اب اس کے دل میں اپنی سابقہ زندگی پر کچھ ندامت موجود تھی۔ شاید اب وہ اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک نیا چولا پہنا۔

مؤرخوں کا خیال ہے کہ کلنگ کی لڑائی میں اس نے جس بربریت اور ستم گری کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اس کے دل پر بے حد اثر کیا تھا۔ اس جنگ میں اس نے لاکھوں انسانوں کے خون کے علاوہ اپنے ۹۹ بھائیوں کو بھی قتل کیا تھا۔ اس قتل و غارت گری کی یاد اسے اکثر تنگ کرتی تھی اس لئے بادشاہت پر متمکن ہونے کے بعد اس نے اپنی پچھلی زندگی کو خیرباد کہنا بے حد ضروری سمجھا۔

کلنگ کا علاقہ دکن کی طرف جانے والے راستے کی کنجی تھا۔ یہ ریاست گوداوری اور مہاندی کے ریاستوں کے درمیان واقع تھی۔ کلنگ کے لوگوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش میں اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ ایک عالم کو قتل کرنے کے بعد اشوک کو فتح نصیب ہوئی۔ یہ اس دور کا ذکر ہے جب بدھ مت نے سکون اور آشتی کا پیغام عام کر دیا ہوا تھا اور بہت سے لوگ اس عقیدے کی طرف جھکنے لگے تھے۔ اس کی اچھائی اور عظمت کا اثر دلوں پر ہونے لگا۔ اسی عقیدے نے اشوک کو بھی متاثر کیا، جس نے اس کی زندگی ہی بدل کے رکھ دی۔ وہی اشوک جس نے کلنگ کی لڑائی میں ہزاروں آدمی قتل کئے۔ لاکھوں کو قید کیا۔ اب ایک دیندار اور رعایا پرور بادشاہ بن گیا۔ اس نے گوتم بدھ کی تعلیمات کو دل سے قبول کر کے اس پر پوری طرح عمل کرنا شروع کر دیا۔

متذکرہ لڑائی کے واقعات نے اشوک کے دل پر بڑا اثر چھوڑا تھا۔ اس لئے وہ بادشاہ بننے کے بعد لڑائیوں کو برا سمجھنے لگا تھا۔ اس جنگ کے بعد بیماری، قحط اور دوسری مصیبتوں نے اشوک کو پریشان کر دیا تھا۔ اب اس نے عہد کر لیا کہ آئندہ ہوس ملک گیری کے لئے وہ کبھی جنگ نہیں کرے گا۔ کلنگ کی فتح کے بعد کی لڑائیوں میں خونی رنگ موجود نہیں ہے۔ اس نے اپنی بڑائی اور عظمت منوانے کے لئے پھر کبھی جنگ نہیں کی۔ اب

اخلاقیات کو اس نے اپنا دھرم بنا لیا تھا۔ زندگی کے آخری لمحوں تک وہ بدھ مت پر ہی قائم رہا۔

اتنی وسیع سلطنت اور بے شمار آمدنی اب رعایا کی بہتری اور خوشحالی کے لئے خرچ ہونے لگی۔ وہ اس اصول کا قائل تھا کہ ظاہری فتح کی نسبت دل کی تسخیر بے حد اہم امر ہے۔ یہ فتح محبت، پیار، خلوص اور سچائی سے حاصل ہو سکتی ہے، نہ کہ میدانِ جنگ میں خون کی لکیروں سے۔ آئندہ آنیوالوں کے لئے اس نے یہ پیغام بھی چھوڑا ہے کہ بادشاہت ایک اعزاز ہے نہ کہ بادشاہ کا کام ملک فتح کرنا اور انسانوں کا قتل و غارت کرنا ہے۔ یہ اعزاز محض دلوں کو جیتنے سے ہی حاصل ہوتا ہے اور مقصد کے حصول کے لئے حلم، بُردباری، انکسار، خلوص، محبت، نیکی اور تقویٰ از حد ضروری ہے۔

اشوک اب ایک طرح کا بھکشو بن گیا تھا۔ اس نے بدھ مت کی تبلیغ کو اپنا اہم فریضہ جانا اور اسی میں مصروف ہو گیا۔ اپنی سلطنت کے ہر کونے میں اس نے اس صلح اور سکون کے پیغام کو پہنچایا۔ وہ خود دُور دراز کے علاقوں میں نکل جاتا اور لوگوں کو حق شناسی کی تبلیغ کرتا۔ جُوں جُوں وقت گزرتا گیا اس کا یہ جذبہ بھی روز افزوں ہوتا گیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ ''بدھ گیا'' کی زیارت کے لئے بھی گیا اور بدھ سنگا سے اپنے تعلقات بڑھانے شروع کر دیئے۔ کچھ مؤرخین یہاں تک لکھتے ہیں کہ وہ خود بھی راہبوں کی اس جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے اخلاقی اور مذہبی اصولوں کو پھیلانا اپنا مذہب بنا لیا تھا۔ اسی لئے وہ خود بھی دورے پر نکل جاتا اور ''دھرم'' کے اصولوں کا پرچار کرتا۔ ان دوروں سے اسے ایک یہ بھی فائدہ ہوا کہ وہ عوام سے رابطہ رکھنے کی وجہ سے ان کے حالات سے بذاتِ خود واقف ہو جاتا اور ان کی حتی الامکان امداد کرتا۔ اس تیاگ سے کچھ نقصان بھی ہوا کہ وہ پنڈتوں، شکاریوں، سپاہیوں اور مقدمہ بازوں سے دُور رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنے عوام کو یہ سبق دیا کہ جنت صرف علماء یا پنڈتوں کے رہنے کی جگہ ہی نہیں ہے بلکہ سچائی اور دینداری کے اصولوں پر گامزن ہو کر ایک عام شخص بھی جنت حاصل کر سکتا ہے۔ اس نے تقریباً ۲۵۶ راتوں کو مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ اب اس پر چھوت چھات کی

باتیں واضح ہو چکی تھیں اور وہ ان غریبوں کو ان گندے اور غلط اصولوں سے بچانا چاہتا تھا جو ہندومت اور برہمن نے ان پر مسلط کر رکھے تھے۔ اسی لئے اس نے ایسے مذہب کی تبلیغ کی جس میں بھائی چارے اور مساوات کا راستہ نکلا تھا۔

پنجاب چونکہ سب سے پہلے بیرونی حملوں کی زد میں آتا تھا اور دوسرے وہ یہاں کے علاقے میں گورنر کے عہدے پر بھی فائز رہ چکا تھا۔ اس لئے اس علاقے سے بھی اُسے خاص اُنس تھا۔ لہذا اس نے پنجاب کی طرف بھی خاص توجہ دی۔

اس مساوات واشتراک کے دین کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچانے کے لئے اس نے کچھ اصول مرتب کئے، جن سے لوگوں کا اخلاق سنور سکتا تھا۔ وہ اُصول یہ تھے اور اصلاحات یہ تھیں:

اخلاقی اصلاحات

ا۔ اہنسا: مہاتما بدھ نے جاندار کے شکار کی مناہی کی تھی۔ اشوک اپنی سابقہ زندگی میں شکار کا بے حد شوقین تھا۔ ایک وقت میں ہزار ہا جانور حلال کئے جاتے یا پکائے جاتے تب یہ کھانا کھاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی اس عادت کو بھی ترک کرنا شروع کر دیا اور کرتے کرتے ایک وقت میں صرف دو موروں کے گوشت پر آ گیا۔ ۲۵۷ ق م میں جانوروں کی حفاظت کے اصول مرتب کئے گئے۔ جانوروں اور پرندوں کو مارنا قانوناً جُرم قرار دے دیا گیا۔ اشوک نے حکماً ان تہواروں پر بھی قربانی کو ممنوع قرار دے دیا جن پر سب لوگ خوشی میں پرندوں کا شکار یا جانوروں کو حلال کیا کرتے تھے۔ وہ بدھ مت کے اس بنیادی اصول کہ ''روح نہیں ہے'' کا پیروکار ہونے کے باوجود وہ ''کرم'' کا ماننے والا تھا، جس کی رو سے ایک چھوٹی سی چیز بھی اگلے جنم میں مہادیو بن کر سامنے آ سکتی تھی۔ اس لئے ہر جاندار کی جان کو وہ انتہائی قیمتی قرار دیتا تھا اور واجب الاحترام گردانتا تھا۔

۲۔ **مذہبی رواداری:** اگرچہ سرکاری مذہب بدھ تھا، لیکن دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی مکمل آزادی تھی۔ کسی مذہب کو بُرا نہیں کہا یا سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کسی دوسرے مذہب کے رہنما کو بُرا کہنا بدھ مت کو اپنی نظروں سے گرانے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

۳۔ **مذہبی کونسل:** اشوک کے عہد میں پاٹلی پتر مین بدھ مت کے راہبوں کی تیسری کونسل ہوئی۔ سب سے پہلی کونسل راجا گڑھ میں منعقد ہوئی تھی اور دوسری ولیالی کے مقام پر بلائی گئی تھی۔ کیونکہ کچھ راہبوں نے بُری عادات اپنا لی تھیں۔ اشوک نے تیسری کونسل اس لئے بلائی تھی کہ وہ بدھ مت کے اندر پیدا شدہ اختلافات کو دور کر سکے، جو اس کے پیروکاروں میں پیدا ہو گئے تھے۔ یہ کونسل نو ماہ تک بحث و مباحثہ میں مصروف رہی۔ اس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ بیرونِ ملک بھی راہبوں کو بھیجا جائے تا کہ بدھ مت کی تبلیغ سرحدوں کے اندر ہی قید ہو کر نہ رہ جائے۔

۴۔ **بزرگوں اور عالموں کی عزّت و تکریم:** ماں باپ کا حکم ماننا ہر فرد کا فرض تھا۔ اُستاد، بزرگ، عالم اور راہب کی عزت کرنا بھی لازمی تھا۔ رشتہ داروں، عزیزوں، دوستوں اور ہمسایوں سے محبت کی جاتی تھی۔ لوگ چھوٹوں، غریبوں اور غلاموں سے پیار اور شفقت سے پیش آتے تھے۔

۵۔ **سخاوت:** انسان کو خوش اخلاق، پرہیزگار، سخی اور نیک دل ہونا چاہیے۔ ضرورت کے وقت دوسروں کے کام آنا۔ رحمدلی اور انصاف سے کام لینا اشوک کی حکومت کا اصول تھا۔

ان تمام اُصولوں کو منوانے اور عام کرنے کے لئے اشوک نے تمام ملک میں کتبوں سے کام لیا۔ یہ کتبے اس دَور کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہم ان کی مدد سے اس دَور کی سماجی، تہذیبی اور مذہبی زندگی کی تصویریں صحیح انداز میں دیکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ اشوک کے پیشِ نظر صرف مذہبی مقصد تھا، لیکن اس سے اور مقاصد بھی حل ہو گئے تھے۔ ان

کتبوں کی تعداد ۳۴ ہے۔ کچھ پہاڑوں کی چٹانوں پر کندہ کیئے گئے ہیں۔ اور کچھ پتھر کے کھمبوں اور ستونوں پر کھدوائے گئے ہیں۔ یہ کتبے عوام کی زبان میں لکھے گئے تھے۔

اشوک نے صرف مذہب ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ عوامی رفاہ کے کام بھی کئے ہیں۔ اور اسی وجہ سے اس کی وسیع سلطنت کے لوگ یعنی افغانستان، سرحد، پنجاب، بلوچستان، سندھ، کچھ، کشمیر، نیپال اور میسور تک کے لوگ اس سے خوش تھے۔ اپنی رعایا کے آرام کے لئے وہ ہر پانچویں سال ایک اکٹھ کرتا، جس میں مختلف عہدیداروں کا احتساب کیا جاتا تھا اور کوتاہی کرنے والوں کو سزا دی جاتی تھی۔

اشوک کی موت یعنی ۲۴۲ ق م کے بعد ہی اس خاندان کو زوال آ گیا تھا۔ اس زوال کا سب سے بڑا سبب برہمن بنے تھے۔ وہ اشوک کی مذہبی پالیسی کی وجہ سے اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ اگر چہ اشوک نے دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیا تھا مگر وہ دل سے اس کے مخالف تھے۔ اس زوال میں شنگ خاندان کا بھی ہاتھ تھا۔ اس نے بھی موریا سلطنت کو کافی نقصان پہنچایا۔ سلطنت اتنی وسیع تھی کہ اشوک جیسے زیرک اور جہاندیدہ انسان ہی کا کام تھا کہ انتظامی لحاظ سے اسے سنبھالے رکھا۔ بعد میں کوئی بھی ایسا حکمران نہ ہوا کہ ٹیکسلا کی آزادی کی تحریک کو کچل سکتا۔ اندرونی حالات کے ساتھ ساتھ بیرونی حملے بھی اس سلطنت کے زوال کا ایک سبب بنے۔

بیرونی حملے

اندرونی اور داخلی گڑ بڑ کے علاوہ پنجاب پر باہر سے بھی حملے ہوتے رہے۔ سکندر اعظم کے مفتوحہ علاقوں پر پھر سے قدم جمانے کی تگ و دو شروع ہو گئی۔ چندر گپت موریا اور اشوک نے یہ مقصد حل نہ ہونے دیا، لیکن اشوک کی موت کے بعد دور دراز کے صوبوں میں آزادی کی لہر اٹھی اور وہ خود مختار ریاستوں میں تبدیل ہو گئے۔

سلوکس کا پوتا۔ انیٹا کوس۔ ۲۶۱ ق م میں ان تمام علاقوں کا حکمران بنا جن کا منتظم سلوکس تھا۔ وہ عملی طور پر ناکارہ حکمران تھا۔ جو کہ عیش پرستی میں مشغول رہتا تھا۔ اسی

کی نالائقی کی وجہ سے اس کے ہاتھوں سے پارتھیا اور باکڑیا کے علاقے نکل گئے۔ ایران کا صوبہ باکڑیا قدیم تہذیب کا مرکز تھا۔ زرخیزی اور متمدن اقوام کا گھر تھا۔ یہ صوبہ ایک ہزار شہروں اور دیہاتوں پر مشتمل تھا۔ سکندر کے حملے کے بعد اس صوبے کے لوگوں نے یونانی اثرات کو اپنا لیا۔ اس طرح یہ یونانیوں کی جاگیر بن گیا۔

سیتھی

پارتھیوں نے پہلی صدی عیسوی تک اس برصغیر کے شمالی علاقوں تک حکومت کی۔ ان کے بعد نئے حملہ آور اس ملک میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ یہ سیتھی کہلاتے تھے۔ ان کی ایک قوم سک یا سکا کہلاتی تھی۔

ترکمان کے کسی گروہ نے سکوں پر حملہ کر کے انہیں برصغیر میں داخل ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ لوگ دریائے چناب کے مغربی کنارے تک پہنچ گئے تھے۔ ٹیکسلا سے جو کتبے موصول ہوئے ہیں۔ ان سے بہت سے سک بادشاہوں کا پتا چلتا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں چندر گپت دوم نے سِک قوم کو شکست دی تھی اور انہیں ختم کر دیا تھا۔

اس ملک پر برابر حملے ہوتے رہے، لیکن کوئی مستقل حکومت قائم نہ کر سکا یا قائم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب یوچیوں کی باری تھی۔ ان میں سے ایک گروہ جس کا نام کش تھا، اس نے اس علاقے میں ایک سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس خاندان کے بہت سے بادشاہ یہاں حکمران رہے، لیکن ان میں سے کنشک کا نام زیادہ اہم ہے۔

کنشک

کنشک پاک و ہند کی تاریخ کا ویسا ہی نامور بادشاہ ہے جیسا کہ اشوک یا اس کا دادا چندر گپت موریا تھا۔ یہ کش یا کشان خاندان سے تعلق رکھتا تھا، جو ایک خانہ بدوش ترکی قبیلے یوچی کی شاخ تھا۔ ۱۶۵ قبل مسیح میں ہُن قوم کے ہاتھوں تنگ آ کر انہوں نے ترکِ وطن کیا تھا۔ صحرائے گوبی سے گزر کر جب یہ باختر کے علاقے میں پہنچے تو سفر کی صعوبتیں سہتے سہتے وہ تنگ آ چکے تھے، اس لئے انہوں نے امن اور سکون کی زندگی گزارنا

چاہی۔ صدیوں تک وہ امن و آرام سے رہے۔ ۳۰ء میں یہ قبیلہ کئی حصوں میں بٹ گیا۔
ان میں سے کشاں نے دوسروں کو شکست دے کر برتری حاصل کر لی اور ان کے مقبوضہ
علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کا پہلا حکمران کد پھاسر تھا۔ اس نے اپنے گردونواح کے چھوٹے
چھوٹے حکمرانوں کو ختم کر دیا اور بادشاہی کو وسیع تر اور مضبوط بنا لیا۔ اس کی موت کے بعد ا
س کالڑ کا تخت نشین ہوا، جو کوئی اہم کارنامہ سرانجام نہ دے سکا۔

اس خاندان کا تیسرا حکمران کنشک ۱۳۰ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ سب سے طاقتور
اور نامور بادشاہ تھا۔ منگولوں کے ادب سے اس کی سلطنت کی وسعت کا علم ہوتا ہے کہ تمام
شمالی ہندوستان مع پنجاب، کشمیر اور مگدھ کے، اس کی حکمرانی میں تھا۔ ایک ماہر اور تجربہ کار
ناظم السلطنت ہونے کے ساتھ ساتھ کنشک ایک پرجوش مبلغ بھی تھا۔ بدھ مت کی ماہیان
شاخ کی تبلیغ اس کا اوّلین فرض تھا۔ اس کی شخصیت کو جب دیکھتے ہیں تو اس میں اشوک کا
خلوص اور پرہیز گاری چندر گپت موریا کی سی شجاعت اور بہادری ملتی ہے۔ اس کے تخت
نشین ہونے کے بارے میں ابھی تک اختلاف رائے ہے۔ ڈاکٹر رائے چودھری اور
پروفیسر اپیسن ۷۸ء بتاتے ہیں۔ جب کہ سمتھ نے اس کی تخت نشینی کا سال ۱۲۸ء بتایا ہے۔

کنشک کی سلطنت کا مرکزی شہر اور دارالحکومت پشاور تھا، جو اس وقت پرشپور
کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ فن تعمیر کا خوبصورت ذوق کنشک میں موجود تھا۔ اس نے
اس شہر کو نہائیت خوبصورت عمارتوں اور سیر گاہوں سے سجایا تھا۔ اس نے لکڑی کا ایک بلند
مینار بھی تعمیر کروایا، جس میں اس نے مہاتما بدھ کی بعض نشانیاں دفنا دی تھیں۔

کنشک جنگجو بادشاہ تھا اور لڑائی کے لئے فطری رجحان رکھتا تھا۔ فتوحات کا
شوقین تھا۔ اس نے اپنی وراثتی سلطنت میں فتوحات سے خاصا اضافہ کر لیا تھا۔ کشمیر کے
مکمل الحاق پر وہ ہمیشہ فخر کیا کرتا تھا۔ وادیِ سندھ کی طرف بھی وہ جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔
تبتی اور چینی روایات کے مطابق اس نے مگدھ کا علاقہ بھی فتح کر کے اپنی سلطنت میں
شامل کر لیا تھا۔ اس کے عہد کی سب سے بڑی لڑائی چین کے ساتھ لڑی گئی۔ کشاں
خاندان چین سے زمانہ قدیم سے دشمنی رکھتا تھا۔ کنشک نے ۷۰۰۰ ہزار سپاہی چین کو فتح

کرنے کے لئے روانہ کیے۔ لیکن چینیوں کی بیدار مغزی اور ہوشیاری سے کنشک کی فوجوں کو شکست ہوئی اور بجائے فاتح ہونے کے مفتوح بن گئے اور چین کا باجگوار ہونا پڑا۔ مگر کچھ عرصہ بعد اس نے پھر ایک بھرپور حملہ کیا اور کامیابی حاصل کر کے رہا۔ اس فتح کے بعد اس کی سلطنت میں کاشغر، ختطان اور یارقند کے صوبے بھی شامل ہو گئے۔ اس کی مملکت اتنی وسیع ہو گئی کہ یارقند کی پہاڑیوں سے لے کر مگدھ کے میدانی علاقوں تک کنشک کا نام چلتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ کنشک ہندی النسل نہیں تھا، لیکن اس نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ اور کچھ ہی عرصے بعد اس نے بدھ مذہب کو اختیار کر لیا اور اپنی باقی ساری عمر اس مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں گزار دی تھی۔ آغازِ حکومت میں وہ اپنے باپ دادا کی طرح مناظرِ قدرت کو ہی پوجتا تھا۔ بتوں کو بھی پسند کرتا تھا۔ اس نے اپنے سکوں پر ہندی، یونانی، زرتشتی دیوتاؤں کی تصویریں بھی بنائی ہوئی تھیں۔ ہندوستان کے دیوتاؤں میں سے شیو دیوتا کو اس کے ہاں خاصی اہمیت حاصل تھی۔ بدھ مذہب کی روایات کے مطابق بدھ مت قبول کرنے سے پیشتر کنشک ایک ظالم اور سفاک انسان تھا خونخوار قسم کی جنگوں میں شریک ہونا اور قتل و غارت اس کا مشغلہ تھا۔ اشوک کی طرح بدھ مت کو اپنانے کے بعد اس میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہو گئی تھی اور وہ آہستہ آہستہ نیک رحمدل، صبر و تحمل والا بن گیا، اور عمر کے آخری حصے میں وہ ایک نیک دل بادشاہ کی صورت میں تاریخ کے صفحات پر ابھرتا ہے۔

مذہب کے ساتھ ساتھ وہ فنونِ لطیفہ میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ اگرچہ اس کا بہت سا وقت جنگوں اور فتوحات کے شوق میں ہی گزرا، لیکن وہ اِس طرف سے بھی غافل نہیں رہا۔ پشاور میں جو کھڑی کا ۴۰۰ فٹ اُونچا مینار اس نے بنوایا تھا، وہ حُسن و خوبی میں اپنا جواب آپ تھا۔ اس نے کشمیر میں بھی ایک مینار بنوایا جو آج تک اس کے نام سے منسوب ہے۔ پشاور کے علاوہ پنجاب کے بہت سے علاقوں میں خانقاہیں، بُت اور سٹوپا بھی بنوائے جن کے نشانات آج بھی موجود ہیں۔ اس کا گرو "اسوگھرش" مذہب، اخلاق،

موسیقی اور فلسفے میں مہارت رکھتا تھا۔ اسے آج بھی لوگ گوئٹے، ملٹن اور کانٹ کا ہم پلّہ سمجھتے ہیں۔ اس نے مہاتما بدھ کی حیات پر ایک کتاب لکھی، جسے رامائن اور مہابھارت کے برابر رکھا جاتا ہے۔ اسوگھرش کشمیر میں تیسری مجلس کا نائب صدر بھی مقرر ہوا۔ جس میں ۴۰۰ بدھ علماء نے شرکت کی تھی۔ اسی میں ماہیان فرقے کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا تھا۔

کنشک مضبوط کردار کا مالک تھا۔ ہندی نہ ہونے کے باوجود اس نے پاک و ہند پر انتہائی خوبصورتی سے اور بغیر تعصب کے حکومت کی۔ اس کا لباس ایشیائے کوچک کے باشندوں جیسا تھا۔ وہ طویل قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کی مادری زبان ایرانی تھی۔ اسکے بعد اس خاندان کا زوال شروع ہو گیا۔ کیونکہ آنے والے حکمران بڑے نااہل اور بزدل ثابت ہوئے۔

سمندر گُپت

گُپتا خاندان سے پہلے برصغیر پاک وہند میں ایک بار پھر تاریکی چھا گئی تھی، لیکن اس خاندان کے ساتھ ہی برصغیر کی تاریخ میں ایک روشنی نظر آنے لگتی ہے۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ چندر گپت اوّل تھا، جو ۳۲۰ء میں تخت نشین ہوا اور ۳۳۵ء میں ضعیف العمری کی وجہ سے اپنی حکومت اپنے بیٹے سمندر گپت کے حوالے کر دی۔

چندر گپت اوّل نے اپنی عمر کے آخری حصے میں اپنے لڑکے سمندر گپت کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ سمندر گپت کماردیوی کے بطن سے تھا، جو لچھاوی خاندان سے تعلق رکھتی تھی، اس لئے وہ شاہی حلقوں میں بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ ایک بہادر، علم دوست اور بیدار مغز حکمران ثابت ہوا۔

سمندر گپت بھی اپنے باپ کی طرح فتوحات کا خواہشمند تھا۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت وسعت پذیر ہونے لگی۔ وہ نہائیت دلیر، حوصلہ منداور بہادر حکمران تھا۔ اِس میں سکندر جیسی جرأت موجود تھی اور مہم جو طبیعت رکھتا تھا۔ وہ تمام کمزور ریاستوں کو ختم کردینا چاہتا تھا۔ اس کی فتوحات کی داستان الٰہ آباد کے کتبے سے ملتی ہے، جو اس کے

درباری شاعر ہری سین نے ایک رزمیہ کی صورت میں نظم کیا تھا۔ یہ کتبہ ایک لاٹ پر کندہ ہے، جو الٰہ آباد کے قلعہ میں آج بھی موجود ہے۔ یہ لاٹ اشوک کی تعمیر کردہ ہے اور کتبہ کندہ ہونے کی تاریخ ۳۶۰ء ہے۔ اِس کتبے سے اس وقت کے تاریخی حالات کے ساتھ ساتھ اَدبی ذوق کا بھی علم ہوتا ہے۔ کہ کتبہ دیوناگری رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔

اس رزمیئے سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ وہ بہت بڑا فاتح، دلیر اور نڈر سپاہی تھا، اور عسکری معاملات میں بڑا ماہر تھا۔ شمالی ہندوستان کی تمام ریاستوں کو اس نے زیر کیا اور ان کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے ایک متحدہ اور مضبوط حکومت قائم کی۔ وہ ایک دُور رس سیاستدان بھی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اتنی وسیع سلطنت کو سنبھالنا بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس لئے اسے اتنا وسیع نہیں کیا جانا چاہیے کہ اسے قابو میں ہی نہ رکھا جا سکے۔ لہٰذا اس نے جنوبی ہندوستان کے حکمرانوں کو مفتوح کر کے انہیں اپنا باجگزار بنا لیا تھا۔ یہ پالیسی اس کی سلطنت کے مضبوط بنانے میں بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔

سمندر گپت کی حکومت چندر گپت اوّل کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع تھی۔ شمالی ہندوستان میں ہگلی سے لے کر جمنا تک اور ہمالہ سے لے کر نربدا تک کا سارا علاقہ اس کی سلطنت میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ نیپال، کانگڑہ، پنجاب، بھوٹان اور راجپوتانہ کی سلطنتیں اس کی باجگزار تھیں۔ علاوہ ازیں کابل اور شوراسترا کے حکمران بھی اس کے حواریوں میں سے تھے۔

سمندر گپت ہندو مت کا پیرو تھا۔ اور وشنو دیوتا کی پوجا کرتا تھا۔ برہمنوں سے وہ بے انتہا عقیدت رکھتا تھا، اور انہیں اکثر تحفے تحائف پیش کرتا رہتا تھا۔ عام مذہبی معاملات میں وہ خاصا وسیع القلب تھا۔ ہر طرح کا شخص، خواہ وہ کسی بھی مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھتا ہو، اس کی مملکت میں آزادی سے مذہبی رسومات ادا کر سکتا تھا۔ اس نے لنکا کے راجا کو بدھ مت کے بھکشوؤں کے لئے خانقاہ کی تعمیر کی اجازت دے کر اپنی اس فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔

چندر گُپت دوم

یہ سمندر گپت کے بعد ۳۷۵ء میں تخت نشین ہوا۔ اس میں باپ دادا کی تمام صلاحتیں موجود تھیں۔ باپ کی زندگی میں وہ اکثر اس کے ساتھ سلطنت کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔

اس کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ باجگزار ریاستوں کو ختم کرنا تھا۔ چنانچہ دُوسری ریاستوں کے ساتھ ساتھ پنجاب پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ پہلے دارالحکومت پاٹلی پتر ہی تھا، لیکن چندر گُپت نے اجین کو صدر مقام بنا لیا۔

اس کا دَور ہندو اَدب اور فنونِ لطیفہ کا سنہری دَور تھا۔ کالیداس کا مشہور ڈراما بے مثل ہے، وہ اسی دور کا شاعر تھا۔ سنگ تراشی میں یہ دَور اپنا جواب نہیں رکھتا۔ آج بھی میمن اور صوبجات متوسط میں اس کے نمونے موجود ہیں۔ قطب مینار کے پاس ہی لوہے کے ایک ہی ٹکڑے سے بنا ہوا مینار اس راجا کی فنونِ لطیفہ سے محبت کی داستان سنا رہا ہے۔ مذہبی آزادی اس کے دَور میں بھی عام تھی۔ حتیٰ کہ اس کا کمانڈر ران چیف امر کر دیو بدھ مت کا پیروکار تھا۔ اس طرح اور بہت سے دوسرے مذاہب کے لوگ بلند عہدوں پر فائز تھے۔

اس کی وفات (۴۱۴ء) کے بعد اس کا بڑا لڑکا کمار گپت تخت نشین ہوا، لیکن وہ کوئی اہم کارنامہ سرانجام نہ دے سکا، اس کا بیٹا سکند گپت اس کے بعد بادشاہ بنا اور ۴۶۸ء تک حکومت کی۔ اس کے دور میں گپت خاندان کے زوال کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ وسط ایشیاء کی خونخوار نسلوں نے ہندوستان کی طرف اپنی فوجی کاروائیاں شروع کر دی تھیں۔ کچھ عرصے بعد برصغیر کی یہ عظیم سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

ہُن قوم کے حملوں نے گپتا خاندان کو بہت نقصان پہنچایا۔ یہ وسط ایشیاء کے خونخوار قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے پے در پے حملے کر کے سلطنتِ گپتا کی جڑوں کو ہلا دیا۔ گپتا حکمران اپنے اندرونی معاملات میں اتنی دلچسپی لیتے تھے کہ سرحدوں کی حفاظت

کی طرف انہوں نے دھیان ہی نہ دیا۔ سلطنت کے شمال مغربی حصے دارالحکومت سے بہت دُور تھے، اس لئے حملہ آوروں کے لئے کوئی روک تھام نہ تھی۔

ہرش

گُپتا خاندان کے زوال کے بعد یہ برّصغیر ایک بار پھر تاریکیوں میں گم ہو گیا۔ ہر طرف نفسانفسی کا عالم تھا۔ ملک میں کوئی مرکزی حکومت قائم نہ تھی۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وسط ایشیاء کے قبیلوں نے حملے شروع کر دیئے۔ خاص طور پر ہن قوم نے تو شمال مغربی حصّوں میں تباہی مچا دی تھی۔ گپتوں کے دَور کی تمام عظمتیں ہن قوم نے مٹا دی تھیں۔ چھٹی صدی عیسوی کے بعد پھر سے ایک دَور شروع ہوتا ہے، جبکہ ہرش نے ایک مضبوط حکومت قائم کر دی۔ اور ملک میں امن وامان کی صورتِ حال بحال ہو گئی۔ سلطنت کے انتظام کے سلسلے میں ہر مورّخ اس کی تعریف کرتا ہے۔ اشوک کی سی سچائی اور چندر گُپت دوم جیسی عظمت تو اس کے پاس نہ تھی، لیکن وہ ایک نہائیت عمدہ منتظم ضرور تھا۔

ہرش کے دَور کی تاریخ ہمیں مختلف ذرائع سے ملتی ہے۔ ایک تو بان کی ہرش چرتر، دوسرے سفرنامۂ ہیون تسانگ اور تیسرے ہیون تسانگ کی سوانح عمری، جو اس کے شاگرد نے مرتب کی تھی۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں ہرش پہلا حکمران ہے، جس کے متعلق ہمیں بے شمار تفاصیل ملتی ہیں۔ ہرش ادب نواز اور سخن فہم ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی ایک ادیب تھا۔ اس کے تین ڈرامے ناگا نندا، رتناولی اور پریادارسکا بہت اہم ہیں۔ ان ڈراموں کے ذریعے سے بھی اس کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

انہی ذرائع سے اس کی زندگی کے بارے میں تفصیل سے ہمیں علم ہو جاتا ہے۔ اس کے آباواجداد تھانیسر کے حکمران تھے۔ اس خاندان کے بانی کا نام پشپا بھارتی تھا، جو شیوا کی پوجا کرتا تھا۔ ہرش سے پہلے اس خاندان کے صرف چار حکمرانوں کا علم ہوتا ہے۔ ۵۸۳ء میں ہرش کا باپ پربھاکر وردھان تخت نشین ہوا اور اس کی حکومت ۶۰۵ء تک رہی۔ اس کے دَور میں اس خاندان کی سلطنت میں خاصی وسعت ہوئی۔ اس کے باپ

دادا صرف مہاراج کہلاتے تھے مگر اس نے مہاراج ادھیراج کا لقب اختیار کیا۔ بان نے اپنی کتاب ہرش چرتر میں پربھاکر کی بہت تعریف کی ہے۔ اسے شیر کے لقب سے وہ کئی بار پکارتا ہے۔ پنجاب پر سے ہن قوم کا اثر و رسوخ ہرش کے باپ نے ہی ختم کیا تھا۔

ہرش وردھان نے شہزادگی کے زمانے میں ۶۰۴ء میں پنجاب پر حملہ کر کے ہن قوم کی شکست دی۔ اس فتح میں اس کا دوسرا بھائی راجیا وردھان بھی شریک تھا۔ اس فتح کے موقعے پر انہیں اپنے باپ کی موت کی خبر ملی۔ دونوں بھائی واپس ہوئے۔ ابھی یہ غم تازہ ہی تھا کہ والیِ قنوج کو مالوہ کے حکمران نے قتل کر کے اس کی بیوی کو قید کر لیا، جو کہ ہرش کی بہن تھی۔ ہرش نے اپنی بہن راجیشری کو قید سے چھڑانے کے لئے بنگال کے راجا کی مدد سے مالوہ پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ اس حملے میں راجیا وردھان بھی شریک تھا۔ بنگال کے راجا نے اندر ہی اندر سے مالوہ کے حکمران سے ساز باز کر رکھی تھی، چنانچہ لڑائی کے دوران میں ہی اس کے اپنے آدمی کے ہاتھوں راجیا وردھیان کو قتل کروا دیا۔ یہ غم بھی ہرش کے لئے کم نہ تھا۔ ۶۰۶ء میں اس کی عمر ۱۶ سال تھی کہ وہ تخت نشین ہوا۔ اس نے ان دکھوں کو دھونے کے لئے دشمنوں سے بدلہ لینے کے لئے ٹھان لی۔ وہ ۷۰ ہزار فوج کے ساتھ مسلسل پانچ سال تک جنگ کرتا رہا، اور اپنے دشمنوں کو نیچا دکھا کر دم لیا۔ اسی دوران میں اس نے اپنی گمشدہ بہن کو بھی تلاش کر لیا۔ اور قنوج کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اسے ہی اپنا دارالحکومت بنایا۔

ہرش کا نظامِ سلطنت شخصی تھا۔ وہ ایک مطلق العنان حکمران تھا۔ انتظامیہ، فوج اور عدل وانصاف کا سربراہ بھی وہ خود ہی تھا۔ اشوک کی طرح وہ بھی عوام سے ملتا جلتا رہتا، اس کام کے لئے اس نے جاسوسوں سے کام نہیں لیا بلکہ اس محکمے کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ سلطنت کی وسعت کے پیشِ نظر مرکز کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ صوبائی مرکزوں کو بھی خاص خودمختاری حاصل تھی اور وہ اچھے بھلے مرکز کی طرح ہی مضبوط تھے۔ ہرش نہایت ہی سخی تھا۔ اس نے بہت سے ادارے کھول رکھے تھے، جو مسافروں، غریبوں اور یتیموں کی دیکھ بھال کے علاوہ بے روزگاروں کا خیال رکھتے تھے۔ بہت سی سزاؤں کا انتظام تھا۔

اس نے تقریباً چالیس سال تک حکومت کی اور ۶۴۸ء میں انتقال کیا۔ اس کی موت کے فوراً بعد ملک کا نظم ونسق ایک مرتبہ پھر اُبتر ہو گیا۔ اس کے ایک وزیر راجن نے تخت پر قبضہ کر لیا مگر کچھ عرصے بعد وہ بھی اپنی ہی ہنگامہ آرائی کا شکار ہو گیا۔

مسلمانوں کی آمد کے وقت برِ صغیر پاک و ہند کی حالت

عربوں کے حملے سے پہلے پاک و ہند کے حالات کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ سیاسی ۲۔ مذہبی اور ۳۔ سماجی۔

۱۔ سیاسی حالت

اس دور کا سب سے اہم سیاسی پہلو یہ تھا کہ ملک میں کوئی بھی مضبوط اور مرکزی حکومت نہیں تھی۔ راجپوتوں کی ریاستیں ہر وقت ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب، سندھ اور راجپوتانہ کو ان راجپوت حکمرانوں نے اپنی ہوس رانی کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ پرمار مالوہ خاندان کے ماتحت تھا۔ شمال میں قنوج اور بندھیل کھنڈ کی ریاستیں تھیں۔ وہ بھی ہر وقت معرکہ آرائی میں مصروف رہتیں۔ کشمیر، نیپال اور آسام کی ریاستیں بھی الگ الگ حکومتیں رکھتی تھیں۔ بہار اور بنگال دو حصوں میں تقسیم تھا۔ بہار پر پال خاندان اور بنگال پر سنیا خاندان کی حکومت تھی۔ اڑیسہ کیسری خاندان کے ماتحت تھا۔ اسی طرح گجرات، کاٹھیاوار میں بھی خود مختار ریاستیں تھیں۔ دکن میں پالوکیا خاندان حکمران تھا۔ ان تمام ریاستوں کی سرحدیں غیر متعین تھیں۔ اس وجہ سے اکثر جھگڑے کھڑے ہو جاتے تھے۔ موجودہ پاکستان کا علاقہ چار حصوں میں بٹا ہوا تھا:

۱۔ برہمن: یہ صوبہ بحیرۂ عرب سے لے کر دریائے سندھ تک تھا، کراچی کے قریب دیبل نامی شہر اس کا دارالحکومت تھا۔ یہاں کی حکومت راجا داھر کے ہاتھ میں تھی۔

۲۔ سیستان: یہ علاقہ سبی، مکران، قلات اور لس بیلا کے علاقوں پر مشتمل تھا۔

۳۔ اُچ: یہ بہاولپور کے تمام مغربی علاقے پر مشتمل تھا اور راجا داھر کے قبضے میں ہی تھا۔

۴۔ ملتان: یہ صوبہ سب سے وسیع تھا، جو ملتان سے لے کر کشمیر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں لاہور ڈویژن کے علاوہ مشرقی پنجاب کے اضلاع امرتسر، گورداسپور اور فیروز پور بھی شامل تھے۔ ملتان کے صوبے میں بقول ہیون سانگ کے موریا خاندان کے دور میں افغانستان کا علاقہ بھی شامل تھا۔ نویں صدی تک اس پر ایک کھتری راجا کی اولاد حکومت کرتی تھی۔ بعد ازاں کابل برہمنوں کی حکومت میں آ گیا۔

کشمیر کی ریاست درسبھا وردھن نے مضبوط سلطنت میں بدلی تھی۔ اس خاندان نے آٹھویں صدی عیسوی تک یہاں حکومت کی۔ ۷۴۲ء میں والیٔ کشمیر نے قنوج کے راجا کو شکست دے کر اسے بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

راجا ہرش کی موت کے بعد راجن قنوج پر قابض ہو گیا تھا۔ تبت اور نیپال کی فوج نے مل کر اس راجا کو شکست دی اور راجن کو گرفتار کر کے چینی حکومت کے حوالے کر دیا تھا۔ بنگال کی حکومت بھی راجا ہرش کے زیرِ اثر تھی۔ اس کی موت کے بعد گوپال نامی ایک شخص اس کا حکمران بن گیا جو ۷۵۰ء سے ۷۷۰ء تک بنگال پر حکمران رہا۔ بارہویں صدی عیسوی تک یہی خاندان بنگال پر حکمران رہا۔ بعد ازاں بختیار خلجی نے قطب الدین ایبک کے عہد میں اسے فتح کیا۔

موجودہ پاکستان کا جنوبی حصہ ہرش کی سلطنت میں شامل تھا۔ ہرش کی موت کے بعد ''سہرسن'' شودر نے سندھ پر قبضہ کر لیا اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ یہ بدھ مت کا پیروکار تھا، لیکن انتہائی درجے کا ظالم تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا سہائے سندھ کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے الور کو اپنا دار الحکومت بنایا۔ ملتان، برہمن آباد، اور سیستان کے علاوہ اُچ کا علاقہ بھی اس کے ماتحت تھا۔

راجا سہائے کی موت کے بعد اس کی بیوہ سے شادی کر کے اس کا وزیر ''چچ'' راجا بن بیٹھا۔ یہ اگرچہ بہت ہی مکار اور ظالم تھا مگر زیرک اور عالم بھی تھا۔ راجا سہائے کی

آخری عمر میں ملتان، سیستان اور اُچ میں آزادی کے لئے بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ اس نے انہیں ختم کر کے حکومت کو مضبوط بنالیا۔ راجا چچ ہندو مت کا پیرو تھا۔ اس کی رعایا کا تعلق جاٹوں اور لوہانا قبائل سے تھا، جو زیادہ تر بدھ مت کے پیروکار تھے۔ ہندو ہونے کی وجہ سے وہ اپنی رعایا کو ذلیل اور کمتر درجے کے انسان سمجھتا تھا کیونکہ وہ بدھ مت کو ماننے والے تھے، اس نے ان لوگوں کو تنگ کرنے کے لئے غلط قسم کے قوانین بنائے، مثلاً:

۱۔ جاٹوں اور لوہانا قبیلوں کے لئے یہ لازمی امر قرار دے دیا گیا کہ وہ ایک آدمی فی کنبہ راجا کے دربار میں یرغمال کے طور پر پیش کریں۔

۲۔ ان قبائل کے لوگوں کے لئے ریشمی لباس زیب تن کرنا ممنوع تھا۔ اگر کوئی شخص ریشم، ململ یا کسی بھی اعلیٰ کپڑے کا لباس پہن لیتا تو اسے اذیت ناک سزا دی جاتی۔

۳۔ ان قبیلوں کے لئے ہتھیار رکھنے کی بھی سختی سے ممانعت تھی۔

۴۔ گھوڑے پر سواری ممنوع تھی۔ البتہ ان قبیلوں کے سردار گھوڑے پر سوار ہو سکتے تھے، مگر زین نہ ڈالنے کی پابندی موجود تھی۔

۵۔ ان قبیلوں کو شناخت کرنے کے لئے ہر فرد کو اپنے ساتھ ایک ایک کتّا رکھنے کا حکم تھا۔

۶۔ جاٹوں اور لوہانا لوگوں کو ننگے پاؤں اور ننگے سر پھرنے کا حکم تھا، وہ نہ تو پاؤں میں جوتا پہن سکتے تھے اور نہ ہی سر پر پگڑی رکھ سکتے تھے۔ چوری چکاری ان کا اندرونی معاملہ تھا۔ اگر کوئی چور ثابت ہو جاتا، تو اس قبیلے کے سردار کو حکم تھا کہ اس کے گھر کے سارے افراد کو اس کے ساتھ زندہ جلا دیا جائے۔

۷۔ ان قبیلوں میں سے شاہی محلات کے لئے ملازم مہیا کئے جاتے۔ چوکیداری اور پہرہ داری کے ساتھ ساتھ راجا اور امراء کے لئے ایندھن فراہم کرنا بھی ان کا فرض تھا۔

ان احکامات نے ان لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ عربوں نے جب حملہ

کیا تو وہ بجائے اپنے راجا کی مدد کرنے کے، مسلمانوں کے حواری بن گئے اور انہیں آگے بڑھنے میں امداد فراہم کی۔

راجا چچ ۶۹۰ء میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد راجا چندر حکمران ہوا۔ یہ راجا بھی بدھ مت کا سخت دشمن تھا۔ اس نے راجا چچ کے مقابلے میں مذہبی اعتبار سے اور بھی سختی کی اور انہیں بزورِ تلوار مجبور کیا کہ وہ بدھ مت کو چھوڑ دیں اور ہندو مت کو اپنائیں۔ راجا چندر صرف سات سال حکمران رہ کر ۶۹۷ء میں مر گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا راجا داہر تخت نشین ہوا۔

۲۔ مذہبی حالت

سیاسی رقابت کی وجہ سے مذہبی حالت بھی ویسی ہی تھی۔ اس وقت کے عام لوگوں میں تین مذاہب یعنی بدھ مت، جین مت اور ہندو مت کے پیرو موجود تھے۔ یہ تینوں مذاہب اور ان کے مذہبی رہنما ایک دوسرے کو ختم کرنے پر ہر وقت تلے رہتے تھے۔ ہندو مت پر صدیوں سے گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں، جنہیں اتارنے کی وہ پرزور کوشش کر رہا تھا۔ بدھ مت اپنی انتہا پر پہنچنے کے بعد اب زوال کی طرف جا رہا تھا۔ جین مت شروع ہی سے سب سے کمتر حیثیت رکھتا تھا اور گمنامی میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن مسلمانوں کی آمد کے وقت اس کا نام تک بھی کم ہی سُنا جاتا تھا۔

ان مذاہب کے زوال پذیر ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان میں فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ دسویں صدی عیسوی میں یہاں آنے والے ایک عرب سیاح کے مطابق اس وقت ۴۲ مذہبی فرقے موجود تھے۔ بدھ مت جو اشوک، کنشک اور ہرش جیسے راجاؤں کے سائے تلے برصغیر اور بیرونِ ملک پھیل چکا تھا۔ اَب اس کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ یہ مذہب اپنا وقار اگر کہیں بحال رکھ سکا تو وہ بس بہار اور بنگال کا علاقہ تھا۔ باقی علاقوں میں ہندو مت ترقی کر رہا تھا۔ اس میں اب بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ بدھ مت کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لئے ہندو مت کے راہنماؤں نے اس کے بہت سے اصول اور

نظریے ہندومت میں شامل کر لئے تھے، اور گوتم بدھ کو بھی ہندومت کا ہی ایک اوتار بنا لیا تھا اور اُسے رام اور کرشن کا درجہ دے دیا تھا۔ یہ مذہبی دوڑ سیاست کی سطح پر بھی جاری تھی۔ ہر مذہب اور مذہبی فرقہ یہی کوشش کرتا تھا کہ اس کا مذہب ہندوستان کی زیادہ سے زیادہ ریاستوں کے حکمرانوں کی سرپرستی حاصل کرے۔ ادھر راجاؤں کا بھی یہی حال تھا کہ وہ بھی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے مذہبی رسومات پر زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ اس طرح باہمی چپقلش روز بروز ترقی کرتی رہی اور بسا اوقات اسی وجہ سے جنگ چھڑ جاتی۔

۳۔ سماجی حالت

ان حالات میں کسی قسم کے تمدّن یا معاشرے کو فروغ حاصل ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہندو سماج معاشرتی لحاظ سے زوال کی طرف مائل تھا۔ خارجی حملوں اور داخلی شورشوں نے اس کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی تھی۔ ابتداء میں ہندو معاشرہ چار طبقوں پر مشتمل تھا۔ ان میں برہمن کی ذات سب سے عظیم اور مقدس ہوتی تھی، لیکن جب جین مت اور بدھ مت نے برہمن کے تقدس کو للکارا تو اس کے ردِعمل میں اس نے ذات پات کے اِس جنگلے کو اور بھی مضبوط کرنا شروع کر دیا، لیکن جب بیرونی حملوں کا تانتا بندھ گیا، تو اُسے ان چار ذاتوں کے علاوہ اور ذاتوں کے لئے بھی اپنے دروازے کھولنے پڑے تاکہ نئے آنیوالے اگر ہندو مذہب میں شامل ہونا چاہیں تو ہو سکیں۔ اس طرح مسلمانوں کے حملے کے وقت ہندومت میں ہزاروں کی تعداد میں ذاتیں موجود تھیں۔

اس وقت تعلیمی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ صدہا سال کی خانہ جنگی نے حکمرانوں کو کبھی یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ وہ عوام کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دے سکیں۔ تعلیم کے فقدان کی وجہ سے ہزاروں قسم کے توہمات ان میں جنم لے چکے تھے۔ ہندوؤں کی قدیم علمی و ادبی روایات دم توڑ چکی تھیں اور اب صرف ایک مغرور ڈھانچا رہ گیا تھا۔ ہندو علماء کسی دوسری قسم یا ذات کے مرد کو تعلیم دینے میں بخل سے کام لیتے تھے۔

البیرونی کے مطابق دوسری قوموں کا علم سے مالا مال ہونا بھی ان کے ہاں ایک عظیم خامی تصور کی جاتی تھی۔ ویدک زمانے میں عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کھڑا کیا جاتا تھا، لیکن اب اس کی قدر و منزلت میں بڑا فرق آچکا تھا۔ اُنہیں پہلے کی طرح عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ وہ اپنا وقار کھو چکی تھی۔ منو کے اخلاقی درس نے اسے معاشرتے میں نچلے مقام پر لا رکھا تھا۔ عورت کو وید پڑھنے کی اجازت نہ تھی اور نہ ہی وہ مذہبی رسموں میں حصہ لے سکتی تھی۔ ستی کا رواج عام ہو چکا تھا۔ اس طرح برہمن اپنا کھویا ہوا وقار پھر سے حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ مرد کئی شادیاں کر سکتا تھا۔ مگر عورت کو بیوہ رہ کر زندہ رہنے کا حق بھی حاصل نہیں تھا۔

راجپوتوں کا زمانہ

ہرش وردھن نے ۶۴۶ء میں وفات پائی۔ اس کی شخصیت کے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی برِ صغیر کی مضبوط اور مستحکم حکومت متزلزل ہونے لگی۔ شمالی حصے کا تو نقشہ ہی بدل گیا۔ چاروں طرف انتشار ہی انتشار نظر آنے لگا۔ ہرش کے جانشین چالیس برس تک سر توڑ کوشش کرتے رہے کہ امنِ عامہ بحال کر سکیں، مگر ممکن نہ ہو سکا۔ قنوج کی مرکزی حکومت اپنا آپ گنوا چکی تھی، اور سارے پاک و ہند کی نظریں اس کی پامالی پر لگی ہوئی تھیں۔ بہت سی ریاستیں خود مختار ہو گئیں۔ ان میں سے اکثر پر راجپوتوں کی حکمرانی تھی۔ یہ بارہویں صدی عیسوی تک نظر آتی ہیں۔ ہرش کے بعد کا پانچ سو سال کا زمانہ راجپوتوں کا زمانہ کہلاتا ہے۔ یہ لوگ بھی ہندو مذہب کے علمبردار تھے، اس لئے اس زمانے کو چنداں اہمیت حاصل نہیں ہے۔

راجپوتوں کے بہت سے خاندان تھے، لیکن پنجاب کے کچھ حصے پر حکومت کرنے والا چوہان خاندان تھا۔ ۸۵۰ء کے قریب راجا وگ راہار یا چوہان نے دہلی کو فتح کر لیا۔ اس کا سب سے اہم حکمران ـــــ پرتھوی راج گزرا ہے۔ جس کی حکومت کے آثار ملتان تک ملتے ہیں۔

مُسلمانوں کی آمد

عرب اور ہند کے تعلقات

اسلام کے ظہور سے قبل بھی عرب برصغیر پاک و ہند سے واقف تھے۔ عرب تاجر بہت عرصہ قبل ہندوستان کے ساحلوں تک آئے اور یہاں کی اشیاء کو مصر و شام کے راستے یورپ تک لے جاتے تھے، اور وہاں کے سامان کو ہندوستان جزائر ہند، چین اور جاپان تک لے آتے تھے۔ اور شام کے شہروں سے نکل کر خشکی کے راستے بحرِ احمر کے کنارے کنارے حجاز کو طے کر کے یمن تک آتے تھے اور وہاں سے بادبانی کشتیوں میں سوار ہو کر کچھ افریقہ اور حبشہ کی طرف نکل جاتے اور کچھ وہیں سے سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ بلوچستان یا سندھ کا رُخ کر لیتے، پھر یہیں ان کا سفر ختم نہ ہو جاتا بلکہ وہ اور آگے بڑھتے۔ گجرات اور کاٹھیاوار کی بندرگاہوں تھانہ، کھمبایت سے ہوتے ہوئے سمندر، کالی کٹ اور راس کماری تک جا پہنچتے۔ کبھی مدراس میں آ ٹھہرتے تھے اور کبھی سراندیپ، انڈیمان سے ہو کر سیدھے مدراس کی مختلف بندرگاہوں کا چکر لگا کر خلیج بنگال میں داخل ہو جاتے تھے۔ بنگال کی بندرگاہوں میں بیوپار کرنے کے بعد برما، سیام اور چین کا رخ کر لیتے تھے اور پھر اسی راستے وہ لوٹ جاتے تھے۔

اسلام کے ظہور سے پیشتر ہی کچھ عرب تاجر مالا بار اور سراندیپ اور مالدیپ کے جزیروں میں آباد ہو چکے تھے۔ اسلام کے ظہور کے بعد عرب تاجروں کے قافلے کثرت سے اس طرف آنے لگے اور جنوبی ہند میں انہوں نے اپنی تجارتی حیثیت نمایاں کر لی تھی۔ مسلمانوں کی کاروباری دیانت داری اور اخلاقی انداز اس قدر بلند تھے کہ جن کی بدولت انہوں نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا۔ ان کی تجارت سے مقامی لوگ اور راجا خوشحال ہو گئے۔ اس لئے ان کی بڑی قدر کی جاتی۔ ان کے مال کو عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا،

جس سے ان کی ہمت افزائی بھی ہوتی۔ مذہبی لحاظ سے بھی وہ مکمل آزادی رکھتے تھے۔ اسلام کی تبلیغ سے انہیں روکا نہیں جاتا تھا، اور نہ ہی کسی قسم کی پابندی ان پر عائد کی جاتی۔ جب عربوں کا مقام برصغیر میں ایک مانی ہوئی حقیقت بن گیا تو سیاسی لحاظ سے یہاں کے راجاؤں نے ان سے مختلف قسم کے معاہدے کیے۔

برِصغیر پر حملے

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں فتوحات کا سلسلہ پاک و ہند کی سرحدوں سے پرے آ کر رک گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بحری مہموں کو مسلمان مجاہدوں کے لئے خطرناک اور کم محفوظ تصور کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے برصغیر کے علاقے میں کسی بھی بحری مہم کو بھیجنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ جب ان کی اجازت کے بغیر ہی بحرین کے حاکم عثمان ثقفی نے بمبئی کے قریب تھانہ پر کامیاب حملہ کیا تو اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ناپسند فرمایا تھا، اور اس کی جواب طلبی فرمائی۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں حاکم بن جبالہ کو ہندوستان کی سرحدوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لئے بھیجا گیا، جنہوں نے بڑی ہی دلچسپ رپورٹ مرتب کی۔ انہوں نے لکھا کہ یہاں پر پانی نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں کے پھل بے حد کھٹے ہیں۔ بحری لٹیرے انتہائی دلیر اور نڈر ہیں۔ قلیل فوج کے ضائع ہو جانے کا احتمال ہے اور بڑی فوج کے بھوکوں مر جانے کا ڈر ہے۔ اس رپورٹ کے پیشِ نظر سرکاری طور پر کوئی مہم نہ روانہ کی گئی۔ البتہ عہدِ عثمانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ایرانی مجوسیوں سے تنگ آ کر عربوں نے درّہ بولان کے قریب ''کیکان'' کے مقام پر ۶۵۹ء میں حملہ کیا، اس کی کمان حارث رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ معرکہ فتح پر ختم ہوا، لیکن اس میں حضرت حارث رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔

اس کے بعد کچھ دیر تک تو سرحدوں پر امن و امان رہا، لیکن جلد ہی ہندوؤں کی جانب سے سرحدوں پر پھر سے حملہ شروع ہو گئے۔ اس پر مہلب بن صفرہ نے ۶۶۴ء میں

بھرپور حملہ کر کے کامیابی حاصل کی۔ اس لڑائی میں پنجابی اور سندھی جاٹوں کا بہت جانی نقصان ہوا۔ اس کے بعد عبداللہ نامی جرنیل نے پاک و ہند کی سرحد کے ایک گاؤں پر حملہ کیا۔ یہ حملہ ناکام رہا۔ اس میں عبداللہ خود بھی زخمی ہوئے اور پھر زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔

محمد بن قاسم کے حملے کی وجوہات

ان دنوں برصغیر پاک و ہند کے سندھ کے علاقے پر راجا چچ کی اولاد حکمران تھی۔ یہ لوگ ہندومت کے پیروکار تھے۔ اگرچہ عوام بدھ مت کے پیروکار تھے، مگر رفتہ رفتہ ہندو مذہب زور پکڑتا گیا۔ چچ خود راجا سہائے کا وزیر تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس نے تخت پر قبضہ کر لیا تھا اور نہایت ہی عمدگی سے چالیس سال تک حکمرانی کر گیا۔ ملتان سے بحیرہ عرب تک کا سارا علاقہ اس کی سلطنت میں شامل ہو چکا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بھائی چندر تخت نشین ہوا۔ چندر کے بعد چچ کا بیٹا داہر گدی نشین ہوا۔ راجا داہر ہی کے زمانے میں سندھ پر عربوں کا حملہ ہوتا ہے۔ جس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ۷۰۳ء میں علافی قبیلہ کے کچھ لوگ مکران کے گورنر کو قتل کر کے بھاگ گئے۔ مسلمانوں نے جب ان کا پیچھا کیا، تو وہ سندھ میں داخل ہو گئے اور راجا داہر سے پناہ مانگی، جس نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔

۲۔ جزائر شرق الہند سے مسلمانوں کا ایک جہاز، جس میں کچھ تاجروں کے اہل و عیال، مال و اسباب، کچھ یتیم بچے اور بچیاں شامل تھیں۔ وطن واپس جا رہے تھے۔ ان کے علاوہ اس جہاز میں کچھ حاجی بھی سوار تھے۔ جونہی جہاز سندھ کے ساحل کے قریب پہنچا، تو اسے لوٹ لیا گیا۔ اگرچہ کچھ مورخین تو صرف بحری قزاقوں کا نام لیتے ہیں، لیکن زیادہ تر مورخ راجا داہر کو قزاق ٹھہراتے ہیں کہ اسی نے اس جہاز کو لوٹنے کا حکم دیا تھا۔ یہ بات اس لئے بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اس جہاز میں سراندیپ کے راجا نے بہت سے قیمتی تحائف حجاج بن یوسف کو

بھیجے تھے، جو اس وقت حاکمِ عراق تھا۔ سراندیپ (موجودہ لنکا) کا راجا مسلمان ہو چکا تھا اور یہ بات بھی داہر کے علم میں تھی۔ راجا کو اس بات کا بھی علم تھا کہ اس جہاز میں بے شمار قیمتی تحائف بھی جا رہے ہیں، اس لئے یہ جہاز راجا داہر کے اشارے پر ہی راجا کے ایک ساحلی حاکم نے لوٹا تھا۔ ایک روایت کے مطابق کچھ زخمی بچ کر حجاج بن یوسف تک پہنچنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔

۳۔ لٹیروں نے اس جہاز کے مسافروں، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے برہمن آباد کے مضبوط قلعے میں قید کر دیا تھا۔

۴۔ ایک دوسری روایت کے مطابق عربوں کا ایک تجارتی وفد پاک و ہند میں خلیفہ کی طرف سے تجارتی منڈیوں کا جائزہ لینے کے لئے روانہ کیا گیا تھا۔ جب وہ تجارتی وفد دیبل کی بندرگاہ کے قریب پہنچا، تو سندھی قزاقوں نے جہاز کا سارا سامان لوٹ لیا اور تاجروں کو شہید کر دیا۔ جب یہ اطلاع خلیفہ کو پہنچی، تو انہوں نے راجا داہر سے وضاحت طلب کی اور کہا کہ وہ بحری قزاقوں کو عرب حکومت کے حوالے کر دے اور لوٹا ہوا سرکاری تجارتی مال واپس لوٹا دے، جس کے جواب میں راجا داہر نے کہا کہ قزاقوں پر اس کا زور نہیں چلتا، اس لئے مال و اسباب کے لوٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۵۔ ایرانی مجوسی اور کاہن ہند کے راجاؤں کو عرب مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے سرحدوں پر انتشار سا رہتا اور کئی سرحدی جھڑپیں بھی ہو چکی تھیں۔

۶۔ اور ایک روایت کے مطابق ایک مسلمان تاجر کی بیوہ یا بیٹی نے جو برہمن آباد کے قید خانے میں تھی، حجاج کے نام اپنے خون سے خط لکھا اور امید ظاہر کی تھی کہ حجاج بن یوسف کی رگوں میں دوڑنے والا خون صرف عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ہی قتل نہیں کر سکتا بلکہ تلافی کے لئے مسلمانوں کی بجائے مسلمانوں کے دشمنوں کی شہ رگ تک بھی پہنچنا جانتا ہے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکا تو ہم یہ سوچیں

گے کہ حجاج بن یوسف کی غیرت مر چکی ہے۔ اس لئے کسی غیور حاکم کے انتظار میں ہم جی لیں گے۔

سندھ پر حملہ

حجاج بن یوسف نے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے برصغیر پر فوج کشی کی اجازت مانگی۔ ولید نے علاقے کی دُوری اور راستے کی تکالیف کے پیشِ نظر اجازت دینے سے انکار کر دیا، لیکن حجاج چونکہ اس کا معتمدِ خاص تھا، اس لئے اس کی اصرار کے آگے اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ حجاج نے ولید کو یقین دلا دیا تھا کہ اس مہم پر خزانہ خلافت سے جو کچھ بھی خرچ اُٹھے گا، وہ اس سے دُگنا اس مہم سے فراغت کے بعد خزانے میں جمع کروائے گا۔ اس نے دو مہمیں پے در پے بھیجیں مگر وہ ناکام رہیں، جس سے حجاج بن یوسف کے غصّے کی انتہا نہ رہی لہذا اب حملے کیلئے اس نے اپنے جواں سال چچیرے بھائی اور داماد محمد بن قاسم کا انتخاب کیا۔ عمادالدّین محمد بن قاسم کی عمر اس وقت سترہ سال تھی۔ اس کم عمری کے باوجود اس کی عسکری فہم و فراست تسلیم شدہ تھی۔ انتظامی لحاظ سے وہ فارس کے گورنر کی حیثیت سے اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ پہلی مہموں کی ناکامی کے پیشِ نظر حجاج نے اس دفعہ تمام انتظام اچھی طرح سے مکمل کئے تھے۔ اسلامی لشکر کو بڑے سے بڑے ہتھیار منجنیق سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ہتھیار سے لیس کر دیا گیا تھا۔ حجاج نے سابقہ مہموں کی کمزوریوں کو دور کرنے اور طویل راستے کے پیشِ نظر اسلامی لشکر کو تمام ضروری سامان فراہم کیا۔

محمد بن قاسم کے حملے کے بارے میں اِس کی فوج کی گنتی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ مورخین کی رائے میں اس کے ساتھ چھ ہزار گھوڑ سوار، چھ ہزار شتر سوار اور تین ہزار بار برداری کے جانور تھے۔ لیکن اکثریت کی رائے میں اس کے ہمراہ صرف چھ ہزار سوار تھے۔ عراق سے پاک وہند کے علاقے تک پہنچنے کے لئے راستے کی دشواریوں کو خصوصاً پیشِ نظر رکھا گیا۔ حجاج کو علم تھا کہ راستے میں پانی نایاب ہے یا کم یاب ہے۔ لہذا اس نے منوں روئی کو سرکے میں بھگو کر خشک کروایا اور سپاہیوں میں بانٹا تاکہ پیاس کے

وقت وہ روئی کا پھاہا تھوڑے سے پانی میں بھگو کر منہ میں رکھ لیں۔اس طرح پانی بھی کم خرچ ہوگا اور پیاس کی شدت بھی کم ہو جائے گی۔ راستے میں یعنی عراق سے مکران تک کے علاقے میں اس نے شتر سوار چوکیاں قائم کر دیں جن کا سلسلہ کوفے سے شروع ہوتا تھا اور سندھ کے علاقے تک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شتر سوار تیار موجود تھے، جس کے نتیجے میں سندھ سے کوفے تک صرف تین دن میں پیغام پہنچ جاتا تھا۔ الغرض اسلامی لشکر ۷۱۲ء میں مکران کے راستے سے دیبل پہنچ گیا۔اس کے علاوہ جنگی سامان اور منجنیقیں بحری راستے سے پہنچائی گئیں۔

جب یہ لشکر مکران پہنچا تو مکران کے گورنر محمد ہارون نے مزید امداد کے طور پر پانچ منجنیقیں بھی محمد بن قاسم کے حوالے کر دیں۔

فتح دیبل

جب محمد بن قاسم مکران اور ار مابیل سے ہوتا ہوا دیبل پہنچا تو ساتھ ہی ساحل پر عربوں کا وہ بیڑا بھی آ لگا جس پر سامانِ رسد اور منجنیقیں سوار تھیں۔ دیبل راجا داہر کا دارالحکومت تھا۔شہر میں ایک مضبوط قلعہ تھا۔اس قلعے کے اندر مستطیل شکل کا ایک مندر تھا جو عظیم الشان تھا۔ اس کے چاروں طرف راہبوں کے لئے کمرے بنے ہوئے تھے۔ عمارت کے وسط میں ایک گہرا اور وسیع تالاب تھا۔

بدھ مت کے زوال کے بعد برہمنوں نے اسی مندر کو اپنے عقیدے کے مطابق درجہ دے دیا تھا،لیکن عربوں کے بیان کے مطابق وہ مندر عبادت گاہ کم اور قلعے کی حیثیت زیادہ رکھتا تھا۔اس مندر کی حفاظت اور نگرانی کے لئے بہت سی فوج متعین تھی۔مندر کے کلس پر راجا داہر کا جوگیئے رنگ کا جھنڈا ہر وقت لہراتا تھا۔سندھی برہمنوں کا عقیدہ تھا کہ جب تک مندر کے کلس پر لگا ہوا یہ جھنڈا لہرا رہا ہے اس وقت تک کوئی طاقت شہر کو فتح نہیں کر سکتی۔ برہمنوں نے اپنے عقیدے کے مطابق اس پر بہت سے جادو اور منتر بھی کئے ہوئے تھے۔مسلمانوں نے اس مندر کی اہمیت کو جان لیا تھا۔ یہ راز ایک سندھی برہمن نے محمد بن قاسم کو بتایا تھا، جو ایک قیدی کی حیثیت سے اس کے پاس تھا۔محمد بن قاسم نے منجنیق کے

افسر جعویہ کو کلس کا نشانہ بنانے کے لئے کہا۔ جعویہ کا پہلا نشانہ ہی درست لگا اور کلس جھنڈے سمیت نیچے آ گرا، جس سے برہمنوں اور شہریوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس کے چند روز ہی بعد یہ طویل محاصرہ فتح کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔

برصغیر میں یہ اسلام کی پہلی فتح تھی۔ اگرچہ دیبل کے رہنے والوں کے ساتھ بھی خاصہ سخت روّیہ اختیار کیا گیا اور مسلمان قیدی عورتیں اور بچے رہا کروا لئے گئے۔ ان قیدیوں کے محافظ نے جس کا نام قبلہ تھا، اسلام قبول کر لیا۔ اس کی نیکی اور حسنِ سلوک کی گواہی مسلمان قیدیوں نے بھی دی۔ اس وجہ سے محمد بن قاسم نے اسی کو دیبل میں اپنا نائب مقرر کیا۔ ایک اور روایت کے مطابق راجا داہر کے وزیر اعظم ساگر نے محمد بن قاسم کو قیدیوں سے متعلق خفیہ اطلاعات فراہم کی تھیں۔ وہ بہت ہی دُور بین اور زیرک انسان تھا۔ اس نے ایک تو مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کو دیکھ لیا تھا۔ دوسرے وہ ان کے حسنِ اخلاق سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لہذا اس نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی اور محصور مسلمان عورتوں، بچوں اور جہاز کے عملے کے لوگوں کو ساتھ لے کر محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور اسلام لے آیا۔ محمد بن قاسم وزیر کے سلوک سے متاثر ہوا اور اسے اپنا معتمد خاص مقرر کر لیا۔ اِس طرح وہ قیدی رہا ہو گئے جو کہ اِس حملے کا سب سے اہم اور بنیادی سبب بنے تھے۔

مؤرخین میں یہ خیال متفق علیہ ہے کہ راجا داہر اگر صلح یا مفاہمت کی کوشش کرتا اور تاوانِ جنگ وغیرہ ادا کرنے کا وعدہ کر لیتا تو عرب مسلمان اپنے قیدی واپس لینے کے بعد لوٹ جاتے۔ کیونکہ عربوں کے دو ہی مقصد تھے۔ ایک تو ان جہاز کے قیدیوں اور تجارتی مال کی واپسی اور دوسرے راجا داہر کے غرور کو خاک میں ملانا۔ ان کے یہ دونوں مقصد پورے ہو چکے تھے، لیکن راجا داہر کو اب بھی عقل نہ آئی تھی اور اس نے محمد بن قاسم کو ایک انتہائی گستاخانہ خط بھجوایا جس میں عرب مسلمانوں کو خبردار کیا گیا تھا کہ اب وہ آگے بڑھنے کی جراٗت نہ کریں، ورنہ ان میں سے ایک بھی زندہ بچ کر واپس نہیں جا سکے گا۔ اس خط کو پڑھ کر محمد بن قاسم نے ایک طرف تو راجا داہر کو تنبیہی جواب لکھ بھیجا، دوسرے حجاج کو

آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں مشورے کے لئے خط لکھا اور یہ بھی لکھا کہ دیبل سرنگوں ہو چکا ہے۔ راجا داہر کے بھتیجے اور بہت سے دیگر سرداروں کو آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ جو لوگ مسلمانوں کے راستے میں رکاوٹ بنے تھے یا بن سکتے تھے انہیں قتل کر دیا گیا ہے۔ دیبل شہر میں ایک مسجد تعمیر کروا دی گئی ہے اور خلیفہ کے نام کا خطبہ جاری کروا دیا گیا ہے۔ اس سرزمین پر اب پانچوں وقت اللہ کی عظمت اور وحدت کی آواز کانوں تک پہنچتی ہے۔ پانچ وقت باجماعت نماز ہوتی ہے، جو ہندوؤں کو ایک اللہ کے حضور جھکنے کی طرف مائل کرتی ہے۔ اس خط کے جواب میں حجاج نے محمد بن قاسم کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

نیرون کی فتح

دیبل کی فتح کے بعد مسلمانوں کی نظر اصولی طور پر اس مقام پر پڑنی چاہیے تھی، جہاں راجا داہر رہتا تھا۔ چونکہ راجا داہر شکست کے بعد اب الور کے حلقہ میں پناہ گزین تھا۔ نیرون میں اس کا بیٹا جے سنگھ حکمران تھا۔ اس کے پاس ایک کثیر فوج تھی۔ نیرون کی ساری آبادی بدھ مت کی پیرو تھی۔ نیرون کے لوگوں نے جے سنگھ اور راجا داہر کو اطلاع دیئے بغیر ایک وفد حجاج بن یوسف کے پاس بھیج دیا۔ جو وہاں سے اپنی حفاظت کے احکامات لے آیا۔ محمد بن قاسم نے جب نیرون کی طرف پیش قدمی کی تو جے سنگھ اپنی ساری فوج لے کر فرار ہو گیا اور اپنے باپ راجا داہر کے پاس الور میں جا پہنچا۔ ادھر بدھ راہبوں نے باہر نکل کر محمد بن قاسم کی فوج کا استقبال کیا اور اطاعت گزاری کی درخواست کے ساتھ حجاج بن یوسف کا حکم نامہ دکھا کر اپنے لئے امان طلب کی۔ نیرون کا قائم مقام حاکم خود تحفے تحائف لے کر محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ محمد بن قاسم نے اپنا ایک افسر قلعہ نیرون میں متعین کیا اور خود سیستان کی طرف روانہ ہو گیا۔

سیستان کی فتح

چند روز قلعہ نیرون میں ستانے اور مزید جنگوں کی تیاری کرنے کے بعد

مسلمان لشکر سہوان یعنی سیستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ سیستان کے قلعے پر راجا داہر کا بھتیجا حکمران تھا۔ اس شہر کے لوگ بھی بدھ مت کے ماننے والے تھے، اور جنگ وجدال سے پرہیز کرتے تھے۔ بچھیرا نے نہ لڑنے کا ارادہ کیا اور اس ارادے سے محمد بن قاسم کو آگاہ کر دیا کہ ہمارے عقیدے میں قتل وغارت سب سے بڑا گناہ ہے اور ہمیں یہ بھی علم ہے کہ حملہ آوروں کے لئے حجاج کا یہ بھی حکم ہے کہ جو امان مانگے اسے اپنی پناہ میں لے لیا جائے۔ بعض مورخین یہ ساری بات بدھ عوام کی طرف سے بتاتے ہیں اور یہ کہ بچھیرا نہ مانا اور جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ محمد بن قاسم کو مخبروں نے اطلاع دی کہ سیستان کے لوگ جنگ کے بارے میں متفق نہیں ہیں اور شہر کے لوگوں نے بھی محمد بن قاسم کو کہلوا بھیجا تھا کہ ہم لڑنے کے حق میں نہیں ہیں۔ بچھیرا نے جب یہ حالات دیکھے تو ایک رات قلعے سے نکل بھاگا اور شہر بغیر لڑائی کے مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ ہندو مؤرخین سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ سیستان کی فتح کے وقت مسلمانوں نے ایک قطرہ بھی خون کا نہیں بہایا بلکہ تمام شہریوں کو امان دے دی۔ مسلمانوں کے اس حسنِ سلوک نے برصغیر کے لوگوں کو مسلمانوں کے حق میں فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ جوق در جوق اسلام کی طرف رجوع کرنے لگے۔

اس جگہ سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال کے لئے حجاج بن یوسف کو روانہ کر دیا گیا اور باقی مجاہدوں میں تقسیم کیا گیا۔ سیستان کی فتح کے بعد محمد بن قاسم اپنے لشکر کو ساتھ لے کر واپس نیرون آ گیا۔ نیرون واپس آنے سے پہلے محمد بن قاسم نے سیسم کو فتح کرنا ضروری سمجھا۔ سیسم کے حاکم کاکوتک نے معمولی سی مزاحمت کی اور پھر خود ہی محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ محمد بن قاسم نے اس کے ساتھ انتہائی دوستانہ سلوک کیا اور جامہ و دستار سے نوازا۔ اسی فتح کے بعد حجاج کا حکم آ گیا کہ نیرون واپس آ کر دریائے سندھ کو عبور کر کے راجا داہر پر حملہ کیا جائے۔

جنگِ جہم

دریائے سندھ کے تمام مغربی علاقوں پر جب مسلمان عربوں کا قبضہ ہو گیا، تو

انہوں نے دریائے سندھ کو عبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ راجا داہر ابھی تک بذاتِ خود ـــــ مسلمانوں کے مقابلے پر نہیں آیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ عرب لوٹ کھسوٹ کے لئے آئے ہیں ان کا شکم مغربی علاقے کی لوٹ کھسوٹ سے بھر جائے گا، تو وہ واپس چلے جائیں گے۔ دریا کے عبور کرنے کے بارے میں وہ پرامید تھا کہ وہ اِس پار آنے کے جرأت کبھی نہیں کریں گے۔ اپنے اس مفروضے کے پیشِ نظر اس نے مدافعت کے لئے کوئی تیاری نہ کی۔

برصغیر کے دریاؤں میں دریائے سندھ مغربی علاقے کا سب سے بڑا دریا ہے۔ اس کا پاٹ وادیٔ سندھ کے زیریں علاقے میں کافی کشادہ ہو جاتا ہے۔ اس دریا سے متعدد نہریں نکالنے کے باوجود برسات کے مہینے میں جہاز رانی ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت اس کا پانی کناروں سے باہر نہیں نکلتا تھا اس لئے اس کا بہاؤ بھی تیز تھا اور گہرائی بھی کافی تھی۔ اگر دشمن دریا کے دوسرے کنارے پر اپنے تمام وسائل بروئے کار لا کر بھی کھڑا ہو، تو پھر بھی دریا کو عبور کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔

دریا کے مشرقی کنارے پر راجا داہر اپنے بیٹے اور پورے لاؤ لشکر کے ساتھ تیار کھڑا تھا اور مغربی کنارے پر لشکرِ اسلام تھا جس کی حالت راجا داہر کے لشکر کے مقابلے میں خاصی خراب تھی۔ لشکرِ اسلام میں خوراک کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ دوسرے ایک وبائی بیماری بھی پھوٹ نکلی، جس سے ہزاروں جانور اور سینکڑوں سپاہی موت کی نیند سو گئے۔ اس طرح محمد بن قاسم کی فوج کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن اسلامی لشکر کے حوصلے قابل صد رشک تھے۔ محمد بن قاسم کے سپاہی باوجودیکہ وطن سے ہزاروں میل دُور اور وبائی مرض مُں مبتلا تھے۔ ادھر ایک طاقتور اور منظم دشمن سے واسطہ بھی تھا، لیکن پھر بھی ان کے حوصلے بہت بلند تھے۔ ابھی دریا عبور کرنے کا مرحلہ طے نہیں ہوا تھا کہ کوفے سے دو ہزار تازہ دم شہسوار مدد کے لئے آ گئے، جس سے ان کے حوصلے اور عزم میں اور پختگی پیدا ہو گئی۔ اب دریا عبور کرنے کے لئے پل درکار تھا۔ چنانچہ کشتیوں کی ضرورت محسوس ہوتے ہی کشتیاں بنانا شروع کر دی گئیں۔ جس عجلت سے پل اور پل کے لئے کشتیاں تیار کی گئیں وہ بجائے

خود ایک معجزے سے کم نہیں تھا۔
راجا داہر کے بیٹے راجا جے سنگھ کی سخت مزاحمت کے باوجود مسلمانوں نے بڑی تیزی سے دریا کو عبور کر لیا۔ جب پورا لشکر دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر اتر گیا۔ تو محمد بن قاسم نے بھرپور حملے کا حکم دے دیا۔ راجا داہر اور جے سنگھ مسلمانوں کی برق رفتاری، مستعدی، جوشِ جہاد اور اولوالعزمی کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ محمد بن قاسم کا لشکر راجا داہر کی فوجوں کو دریائے سندھ کے کنارے سے دھکیلتا ہوا جھم کے میدان میں لے گیا۔

ایک اور روایت کے مطابق راجا داہر خود ہی پیچھے ہٹتا ہوا اس میدان میں پہنچ گیا تھا۔ راجا داہر کی فوج پانچ ہزار سواروں، بیس ہزار پیادہ سپاہیوں اور ایک سو جنگلی ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ راجا داہر کی فوج کی بہت بڑی تعداد بکتر بند تھی۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے لشکر کی تعداد صرف پندرہ ہزار تھی۔ اِن پندرہ ہزار میں وہ مقامی لوگ بھی تھے، جو کہ محمد بن قاسم اور اس کے لشکریوں کے اخلاق سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنی خدمات داہر کے خلاف جنگ کے لئے پیش کر دی تھیں۔

راجا داہر نے صف بندی کرتے وقت پہلی صف میں ہاتھیوں کو لا کھڑا کیا۔ دوسری صف میں گھوڑ سوار اور تیسری میں پیادہ سپاہی مرتب تھے۔ راجا خود ایک سفید ہاتھی پر سوار تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا طریقِ جنگ مقامی لوگوں کے مقابلے میں مختلف اور بے حد اہم تھا۔ مسلمانوں نے پچکاریوں سے ہاتھیوں پر آتشگیر مادہ پھینکا۔ جس سے ہاتھی خوفزدہ ہو گئے اور جلن اور درد کے مارے وہ آگے بڑھنے کی بجائے واپس دوڑنے لگے۔ اس طرح انہوں نے اپنے ہی لشکر کو روندنا شروع کر دیا۔ اس بھگدڑ سے مسلمانوں کو جنگی فائدے حاصل ہوئے۔ انہوں نے تیروں اور نیزوں سے دشمن پر حملہ کر دیا۔ ادھر مسلمانوں نے اپنی عسکری پوزیشن اس طرح مرتب کی تھی کہ راجا داہر کو الور یا ملتان سے کسی قسم کی امداد نہیں مل سکتی تھی۔ اسی اثناء میں ایک عرب مجاہد نے راجا داہر کے ہاتھی پر آتش گیر مادہ چھڑکا دیا، جس سے ڈر کر ہاتھی دریا میں اتر گیا۔ جس کی بدولت داہر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا اور وہ قلعہ الور کی طرف بھاگ کر پناہ گزین ہو گیا۔

میدانِ جہم سے فرار ہونے بعد راجا داہر قلعہ الور میں محصور ہو گیا۔ وہیں اسے اطلاع ملی کہ اس کے بہترین جرنیل اور تمام عزیز و اقارب اِس جنگ میں قتل ہو چکے ہیں۔ ۱۷ جون ۷۱۲ء کو ایک مسلمان مجاہد کے ہاتھوں راجا داہر قتل ہو گیا۔ اس کے قتل کی خبر جب اس کی فوج کو ملی۔ تو وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کر قلعہ میں محصور ہو گئی۔ مسلمانوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، راجا داہر کا بیٹا جے سنگھ اپنی ماں کو پندرہ ہزار فوج کی کمان سونپ کر خود فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ مسلمانوں نے جلد ہی قلعہ فتح کر لیا۔ اس پر رانی نے دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر خودکشی کر لی۔

برہمن آباد کی فتح

حیدر آباد سے شمال مشرق کی جانب پچاس میل کے فاصلے پر یہ شہر آباد تھا۔ الور کے قلعے سے بھاگ کر راجا داہر کا بیٹا برہمن آباد کے قلعے میں آ کر محصور ہو گیا اور وہاں سندھی جاگیرداروں، زمینداروں اور سرداروں کی مدد سے اس نے ایک کثیر فوج تیار کی۔ اس طرح اس کے پاس چالیس ہزار فوج ہو گئی۔ مسلمانوں نے جب برہمن آباد پر حملہ کیا، تو راجا جے سنگھ خوراک کی فراہمی کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ چھ ماہ کے طویل محاصرے کے بعد یہ شہر بھی فتح ہو گیا۔ برہمن آباد کی جنگ غالباً سب سے بڑی جنگ تھی۔ اس میں تقریباً آٹھ ہزار سپاہی مارے گئے اور کچھ مؤرخوں کے نزدیک مرنے والوں کی تعداد بیس ہزار تک ہے۔ برہمن آباد کے قلعے سے راجا داہر کی دوسری بیوی لاڈی اور اس کی دو لڑکیاں مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوئیں۔ اس فتح کے بعد عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔

ملتان کی فتح

ملتان کی طرف پیش قدمی سے پہلے محمد بن قاسم نے راستے میں الور کے مقام کو فتح کرنا ضروری سمجھا۔ الور موجودہ روہڑی کے قریب واقع تھا۔ یہاں راجا داہر کا بیٹا گوپی حکمران تھا۔ اس نے عوام میں یہ مشہور کر دیا تھا کہ راجا داہر زندہ ہے اور وہ برصغیر

کے شمال مشرقی راجاؤں سے فوجی کمک کے سلسلے میں دورے کر رہا ہے۔ اس کے برعکس عربوں نے عوام کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ راجا داہر قتل ہو چکا ہے۔ جس سے عوام کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ ہندو فوج نے بھی جنگ سے مُنہ موڑ لیا تھا۔ اس حالت میں راجا گوپی بھاگ نکلا اور شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

شکست خوردہ سندھی جاگیردار اور فوجی جرنیل بھاگ بھاگ کر ملتان میں جمع ہو رہے تھے۔ برہمن آباد اور الوز کی فتح کے بعد موجودہ پاکستان کا تمام جنوبی علاقہ عرب مسلمانوں کے اقتدار میں آ چکا تھا۔ اس لئے ملتان بھگوڑوں کا گڑھ بن چکا تھا۔ محمد بن قاسم نے اپنے مشیروں اور فوجی جرنیلوں سے مشورہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ملتان اسلامی سلطنت اور اسلامی فوجی چھاؤنیوں کے لئے باعثِ مصیبت بنے گا۔ اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ دشمنوں کے اِس گڑھ کو فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا جائے۔ ملتان پر حملے کا فیصلہ متفقہ طور پر کیا گیا۔ ملتان تک راستے میں لوہانا اور جاٹ قبیلوں نے مسلمانوں کے لشکر کو بہت نقصان پہنچایا۔ طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ لیکن اس سے مسلمانوں کے حوصلے پست نہ ہوئے اور وہ ملتان کے دروازے پر دستک دیتے نظر آنے لگے۔

ملتان صنعتی و تجارتی مرکز ہونے کے علاوہ ایک مقدس مذہبی مقام بھی تھا۔ ملتان میں سورج دیوتا کا مندر بھی تھا۔ اس کا ہر سال تیرتھ ہوتا تھا۔ برصغیر کے شمالی اور مشرقی حصوں کے علاوہ پنجاب، کشمیر، کابل اور قندھار تک سے لوگ تیرتھ یاترا کے لئے آتے تھے۔ سورج دیوتا کا بُت بعض مورخین کی رائے میں سونے کا بنا ہوا تھا، اور بعض اسے لکڑی کا کہتے ہیں۔ جس پر لال چمڑا چڑھا ہوا تھا اور اس بت کی آنکھوں میں لعل جڑے ہوئے تھے۔

اسلامی لشکر جب ملتان پہنچا تو حاکم ملتان نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ آخر کار وہ قلعہ بند ہو گیا۔ اسلامی لشکر نے ملتان شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں نے بہت کوشش کے بعد آب رسانی کا سلسلہ معلوم کر لیا اور شہریوں پر اور قلعہ بند فوج پر اس میں رکاوٹ ڈال دی۔ پانی کی کمی اور پیاس کی شدت نے محصورین کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور

کر دیا۔ اس طرح ۷۱۳ء میں ملتان بھی فتح ہو گیا۔ ملتان سے اس قدر سونا حاصل ہوا کہ مسلمانوں نے اس کا نام ہی سونے کا شہر رکھ دیا۔

ملتان کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے پنجاب کے کچھ اور حصے بھی فتح کر لئے۔

اب محمد بن قاسم اپنی فتوحات کا ایک دور ختم کر چکا تھا اور دوسرے دور کی تیاری میں مشغول تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شمالی ہند کی طرف پیش قدمی کرے۔ لہذا اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ قنوج کے راجا کو ہتھیار ڈالنے کے لئے پیغام بھجوایا۔ وہاں کے رائے ہرچندر نے اس زعم میں کہ اِس کا خاندان صدیوں سے تخت نشین آرہا ہے اور اس کی حکومت شمالی ہند کی سب سے بڑی حکومت ہے۔ محمد بن قاسم کی اس دعوت کو مسترد کر دیا، چنانچہ محمد بن قاسم اپنے اعلیٰ افسروں سے مشورے کے بعد حملے کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔ اسی اثناء میں خلیفہ ولید کی موت اور خلیفہ سلیمان کی خلافت کی خبر اس تک پہنچی۔ خلیفہ سلیمان نے سب سے پہلے کام ہی یہ کیا کہ اس عظیم فاتح اور مجاہد کو معزول کر کے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔

دراصل محمد بن قاسم کو حجاج کا رشتہ دار ہونے کی سزا ملی تھی، کیونکہ حجاج نے حقِ خلافت کے سلسلے میں سلیمان بن عبدالملک کے مقابلے پر خلیفہ ولید کا ساتھ دیا تھا، حجاج چونکہ ولید کی زندگی ہی میں چل بسا تھا ورنہ اس کا بھی یہی حشر ہوتا۔

فاتح پنجاب کا کردار، انجام اور اس کی وجوہات

یہاں کے لوگوں کو جب محمد بن قاسم کے حسرتناک انجام کا علم ہوا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اتنی کم عمری میں کثیر تعداد میں فتوحات ہی اگرچہ خود تاریخ کا عظیم ایک کارنامہ تھیں مگر اس سے بڑھ کر محمد بن قاسم نے ایک اور کام بھی کیا تھا اور وہ یہ کہ اس نے اپنے حسنِ سلوک، اخلاقِ حمیدہ، عدل و انصاف، رحمدلی، رواداری اور مروّت اور عمدہ سیرت و کردار سے متاثر ہو کر ایک اوتار اور دیوتا کا رتبہ حاصل کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگوں نے اس کا بُت تراش کر اس کی پرستش کرنا شروع کر دی تھی۔

کچھ مورخین محمد بن قاسم کو پھانسی کی سزا کی وجہ ہندو لڑکیوں سے عشق کو قرار

دیتے ہیں۔ راجا داہر کی لڑکیوں سورج دیوی اور پرمل دیوی جنہیں فتح برہمن آباد کے بعد قید کر لیا گیا تھا، اس افسانے کا مرکزی کردار بتائی گئی ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر بے بنیاد افسانہ ہے، جو مغلِ اعظم کے دور کے ایک مؤرخ محمد معصوم بھاکڑی نے گھڑا اور اس بارے میں کوئی بھی سند پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جبکہ اس مؤرخ اور محمد بن قاسم کے دور میں تقریباً ۸۰۰ سال کا طویل بُعد پایا جاتا ہے۔

اس کے برعکس عرب مؤرخوں نے صحیح وجوہات درج کی ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حجاج بن یوسف بنو ثقیف کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور اِس قبیلے کا سربراہ بھی تھا۔ دوسری طرف سلیمان بن عبدالملک کی ماں تھی، جو یمنی الاصل تھی۔ اس کے ساتھ ہی یزید بن مہلب بھی تھا، جو حجاج اور اس کے خاندان کا دشمن تھا۔ ان دونوں گروہوں نے مسلمانوں کے اتحاد کو بہت نقصان پہنچایا۔ حجاج بن یوسف ہمیشہ خلیفہ ولید سے یہ اصرار کرتا رہا کہ سلیمان کی بجائے وہ اپنے بیٹے عبدالعزیز کو ولی عہد مقرر کرے، مگر ولید کی موت کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک خلیفہ بنا۔ مذکورہ اسباب کی بنا پر خلیفہ سلیمان حجاج اور اس کے رشتہ داروں اور قبیلے کے لوگوں سے سخت متنفر تھا۔ اور فطری طور پر ان کا دشمن تھا۔

حجاج کے بالواسطہ اثر ونفوذ کے ساتھ ساتھ ذاتی سطح پر بھی محمد بن قاسم کے سلیمان سے تعلقات تھے۔ اس نے سلیمان کو شہزادگی کے دَور میں نیزہ بازی میں بھی شکست دی تھی۔

ایک اور عرب مورخ کے مطابق حجاج نے سلیمان کو اپنی بیٹی دینے سے انکار کر کے محمد بن قاسم سے اس کا نکاح کر دیا تھا۔ یہ بات بھی اس کے لئے باعثِ غیرت تھی۔ علاوہ ازیں حجاج کی موت کے بعد اس کے جانی دشمن یزید بن مہلب کو فائز کیا گیا۔ جس نے حجاج کے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ ساتھ محمد بن قاسم کو بھی قتل کروا دیا۔

محمد بن قاسم کا انتظامِ سلطنت

سندھ اور پنجاب کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے خالص اسلامی بنیادوں پر

سلطنت کی بنیاد استوار کی۔ لوگوں کو پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ اس نے مندروں اور معابد کو نہ صرف قائم ہی رہنے دیا بلکہ ان کی مرمت و تعمیر بھی اپنے ذمے لے لی تھی۔ اس نے نئے مندروں کی تعمیر کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس کے مفتوحہ علاقوں میں برہمنوں کو ساری مراعات حاصل تھیں۔ ہندو پرانے مقرر شدہ محصول کے علاوہ جزیہ بھی دیتے تھے، جبکہ مسلمانوں پر عشر اور زکوۃ دینا لازم تھی۔ جزیے کے تین درجے تھے۔ امراء سے ۴۸ درہم، متوسط طبقوں سے ۲۴ درہم اور غرباء سے ۱۲ درہم وصول کئے جاتے تھے۔ جو آج کے سکے کے حساب سے علی الترتیب ۱۲ روپے، چھ روپے اور تین روپے کے برابر تھے۔ عورتیں، بچے، غریب، یتیم، بیوہ، برہمن اور معذور اس سے مستثنیٰ تھے۔ جزیہ وصول کرنے پر محمد بن قاسم نے برہمنوں کو متعین کر رکھا تھا۔ اِس طرح یہ ادائیگی بہ رضا و رغبت ہو جاتی تھی۔ برہمنوں کو حکم تھا کہ وہ وصولی کے وقت انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

محمد بن قاسم نے ہندوؤں کو ذمہ دار اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ ہندو اس کے مشیرِ خاص بھی تھے۔ برہمن آباد کے سارے کوتوال ہندو تھے۔ راجا داہر کے بیشتر عہدہ دار برقرار رکھے گئے تھے۔ جنگ میں متاثر ہونے والے غیر مسلموں کو محمد بن قاسم کی طرف سے مالی امداد دی گئی تا کہ وہ اپنی آبادکاری کا کام انجام دے سکیں۔

غزنوی خاندان

پنجاب کی تاریخ میں مسلمان فاتحین میں سے جو اوّلین نام ملتا ہے، وہ محمد بن قاسم کا ہے۔ محمد بن قاسم کی معزولی کے بعد نہ صرف یہ کہ عربوں کی پیش قدمی رک گئی تھی بلکہ سندھ اور ملتان بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ یورپی اور ہندی مورخین فتح سندھ کو محض ایک حادثہ قرار دیتے ہیں کیونکہ محمد بن قاسم کی روانگی کے بعد ہی مشرقِ وسطےٰ سے نکالے گئے قرامطیوں نے ان علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا۔

برصغیر میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ ترکوں کے ہاتھوں پھر سے شروع ہوا۔ جو کام عرب مجاہدوں نے ادھورا چھوڑا تھا اس کی تکمیل کے لئے ترک آگے بڑھے۔ انہوں نے اسلامی سلطنت کی وسعت اور تبلیغ اسلام کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ بعض مورخین کے ہاں اسلامی ریاست کے قیام اور تبلیغی خدمات میں ترکوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ترک جسمانی، ذہنی، جنگی، سیاسی اور تعلیمی لحاظ سے بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

سلطان سبکتگین (۹۷۷ء---۹۹۷ء)

خلفائے بنوعباس کے زوال کے دوران میں دور دراز کی متعدّد ریاستیں خلافتِ بغداد سے آزادی حاصل کرگئی تھیں اور انہوں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا تھا۔ ان ریاستوں میں خلیفۂ بغداد کی طرف سے جو نائب مقرر کئے گئے تھے انہوں نے گورنری چھوڑ سلطان کا لقب اختیار کرلیا تھا۔ اِس طرح کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آچکی تھیں۔ بظاہر یہ ریاستیں بغداد کے خلیفہ کی وفاداری کا دم بھرتی تھیں اور اس کی مطیع تھیں۔ لیکن حقیقت میں خلیفہ کا کوئی بھی حکم ان پر لاگو نہیں ہوتا تھا۔ انہیں ریاستوں میں سے ایک ریاست بخارا بھی تھی۔ اسی بخارا میں حاجی نصر سوداگر سبکتگین کو ترکستان سے لایا تھا۔ اور

اس نے اسے الپتگین کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا۔ اس نے سبکتگین کے چہرے پر عقل و دانش اور شوکت کے آثار دیکھ کر اسے اپنے خاص امراء کے زمرے میں شامل کر لیا۔ جنگِ غزنی کے وقت سبکتگین سپہ سالار تھا۔ اسے وکیل مطلق بھی مقرر کیا گیا تھا۔ سبکتگین باپ کی طرف سے ترک اور ماں کی طرف سے ایرانی النسل تھا۔ الپتگین کو بخارا کے سلطان نصر بن اسمٰعیل کی شاندار خدمات کے صلہ میں آزاد کر دیا گیا تھا۔

۹۲۲ء میں سلطان عبدالملک وفات پا گیا تو بخارا میں جنگِ تخت نشینی چھڑ گئی۔ الپتگین مرحوم سلطان کے بھائی المنصور کا حامی تھا۔ المنصور کی شکست کے بعد الپتگین بھی اس کے باقی آٹھ سو غلاموں کے ہمراہ غزنی بھاگ گیا۔ اس نے غزنی پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور پھر غزنی کے اردگرد کے علاقے کو فتح کر کے اس نے اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ آٹھ سال حکومت کرنے کے بعد وہ ۹۶۳ء میں فوت ہو گیا۔ ازاں بعد اس کا بیٹا اسحاق ابراہیم تخت نشین ہوا۔

سبکتگین کی فتوحات

سبکتگین نے اندرونی معاملات کو سدھارنے کے بعد سب سے پہلا حملہ ۹۷۷ء میں سیستان کے علاقے پر کیا۔ اس کے بعد راجا بھیم پال کے بیٹے راجا جے پال سے اس کا سامنا ہوا۔ راجا بھیم پال کی حکومت میں ملتان، سیالکوٹ اور دوآبہ بست جالندھر تک کا علاقہ شامل تھا۔ جے پال تخت نشین ہوا تو اس نے توسیع پسندانہ ارادوں کے ساتھ مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ سبکتگین نے ۹۷۸ء میں جے پال سے مقابلہ کر کے اُسے شکست دی اور اس سے قابل قندھار کے علاقے چھین لئے۔

شکست کھانے کے بعد جے پال نے جلال آباد کی بجائے لاہور کو اپنی راجدھانی بنا لیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک لشکرِ عظیم لے کر وادیِ عفان میں مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے پھر نکلا۔ جونہی سلطانِ غزنی کو خبر ملی، وہ بھی اپنے جانبازوں کو لے کر مقابلے کے لئے چل نکلا۔ وادیِ عفان میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ شدید برفباری کی وجہ سے ہندو فوج

ٹھٹھر کر رہ گئی۔ اس صورتحال میں راجا جے پال نے صلح کی درخواست کی، جو منظور کر لی گئی۔ اور شرائط یہ طے پائیں کہ لاہور کا راجا ایک لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی بطورِ تاوانِ جنگ ادا کرے۔ راجا کا مشہور درباری دولت رائے ضمانت کے طور پر سلطان کے پاس اس وقت تک رہے گا جب تک کہ تاوان موصول نہ ہو جائے۔ ہاتھیوں کی وصولی کے لئے راجا جے پال نے کچھ مسلمانوں کو ساتھ لے جانے کے لئے کہا۔ جسے سلطان نے منظور کر لیا۔ لاہور پہنچ کر اس نے ان مسلمانوں کو قید کر دیا اور سلطان کو دولت رائے کے لئے لکھ بھیجا کہ جب تک اسے واپس نہ کرے گا وہ تاوانِ جنگ ادا نہیں کرے گا۔

راجا جے پال کی بدعہدی نے سبکتگین کو بہت برہم کیا۔ محمود نے اپنے باپ کو مشورہ دیا تھا کہ جے پال سے یہ معاہدہ نہ کیا جائے۔ جو اس کی کم عمری کی بناء پر مسترد کر دیا گیا تھا، لیکن اب اسے محمود کی فراست کی داد دینا پڑی۔ بہر حال اب سلطان اپنی مٹھی بھر فوج لے کر پشاور کی طرف روانہ ہوا۔ راجا جے پال بھی بے خبر نہ تھا اس نے کالنجر، قنوج، دہلی اور اجمیر کے راجاؤں سے دھرم کے نام پر امداد حاصل کر کے ایک لاکھ کا لشکر بنایا اور پشاور کے قریب ڈیرا لگا دیا۔ اس کے بعد اسے برابر کمک پہنچتی رہی۔ ۹۹۷ء میں دونوں افواج کے درمیان یہ جنگ ہوئی،، جو بڑے سائنسی طریقے سے لڑی گئی۔ اِس میں ہندوؤں کے لشکر کو شکست ہوئی۔ اور مسلمانوں کے لئے برصغیر کی فتح کے دروازے کھل گئے۔ اسی سال سبکتگین بیس سال حکومت کرنے کے بعد اگست ۹۹۷ء میں ترمذ کے مقام پر فوت ہو کر غزنی میں دفن ہوا۔

سلطان محمود غزنوی، (۹۹۷ء---۱۰۳۰ء)

سلطان ابوالقاسم محمود یکم نومبر ۹۷۱ء کو پیدا ہوا۔ باپ نے اس کی تعلیم و تربیت پر کافی توجہ دی۔ اسے فنونِ حرب اور مروّجہ علوم سے آراستہ کیا۔ وہ ہر مہم پر محمود کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ اس طرح اسے عملی صورت میں جنگ کی تربیت بھی حاصل ہو گئی۔ سبکتگین نے اسے زندگی ہی میں فوجی جرنیل بنا دیا تھا۔ ۹۹۴ء میں خراسان کی فتح کا سہرا دراصل محمود ہی

کے سر تھا، جہاں بعد ازاں اسے ہی گورنر مقرر کیا گیا۔ سبکتگین کے آخری دنوں میں تمام فوجی مہمیں محمود نے ہی سر کی تھیں۔ سبکتگین کی موت کے وقت محمود خراسان میں بطورِ گورنر مقیم تھا۔ اور اس کا چھوٹا بھائی اسمٰعیل باپ کے پاس ہی تھا اس لئے وہی تخت نشین ہوا کیونکہ سبکتگین نے مرتے وقت اسے اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔

جب یہ اطلاع محمود کو ملی، تو وہ اپنی فوج کے ساتھ خراسان سے روانہ ہوا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو پیغام بھیجا کہ وہ اسے بلخ اور خراسان کی آزاد مملکت دینے کو تیار ہے۔ کیونکہ غزنی پر اس کا حق زیادہ ہے۔ اسمٰعیل نے محمود کی بات نہ مانی اور اپنی ضد پر قائم رہا۔ اس نے محمود کو یاد دلایا کہ مرتے وقت والد نے اسے جانشین مقرر کیا تھا، اس لئے وہی اس تخت پر قابض رہے گا۔ جب دونوں بھائیوں میں کسی طرح بھی کوئی مفاہمت نہ ہو سکی، تو اسمٰعیل بھی اپنی فوجیں لے کر مقابلے پر اتر آیا۔ محمود کی فوجی طاقت اس کے مقابلے میں بہت کم تھی، لیکن اسے اپنے عزیز و اقارب کی تائید بھی حاصل تھی۔ اسمٰعیل نے محمود کے خلاف اس جنگ میں کافی ہاتھی استعمال کئے، لیکن محمود کی عسکری ذہانت اس کے کام آئی۔ اطراف کے ترکوں، افغانوں اور خلجیوں نے شمشیر زنی کے بڑھ بڑھ کر جوہر دکھائے۔ اسمٰعیل نے جونہی میدان ہاتھ سے جاتا دیکھا تو اپنی شکست کو قبول کر لیا اور خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ اس نے خود ہی قلعے اور خزانے کی چابیاں بھی محمود کے حوالے کر دیں۔ محمود نے اسمٰعیل کو قید کر دیا، بعد میں ایک سازش کا انکشاف ہوا تو اسے جُرجان میں مقید کر دیا۔

اکتوبر ۹۹۷ء میں محمود تخت نشین ہوا۔ اس وقت سلطان محمود کی عمر صرف تیس سال تھی۔ اس نے تخت نشینی کے وقت اپنے والد کے پرانے فوجی سرداروں اور ساتھیوں کو جو اسمٰعیل کے طرف دار یا ہمدرد تھے، معاف کر دیا، وہ تمام امراء اور وزراء کے ساتھ بڑے احترام سے پیش آیا اور انہیں ان کے پرانے عہدوں پر ہی دوبارہ فائز کر دیا۔ دوسرا کام جو تخت نشینی کے بعد محمود نے کیا وہ سامانی حکمرانوں کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرنے کا تھا۔ اس ضمن میں محمود نے اپنا ایلچی بخارا کے امیر کے پاس بھیجا۔ بخارا کے

سلطان نے اس ایلچی کو شرف قبولیت بخشا۔

۹۹۹ء میں کاشغر کے امیر ایلک خان نے بخارا پر حملہ کر کے آخری سامانی حکمران کا تختہ الٹ دیا اور خود بخارا کا حکمران بن بیٹھا۔ سلطان محمود نے ایلک خان کو مبارک کا پیغام بھیجا اور ساتھ ہی اس کی لڑکی سے شادی کی درخواست کی، جسے منظور کر لیا گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ بغداد کے خلیفہ کی نیابت حاصل کرنے کے بعد یہ شادی انجام پائی، حالانکہ خلیفہ بغداد سے نیابت نامہ حاصل کرنے سے بہت پہلے یہ شادی ہو چکی تھی۔ کاشغر کا حاکم امیر ایلک خان بھی محمود کو اپنا طرفدار بنانا چاہتا تھا، کیونکہ دراصل سلطان محمود خود سامانیوں کی جگہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

سلطان محمود نے خلیفۂ بغداد القادر باللہ کے پاس بہت سے قیمتی تحائف ارسال کیے اور خلیفہ سے خراسان اور بلخ پر حکمرانی کی نیابت چاہی۔ خلیفہ نے سلطان محمود کو یمین الدولہ امین السلطنت اور سلطان کے خطابات سے نوازا اور ساتھ ہی ایک شاہی خلعت بھی روانہ کی۔ اس کے بعد اس نے اپنے نام کے ساتھ سلطان کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۹۹۹ء میں سامانی سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ہی غزنی کی ریاست کی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔

محمود غزنوی کے پنجاب پر حملے

سلطان محمود نے برصغیر پر کل سترہ چھوٹے بڑے حملے کیے۔ اس کا سب سے پہلا حملہ ۱۰۰۰ء میں ہوا تھا، جو شمال مغربی سرحدی علاقہ میں ان قلعوں اور دروں کو قابو میں کرنے کی غرض سے کیا تھا، جن پر اس کے باپ کے عہد میں لاہور کے راجا جے پال کا قبضہ تھا۔ چونکہ درّہ خیبر کے آس پاس جے پال کا قبضہ تھا، اِس لئے محمود کو پنجاب پر حملہ کی صورت میں مزاحمت کا خدشہ تھا۔ لہٰذا ان علاقوں کو فتح کرنا اور انہیں اسلامی ریاست میں شامل کرنا بے حد ضروری تھا۔ چنانچہ سلطان محمود فوجی نقطۂ نگاہ کے اہم مقامات کو سلطنت غزنی میں شامل کر کے واپس لوٹ گیا۔

دوسرا حملہ ۱۰۰۱ء میں ہوا۔ راجا جے پال کو اطلاع ملی کہ غزنی کی سلطنت اسمٰعیل اور محمود کے باہمی اختلافات کی بنا پر دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے، اس لئے اس نے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس پر محمود بھی جنگی تیاریاں کرنے کے بعد دس ہزار تیز رفتار سواروں کے ہمراہ پشاور پہنچ گیا۔ سلطان محمود نے راجا جے پال کو اس کی وعدہ شکنی کی سزا دینے کی شروع سے ہی ٹھانی ہوئی تھی، جو اس نے وادیِ عفان کی جنگ کے بعد سلطان محمود کے باپ سے کی تھی۔

سلطان محمود غزنوی دس ہزار گھوڑ سواروں کے ہمراہ روانہ ہوا۔ اس کے برعکس جے پال کے پاس پندرہ ہزار سوار، اور تیس ہزار پیادہ سپاہ کے علاوہ تین سو جنگی ہاتھی بھی تھے، جو تمام ضروری جنگی ساز و سامان سے لیس تھے۔ علاوہ ازیں اسے برصغیر کے راجوں سے بھی مسلسل کمک پہنچ رہی تھی۔ دونوں فوجوں کے درمیان جنگ کا آغاز نومبر ۱۰۰۱ء کو ہوا۔ دونوں طرف سے سپاہیوں نے تلوار کے جوہر دکھائی۔ اِس جنگ میں جے پال کو شکست ہوئی۔ وہ اپنے بیٹے انند پال اور پندرہ پوتوں، نواسوں سمیت گرفتار ہوا۔ ان سب کو پابہ زنجیر سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ سلطان محمود اس کے ساتھ لاہور آیا اور تاوانِ جنگ لے کر راجا جے پال اور اس کے خاندان کے لوگوں کو رہا کر دیا۔

محمود کا تیسرا حملہ ۱۰۰۴ء میں راجا بیجا رائے کی ریاست بھیرہ پر ہوا۔ سلطان محمود نے راجا جے پال کو عبرتناک شکست دے کر تاوانِ جنگ، مالِ غنیمت اور سالانہ خراج حاصل کیا اور پھر آئندہ کے لئے معاملات طے کر کے غزنی واپس چلا گیا۔ بھیرہ پر حملہ کا پس منظر یہ تھا کہ بیجا رائے کے سبکتگین سے سیاسی تعلقات استوار تھے۔ چونکہ راجا جے پال راجا بھیرہ کا دشمن ہونے کے علاوہ طاقتور بھی بن چکا تھا۔ اس لئے بیجا رائے نے سبکتگین سے دوستانہ تعلقات استوار کر لئے تھے۔ راجا جے پال کے ساتھ جنگ میں راجا بھیرہ بیجا رائے نے محمود کو اپنی مقدور بھر امداد کا یقین دلایا تھا، لیکن جب جنگ ہوئی تو اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ سلطان محمود اس کی وعدہ خلافی اور دھوکا دہی پر سخت برہم ہوا۔ جبکہ وہ سلطان کا باجگزار بھی تھا۔ علاوہ ازیں راجا جے پال کی موت کے بعد خراج دینا بھی بند کر

دیا تھا اور سلطان محمود کے نمائندے کو، جو خراج کی وصولی پر معمور تھا، خراج دینے سے انکار کر دیا۔ ان وجوہات کی بنا پر محمود نے ۱۰۰۴ء میں بھیرہ پر حملہ کیا۔ اس شکست کے بعد راجا بیجا رائے نے خودکشی کر لی۔

ملتان پر حملہ

ملتان پر اس وقت قرامطیوں کی حکومت تھی۔ یہاں کا حاکم ابوالفتح داؤد تھا۔ اس نے محمود غزنوی کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ ملتان پر حملے کی مزید وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ قرامطی اسمٰعیلیہ فرقہ کی ہی ایک شاخ ہے۔ خلیفۂ بغداد نے ان کو معاندانہ سرگرمیوں کی بناء پر تمام اسلامی ممالک سے نکال دیا تھا۔ محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد سندھ کا علاقہ سندھ کا زیریں اور بالائی دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ زیریں حصے کا صدر مقام منصورہ اور بالائی حصے کا صدر مقام ملتان تھا۔ قرامطیوں اور ان کے طرفداروں نے عرب حکمرانوں کو دونوں مقامات سے نکال باہر کیا اور خود ان پر قبضہ کر کے حکمران بن بیٹھے۔

۲۔ قرامطیہ کے غلط عقائد اور معاندانہ سرگرمیوں نے اسلامی دنیا کو نہ صرف بنیادی طور پر نقصان پہنچایا تھا بلکہ اس کی وجہ سے اسلام دشمن عناصر نے فائدہ اٹھا کر اسلام کے بارے میں غلط تاثر دینا شروع کر دیا تھا۔ قرامطیہ فرقے کے حامی ۹۳۰ء میں سرزمین عرب سے رخصت ہوتے وقت خانہ کعبہ سے حجرِ اسود کے علاوہ دیگر مقدس اشیاء بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال تصور کرتے تھے۔ ان لوگوں نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد خلفائے بغداد کے خلاف ایک محاذ کھول دیا تھا۔ یہ فرقہ بنو عباس کے سخت خلاف تھا۔ جبکہ سلطان محمود غزنوی ان کا معتقد تھا۔ تمام سنی العقیدہ مسلمان بغداد کے خلفاء کو اپنا امام تصور کرتے تھے۔ چونکہ سلطان محمود خلیفہ کا حامی تھا، اس لئے یہ سنہری موقع

تھا کہ وہ اِس فرقے کے خلاف جنگی کاروائی کر کے بغداد کی خوشنودی حاصل کر لے۔

۳۔ ملتان کے حاکم ابوالفتح قرامطی نے سلطان محمود غزنوی کی فوج پر اِس وقت حملہ کر دیا تھا جبکہ وہ بھیرہ کے راجا کو شکست دے کر مال غنیمت کے ساتھ غزنی واپس جا رہا تھا۔ اس لئے بھی سلطان اِس سے نپٹنا چاہتا تھا۔

۴۔ ابوالفتح نے ۱۰۰۵ء میں راجا جے پال کے لڑکے انند پال سے سلطان کے خلاف فوجی معاہدہ کر لیا تھا۔ والیٔ بھیرہ راجا بیجا رائے سے بھی اس کا اسی قسم کا معاہدہ تھا۔ لیکن ابوالفتح اِس وقت فوج لے کر پہنچا جبکہ سلطان محمود غزنوی فتح کے بعد واپس جا رہا تھا۔ سلطان محمود کی نظریں ہندوستان کے آخری حصے تک تھیں۔ اس لئے ملتان کی فتح کے بغیر وادیِ سندھ کے زیریں حصے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

۵۔ ملتان نے سلطانِ غزنوی کو خراج دینا منظور کر لیا ہوا تھا۔ لیکن ابوالفتح نے حکومت سنبھالتے ہی خراج دینا بند کر دیا اور خود کو آزاد اسلامی سلطنت کا حکمران خیال کرنے لگا۔

سلطان محمود غزنوی نے دریائے سندھ کے زیریں علاقے کی بجائے بالائی حصے سے دریا کو عبور کرنا پسند کیا کیونکہ یہاں سے اس کا پاٹ قدرے تنگ تھا۔ چنانچہ جب اس کا لشکر جلال آباد کے مقام سے دریائے سندھ کو عبور کر رہا تھا تو مشرقی کنارے پر والی لاہور راجا انند پال کی فوج موجود تھی۔ دونوں فوجوں میں جنگ شروع ہوئی، مگر چند ہی گھنٹوں میں ہندو فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ محمود غزنوی کے لشکر نے وزیر آباد تک ان کا پیچھا کیا۔

راجا انند پال بھاگ کر لاہور آ گیا۔ لیکن وہاں سے بھی اسے راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ پھر وہ کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سلطان محمود نے کشمیر تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ بعد ازاں غزنی لشکر نے ملتان پر حملہ کر دیا۔ ابوالفتح امیر ملتان نے کھلے میدان کی بجائے قلعہ بند ہو کر لڑنا پسند کیا۔ مگر سات روز کے محاصرے کے بعد ہی اس نے

ہتھیار ڈال دیئے۔

ابوالفتح نے صلح کی درخواست کی اور ساتھ ہی سالانہ خراج کا وعدہ بھی کیا۔ بیس ہزار دینارِ زر بطورِ تاوان جنگ ادا کرنے کی پیشکش کی۔ سلطان محمود نے اس کی درخواست کو قبول کر لیا۔ سلطان محمود نے بھرے دربار میں ابوالفتح سے توبہ کرائی اور سارے درباری بھی اپنے فاسق عقیدے سے تائب ہو گئے۔ لہذا اب سلطان نے اسے ہی ملتان کا حکمران رہنے دیا۔

سلطان محمود کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ روز پنجاب میں قیام کرے، لیکن اسے جلد ہی واپس لوٹنا پڑا، کیونکہ اسے اطلاع ملی کہ اس کے سُسر اور والیِ کاشغر ملک ایلک خان نے سامانی حکومت کا تختہ الٹ کر خود حکمرانی سنبھال لی ہے اور بخارا کا باقاعدہ حاکم بننے کے بعد سلطان کی مسلسل غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر غزنی پر حملہ کر دیا ہے لہذا سلطان محمود کو اِس صورت حالات سے نپٹنے کے لئے فوراً واپس غزنی جانا پڑا۔ پنجاب کے تمام امور بحیثیتِ حکمرانِ اعلیٰ نواسہ شاہ ایک نومسلم کے سپرد کر کے وہ خود ۱۰۰۶ء میں واپس غزنی پہنچ گیا۔

نواسہ شاہ راجا جے پال کا نواسہ تھا جس کا ہندوانہ نام سیوک پال یا سکھ پال تھا مگر مسلمانوں نے اسے نواسہ شاہ کے نام سے موسوم کیا۔ وہ پشاور کے غزنوی گورنر کے ہاتھ پر اسلام لایا تھا اور سلطان محمود کو اس پر بڑا اعتماد تھا۔

نواسہ شاہ کی بغاوت

سلطان محمود واپس پہنچ کر ملک ایلک خان کی بغاوت کو ابھی کچلنے ہی پایا تھا کہ اسے پنجاب کے حاکم اعلیٰ کی بغاوت کا علم ہوا۔ نواسہ شاہ نے بھیرہ کے قلعہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں وہ اسلام کو ترک کر کے پھر سے ہندو ہو گیا تھا اور اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انند پال نے نواسہ شاہ سے فوجی معاہدہ کر لیا کہ اگر سلطان محمود بھیرہ پر حملہ آور ہوگا تو وہ اس کی مدد کرے گا۔ نواسہ شاہ نے تمام مسلمان

عہدیداروں کو ذلیل وخوار کر کے ملازمتوں سے سبکدوش کر دیا تھا، کیونکہ وہ سلطان محمود کے مقرر کردہ تھے۔ ان باتوں کے پیشِ نظر سلطان اِس کی سرکوبی کے لئے اسی سال یعنی ۱۰۰۶ء میں پھر حملہ آور ہوا۔

سلطان محمود نے ترک نوجوانوں پر ایک گھوڑا سوار دستہ نواسہ شاہ کی بغاوت کو کچلنے کے لئے روانہ کر دیا۔ یہ دستہ ہراول کی حیثیت رکھتا تھا۔ جونہی یہ دستہ بھیرہ کے قریب پہنچا تو اس کا سامنا مخالف فوج کی کثیر تعداد سے ہو گیا۔ مگر اس ہراول دستے نے نواسہ شاہ کی فوج کو تتر بتر کر کے رکھ دیا اور نواسہ شاہ کو گرفتار کر کے سلطان کے حضور پیش کیا گیا۔ سلطان نے چار لاکھ درہم بطورِ تاوانِ جنگ طلب کئے جو وہ دینے سے قاصر تھا۔ چنانچہ تاحینِ حیات قید کر دیا گیا، اور قید ہی میں اس کی موت واقع ہوئی۔

راجا انند پال والیِ لاہور سے جنگ، (۱۰۰۸ء---۱۰۰۹ء)

نواسہ شاہ کی گرفتاری اور بھیرہ کی دوبارہ فتح کے بعد راجا انند پال والیِ لاہور نے بڑی شدّت سے یہ محسوس کیا کہ غزنوی کے سلطان سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ یا وہ خود تباہ ہو جائے گا یا پھر مسلمانوں سے چھٹکارا حاصل کرے گا۔ جب سلطان محمود بھیرہ سے غزنی چلا گیا۔ تو انند پال نے اپنے قابل ترین وزراء اور امراء کو برصغیر کے راجاؤں کے پاس روانہ کر دیا۔ ان سب راجاؤں کو بھی فکر ہوئی کہ اگر سلطان محمود انند پال کو مارنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر اُسے آگے تک آجانے میں کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔ اس طرح انہوں نے متحدہ محاذ بنا لیا۔

لڑائی میں ایک طرف محمود کی مختصر مگر منظم فوج تھی اور دوسری طرف تقریباً سارا ہندوستان تھا مگر اُن کی متحدہ کمان کوئی نہیں تھی۔ لڑائی کی ابتداء میں انند پال کا ہاتھی بھاگ نکلا۔ دوسرے راجاؤں نے سمجھا کہ اِس نے ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے اس لئے وہ سب بددل ہو گئے اور فوج میں افراتفری پھیل گئی۔ اِس طرح سلطان محمود جنگ جیت گیا۔ اِس فتح کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ بڑے سے بڑا راجا بھی اَب سلطان محمود سے دہلنے لگا تھا۔

اِس معرکے سے فارغ ہو کر اس نے نگرکوٹ کو فتح کیا۔

ابوالفتح والیِ ملتان کی سرکوبی، (۱۰۱۰ء---۱۰۱۱ء)

کانگڑہ اور نگرکوٹ کی فتح کے بعد سلطان محمود ابھی غزنی پہنچا ہی تھا کہ اسے ملتان کے حاکم ابوالفتح کے باغی ہو جانے کی خبر ملی۔ اس نے ملتان پر حملہ کر کے ابوالفتح کو گرفتار کر لیا اور حبسِ دوام کی سزا دی اور دوسرے قرامطیوں کو بھی کڑی سزائیں دیں۔

تھانیسر کی فتح، (۱۰۱۱ء)

ضلع کرنال کی اِس تحصیل میں، ایک عظیم مندر میں مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈہ کیا جاتا تھا۔ تھانیسر کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ہندوشاہی راج کا علاقہ تھا۔ انند پال کو چونکہ عبرت حاصل ہو چکی تھی۔ اس لئے اس نے نہ صرف یہ کہ مزاحمت نہ کی بلکہ رسد کا سامان پہنچانے میں بھی مدد کی۔ انند پال نے تھانیسر کے مندروں کو صحیح اور سالم چھوڑنے کی استدعا کی تھی، لیکن محمود نے یہ پیشکش مسترد کر دی۔ تھانیسر کے راجا نے دوسرے راجاؤں کو ساتھ ملانا چاہا، لیکن اِس کی یہ کوشش ایک بے وقت کوشش تھی۔ کیونکہ سلطان محمود کی فوجیں سر پر آ چکی تھیں۔ چنانچہ راجا نے مایوس ہو کر راہِ فرار اختیار کی۔ محمود کو مندروں کے علاوہ شہر سے بھی بے حساب مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔

نندنہ کی فتح، (۱۰۱۳ء)

انند پال کی موت کے بعد اس کی گدی تری لوچن پال نے حاصل کی، لیکن ہندوشاہی کا اصل کرتا دھرتا تری لوچن پال کا بیٹا بھیم پال تھا جو کہ نڈر بھیم پال کے نام سے مشہور تھا۔ بھیم پال نے محمود کی مخالفت حد سے زیادہ کی۔ محمود جب فوج لے کر آگے بڑا تو اس نے دریائے جہلم پر اس کا راستہ روک لیا۔ طرفین میں سخت لڑائی ہوئی، جس کے نتیجے میں بھیم پال کو شکست ہوئی اور وہ کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔ اس طرح نندنہ کا قلعہ بھی فتح ہو گیا۔

پنجاب کا غزنی سے الحاق

سلطان محمود کو پنجاب پر پورا قبضہ کرنے کی اہمیت اور ضرورت کا احساس کئی بار ہو چکا تھا، اس لئے اِس مرتبہ اس نے پنجاب کی مکمل فتح کا منصوبہ بنالیا۔ اِس دفعہ وہ اپنے ساتھ فوج کے علاوہ ادیب، شاعر، انجینئر، سنگ تراش، لوہار اور بڑھئی بھی لے کر آیا تھا۔ اِس دفعہ اس کے سامنے پنجاب کی تنظیم نو اور غزنی سے اس کا الحاق بھی تھا۔ چنانچہ اس نے لاہور کو دارالحکومت بنایا اور اپنے غلام ایاز کو اس کا حاکم مقرر کیا۔ پنجاب کے مختلف حصے اپنے افسروں کی نگرانی میں دیئے۔ اہم مقامات پر چھاؤنیاں قائم کیں۔ اِس طرح وہ ۱۰۲۱ء، ۱۰۲۲ء میں پنجاب کی طرف سے مطمئن ہو کر اگلی مہموں میں مشغول ہو گیا، جن میں گوالیار اور سومنات شامل ہیں۔

فتح سومنات کے بعد واپسی پر سلطان محمود غزنوی کو ملیریا بخار ہو گیا، جس نے رفتہ رفتہ دق کی صورتؑ اختیار کر لی، جس کے ہاتھوں اپریل ۱۰۳۰ء میں اس نے انتقال کیا۔

سلطان محمود کے جانشین

سلطان مسعود اوّل، (۱۰۳۰ء---۱۰۴۱ء)

سلطان محمود کی وفات کے وقت سلطان مسعود اصفہان میں تھا اور اس کا جڑواں بھائی امیر محمد غزنی میں موجود تھا۔ لہذا باپ کے مرنے کے بعد اسے تخت نشین کر دیا گیا۔ وہ اپریل ۱۰۳۰ء سے لے کر ستمبر ۱۰۳۰ء تک حکمران رہا، کیونکہ مسعود نے اسے اندھا کر کے تخت سے اتار دیا تھا۔ سلطان مسعود نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ لاہور کے حاکم آریاک کو گرفتار کیا، جس نے سلطان محمود کے آخری ایام میں باغیانہ روش اختیار کر لی تھی۔ اس کی جگہ امیر محمد نیالتگین کو لاہور کا حاکم مقرر کیا، مگر اس نے بھی بغاوت کی اور مسعود کے ایک ہندو سپہ سالار کو قتل کر دیا، جس نے مسعود کو مشتعل کر دیا۔ اس نے ایک اور ہندو سپہ سالار تلک رام کے زیرِ کمان اپنی فوج پنجاب کی طرف روانہ کی تاکہ اس سے بدلہ لیا جا سکے۔ تلک رام کے مقابلے میں نیالتگین کو شکست ہوئی اور وہ ملتان کی طرف بھاگ گیا، جہاں وہ دریائے سندھ میں ڈوب مرا۔ اس کے بعد پنجاب کا گورنر تلک رام کو مقرر کر دیا گیا۔

ادھر ترک برابر مسعود کو تنگ کر رہے تھے۔ آخری بار سلطان مسعود کو جب ترکوں سے واسطہ پڑا تو اس کے اپنے سردار فوج سمیت دشمن کی طرف ہو گئے اور وہ صرف اپنے چند غلاموں کے ساتھ میدان میں رہ گیا۔ اِس صورت حال کو دیکھ کر وہ مرو کی طرف بھاگ گیا، جہاں سے پھر وہ غزنی آ گیا۔ غزنی سے اس نے پنجاب کا قصد کیا، لیکن راستے میں امیر محمد کے ساتھیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ بعدازاں قلعہ گیری میں اسے قتل کر دیا گیا۔

سلطان مودود، (۱۰۴۲ء---۱۰۴۹ء)

سلطان مسعود اول کے قتل کے بعد اس کا بیٹا جو اس وقت بلخ میں تھا، غزنی پہنچ کر تخت نشین ہوا۔ وہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے قلعہ گیری کی طرف روانہ ہوا۔

وہاں امیر محمد کا بیٹا فوج لئے موجود تھا۔ سلطان مودود کو فتح ہوئی۔ اس نے امیر محمد کے چھوٹے بیٹے عبدالرحیم کے سوا ان سب کو گرفتار کر کے قتل کروا دیا۔

لاہور میں اس وقت سلطان مودود کا بھائی مجدود حاکم تھا، جس نے بھائی کی اطاعت اور اس کا سکہ جاری کرنے سے انکار کر دیا۔ سلطان مودود نے اس کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر روانہ کیا، جس سے امیر مجدود کا آمنا سامنا لاہور کی مشرقی جانب ہوا، لیکن جنگ ہونے سے قبل ہی امیر مجدود اپنے خیمے میں مردہ پایا گیا۔ اس طرح یہ بغاوت خود بخود ختم ہو گئی۔ اس فتح کے ساتھ ہی اُسے ترکوں کی یلغار کا علم ہوا۔ چنانچہ وہ لاہور میں ایک فوجی دستہ چھوڑ کر واپس ہوا۔ اس کے عہد میں ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ سوائے لاہور کے پنجاب کے باقی علاقوں پر ہندوؤں نے یلغار کر کے قبضہ کر لیا۔ جس سے ہندوؤں کا دِل بڑھا اور دلّی کے راجا مہی پال نے کانگڑہ، تھانیسر، اور ہانسی وغیرہ کو فتح کرنے کے بعد لاہور کا محاصرہ کر لیا، لیکن یہاں اُسے ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

مودود ہی کے عہد میں پنجاب کے مسلمان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئے تھے اور اس تفرقے سے ہندوؤں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اِس طرح ہندوؤں کی ایک متحد جماعت منظرِ عام پر آنے لگی۔ سلطان مودود ترکوں کی یلغار کے دوران میں زخمی ہو گیا تھا، جس کے بعد وہ زخموں کی تاب نہ لا کر ۱۰۴۹ء میں انتقال کر گیا۔

ابوالحسن بن مسعود۔ (۱۰۴۹ء---۱۰۵۱ء)

سلطان مودود کی وفات کے بعد اس کا چار سالہ بیٹا تخت نشین ہوا۔ لیکن چھ دن کی حکومت کے بعد اس کا چچا ابوالحسن تخت نشین ہو گیا۔ چونکہ سلطان مودود کے چار سالہ بیٹے مسعود کو تخت نشین کروانے والا علی بن ربیع تھا اس لئے جب اسے ابوالحسن کی تخت نشینی کی خبر ملی تو پشاور کی طرف بھاگ گیا اور بہت سا خزانہ اور غلام اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں اس نے ایک خود مختار حکومت بنا لی، جس میں پنجاب اور ملتان کے بیشتر علاقوں کو شامل کر لیا۔

سلطان محمود کا چھوٹا بیٹا عبدالرشید ان دنوں غزنی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ابوالحسن

نے عبدالرشید کو غزنی سے دور رکھنے کیلئے امراء اور وزراء کو بے شمار مال و دولت دے کر فضا ہموار کرنا شروع کر دی، لیکن عبدالرشید بن سلطان محمود غزنی پر حملہ آور ہو کے رہا اور اس طرح ابوالحسن بن مسعود کی دو سالہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

سلطان عبدالرشید بن سُلطان محمود، (۱۰۵۱ء --- ۱۰۵۲ء)

عبدالرشید، سلطان محمود کا جعلی بیٹا تھا، جسے سلطان مودود نے قید کروا دیا تھا۔ اس کے دَور کا اہم واقعہ کانگڑہ کی فتح ہے۔ علی بن ربیع جس نے برصغیر میں انتشار پھیلا رکھا تھا۔ کیونکہ وہ غزنی سے ناراض تھا، لیکن سلطان نے اسے بلا کر راضی کر لیا۔ ۱۰۵۱ء میں کانگڑہ کا محاصرہ کیا اور صرف چھ دن میں اُسے فتح کر لیا۔

طغرل خان، سلطان رشید کا معتمد جرنیل خراسان کی مہم پر تھا۔ اس نے کامرانیوں سے سرشار ہو کر غزنی پر حملہ کر دیا، جس کے نتیجے میں سلطان عبدالرشید قتل ہو گیا اور طغرل حکمران بن بیٹھا، مگر چند ہی روز بعد طغرل بھی قتل ہو گیا۔

سُلطان ابراہیم بن مسعود اوّل، (۱۰۵۹ء --- ۱۰۹۹ء)

طغرل حاجب کی موت پر فرخ زاد بن سلطان مسعود اوّل غزنی کا حکمران ہوا۔ اس نے چھ سال تک حکومت کی۔ اس کے عہد میں پنجاب میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اس کی وفات کے بعد ۱۰۵۹ء میں سلطان ابراہیم تخت نشین ہوا۔

سلطان ابراہیم ایک کامیاب سیاستدان تھا۔ اس نے اس وقت تک برصغیر کی طرف کوئی مہم روانہ نہیں کی جب تک اسے سلجوقیوں سے فراغت نہ مل سکی۔ پھر ان کا زور مکمل طور پر توڑ دینے کے بعد اس نے برصغیر کا رُخ کیا۔

اس کی تخت نشینی کے پورے بیس سال بعد غزنوی فوج ۱۰۷۹ء میں پاکپتن پر حملہ آور ہوئی۔ یہ مشہور قلعہ بڑی آسانی سے فتح ہو گیا۔ اس کی فوج نے دوسرا حملہ پنجاب کے بے حد اہم قلعے روپال پر کیا اور اسے بھی فتح کر لیا۔ تیسری فتح قلعہ دَرّہ کی تھی، جس میں خراسانی نسل کے ہندو آباد تھے۔ اس شہر سے ایک لاکھ غلام اور بہت سا قیمتی ساز و سامان

سلطان کے ہاتھ لگا۔ اِس کے بعد وہ واپس غزنی چلا گیا، جہاں وہ ۱۰۹۹ء میں فوت ہو گیا۔

مسعود دوم بن سلطان ابراہیم، (۱۰۹۹ء---۱۱۱۷ء)

مسعود دوم اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں غزنی کا صدر مقام لاہور بن گیا تھا۔ اس نے ترکوں سے بھی تعلقات استوار رکھے، حتیٰ کہ سلطان سنجر سلجوقی کی بہن سے شادی بھی کی۔

پنجاب میں اس نے طغا حاجب کو گورنر مقرر کر کے پنجاب کے دور دراز علاقوں کے علاوہ برصغیر کے دوسرے علاقوں کو بھی فتح کرنے کا حکم دیا۔ طغا حاجب نے گنگا تک کا علاقہ روند ڈالا۔ اس کے دور میں امن کی فضا قائم ہوئی اور لاہور نے بہت ترقی کی۔

ارسلان شاہ بن سلطان مسعود دوم، (۱۱۱۷ء---۱۱۲۰ء)

مسعود دوم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ارسلان شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت کے تین سال اپنے بھائی بہرام شاہ سے جنگ میں گزرے۔ آخر کار بہرام شاہ نے سنجر کی امداد سے غزنی کو فتح کر لیا اور اس کی حکومت بہرام شاہ کے حوالے کر دی۔ لاہور میں جب ارسلان شاہ کو اطلاع ملی تو سنجر کے جانے کے بعد پنجابی فوج لے کر حملہ آور ہوا اور غزنی کو فتح کر لیا، لیکن سنجر نے پھر بہرام شاہ کی امداد کی۔ اب کے معرکے میں ارسلان شاہ قتل ہو گیا۔

بہرام شاہ بن سلطان مسعود دوم، (۱۱۲۰ء---۱۱۵۲ء)

بہرام شاہ چونکہ سلجوقیوں کی مدد سے سلطان بنا تھا، اس لئے ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا رہا۔ سلطان ارسلان کے مقرر کردہ پنجاب کے گورنر نے خودمختاری کا اعلان کر دیا، جس کی سرکوبی کے لئے اس نے پنجاب پر حملہ کیا۔ اس مہم میں گورنر پنجاب گرفتار ہوا، پھر اس نے بہرام شاہ کو اپنی وفاداری کا پختہ یقین دلایا، جس کے بعد سلطان نے اسے پھر بحال کر دیا۔

سلطان بہرام شاہ واپس غزنی آیا تو پنجاب میں پھر بغاوتیں ہونے لگیں، جنہیں گورنر پنجاب نے بڑی کامیابی سے کچل دیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد اس نے پھر بغاوت کردی۔ چنانچہ اس کو راہِ راست پر لانے کے لئے بہرام شاہ کو پنجاب پر دوسرا حملہ کرنا پڑا۔ اس حملے میں گورنر ہلاک ہو گیا۔ اس کی جگہ بہرام نے حسین بن ابراہیم علوی کو پنجاب کو سپہ سالار مقرر کیا۔ ایک طویل عرصہ حکومت کرنے کے بعد بہرام شاہ نے ۱۱۵۲ء میں وفات پائی۔

خسرو شاہ بن بہرام شاہ، (۱۱۵۲ء---۱۱۶۰ء)

بہرام شاہ کے عہد میں ہی بیرونی حملہ آور تیز ہو گئے تھے۔ کیونکہ بہرام شاہ نے اپنے داماد قطب الدین اور پھر اس کے بھائی سیف الدین کو قتل کر دیا تھا۔ اس واقعہ کی اطلاع جب والیِ کوہ فیروز عزالدّین کو ملی، تو اس نے اپنے بیٹوں کا انتقام لینے کی قسم کھائی اور غزنی پر حملہ کر دیا۔ بہرام شاہ اپنے دوسرے بیٹے دوست شاہ کے قتل ہو جانے کے بعد برصغیر کی طرف بھاگ گیا۔ جب علاء الدّین نے غزنی پر قبضہ کیا تو اس نے اپنے لڑاکے غوریوں کو حکم دیا کہ غزنی کو ویرانہ بنا دیں۔ چنانچہ وہ غزنی کو اجاڑ کر واپس چلا گیا۔

خسرو شاہ اِن دنوں لاہور میں مقیم تھا۔ علاء الدّین کی واپسی کے بعد خسرو شاہ نے اپنے وطن آنے کی سوچی، کیونکہ سلطان سنجر نے خسرو شاہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ غزنی کی تباہی کا غوریوں سے ضرور بدلہ لے گا، اگرچہ انہی دنوں سلطان سنجر کو موت نے آلیا تھا، لیکن سلجوقی ترکوں نے اس کے عہد کو پورا کیا اور حملہ کر کے علاء الدّین کو گرفتار کر لیا۔

خسرو شاہ سات سال کی حکومت کے بعد ۱۱۶۰ء میں فوت ہو گیا۔

خسرو ملک بن خسرو شاہ، (۱۱۶۰ء---۱۱۸۶ء)

خسرو شاہ کی موت کے بعد خسرو ملک تخت نشین ہوا۔ اس نے لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ خسرو ملک نے وہ علاقے دوبارہ فتح کیے، جو غزنویوں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے، ادھر --- شہاب الدّین غوری نے غزنی پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ

برصغیر کی طرف بڑھنے لگا۔ چنانچہ اس نے ۱۱۷۹ء میں افغانستان، پشاور، سندھ اور ملتان پر قبضہ کرلیا۔ مگر شہاب الدین غوری اور خسرو ملک میں ہونے والی لڑائی مشروط صلح پر ختم ہو گئی اور شہاب الدین غوری خسرو ملک کا چار سالہ بیٹا بطور یرغمال اپنے ساتھ لے گیا، تاکہ خسرو ملک سالانہ خراج دینے کا وعدہ بروقت پورا کرے، مگر خسرو ملک حسب وعدہ خراج نہ دے سکا، اس پر شہاب الدین غوری نے دوبارہ حملہ کردیا۔ یہ حملہ ۱۱۸۴ء میں ہوا۔ غوری نے لاہور کا محاصرہ کرلیا مگر یہ محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہنے کے باوجود لاہور فتح نہ ہوسکا۔ لہٰذا غوری گردونواح کے علاقے لوٹتا ہوا سیالکوٹ جا پہنچا اور وہاں کے قلعے پر قبضہ کرلیا۔ اس نے وہاں اپنا ایک نائب مقرر کیا اور خود واپس چلا گیا۔ ۱۱۸۶ء میں خسرو ملک نے سیالکوٹ پر پھر قبضہ کرلیا۔

خسرو ملک کی سیالکوٹ پر چڑھائی کے باعث، شہاب الدّین غوری نے اسی سال ۱۱۸۶ء میں لاہور پر ایک بار پھر حملہ کردیا۔ اب اس نے لاہور کو مکمل طور پر فتح کر کے غوری سلطنت میں شامل کرنے کا پکا ارادہ کرلیا تھا۔ اِس دفعہ اس نے طاقت استعمال کرنے کی بجائے ایک چال چلی، یعنی خسرو ملک کے بیٹے کو رہا کرنے کے بہانے کچھ سرداروں کے ہمراہ لاہور روانہ کردیا۔ اور انہیں یہ تاکید کی یہ سفر نہائیت آہستگی سے کریں۔

جب یہ خبر سلطان خسرو ملک کو ملی تو وہ استقبال کی خاطر قلعے سے باہر نکل آیا۔ اسی اثناء میں شہاب الدّین غوری بائیس ہزار سواروں کے ساتھ دوسرے راستے لاہور کے قریب پہنچ گیا اور خسرو ملک اور اس کے سپاہیوں کو گھیرے میں لے کر خسرو ملک گرفتار کر لیا۔ اس طرح لاہور پر غوریوں کا قبضہ ہوگیا۔

اِسی سال یعنی ۱۱۸۶ء میں خسرو ملک کی وفات ہوئی۔ اِس طرح غزنی اور پنجاب سے آل یمین کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

غوری خاندان

غوری خاندان کے لوگوں کا تعلق ایران کے مشہور بادشاہ ضحاک سے ہے۔اس کے زوال کا باعث چونکہ فریدوں ہوا تھا۔اس لئے ضحاک کے خاندان کے لوگ ہر وقت خوف وہراس کی فضا میں زندگی گزارنے لگے۔اگر چہ اس خاندان کے دو افراد سوری اور سام، جو دونوں سگے بھائی تھے، فریدوں کے دربار سے منسلک ہو گئے مگر وہ اپنے آپ کو اپنے خاندانی دشمن سے محفوظ و مامون نہیں سمجھتے تھے، اسی لئے ایک رات وہ دونوں اپنے اہل وعیال کو لے کر نہاوند کے علاقے کی طرف نکل گئے۔ یہاں آکر سُوری کو قبیلے کی سرداری حاصل ہوئی اور سام کو فوجی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔دونوں بھائی آپس میں بڑی محبت، اخوت اور اتفاق واتحاد سے زندگی بسر کرتے رہے۔سُوری نے اپنی بیٹی کی شادی بھی سام کے لڑکے شجاع سے کی۔ کچھ عرصے بعد سام کا انتقال ہو گیا۔اس کی وفات کے بعد کچھ دراندازوں کی وجہ سے چچا بھتیجے میں مخالفت کی بناء پڑ گئی۔اِس لئے سُوری نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ شجاع سے اپنی بیٹی کو علیحدہ کر کے اپنے اس حریف کو جلاوطن کر دے، لیکن اس کی بیٹی نے تمام حالات سے اپنے خاوند کو مطلع کر دیا۔شجاع کو سُوری کے ان ارادوں کا پتا چلا تو وہ کچھ ضروری ساز وسامان کو لے کر راتوں رات علاقۂ غور کی جانب نکل گیا، جہاں اس نے اپنے آپ کو محفوظ خیال کیا۔شجاع نے اِس علاقے میں کچھ قلعے تعمیر کروائے اور پھر آہستہ آہستہ وہ اِس علاقے کی قابلِ ذکر قوت بن گیا۔ضحاک کے خاندان کے منتشر اور پراگندہ بھی افراد اِس علاقے میں اِس کے گرد جمع ہو گئے۔ یہیں سے اس نے فریدوں سے کئی مرتبہ زور آزمائی بھی کی۔ اِس خاندان کے مابعد کے سرداروں میں سے ایک کا نام شنسب تھا، جس نے خلیفۂ چہارم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا۔اسی وجہ سے اس خاندان کو آلِ شنسب بھی کہا جاتا ہے۔

غوریوں کا عروج

۱۰۱۰ء میں محمود غزنوی نے غور کے علاقے پر حملہ کر کے غوریوں کو خراج دینے پر مجبور کر دیا۔ اس واقعے کے بعد قریباً ایک صدی تک غوریوں نے غزنویوں کی اطاعت کرنے اور انہیں خراج دینے کو روا رکھا۔ اسی دوران میں غزنویوں اور سلجوقی ترکوں کی چپقلش نے طول کھینچا۔ اِن دونوں کو برسرِ پیکار پا کر غوریوں نے موقعہ کو غنیمت جانا اور اپنے آپ کو خوب مستحکم کر لیا۔ بہرام شاہ غزنوی کے زمانے میں غزنویوں اور غوریوں کے تعلقات میں مزید استواری آئی۔ یہاں تک کہ بہرام شاہ نے غوری شہزادے قطب الدین سے اپنی بیٹی کی شادی بھی کر دی۔ قطب الدین کو اِس کے باپ (عزالدین حسین) نے کوہِ فیروز کا حاکم مقرر کیا ہوا تھا۔ اسکے والد کی وفات کے بعد اس کا بھائی سیف الدّین خاندان کا سربراہ بنا جس کے ڈر سے قطب الدّین اپنے خسر کے پاس غزنی چلا آیا۔ یہاں میاں بیوی کے مابین ناچاکی اور بدظنی نے جنم لیا، جس کی وجہ سے بہرام شاہ نے قطب الدّین کو نظر بند کر دیا اور کچھ عرصہ بعد اُسے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ سیف الدّین غوری کو اپنے بھائی کی ہلاکت کا علم ہوا، تو اس نے غزنہ پر ہلّہ بول دیا۔ بہرام شاہ دم دبا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس کے بعد سیف الدین کو غزنہ کا سلطان تسلیم کر لیا گیا مگر بہت جلد بہرام شاہ اِدھر اُدھر سے فوجیں فراہم کر کے غزنہ پر حملہ آور ہوا اور دوبارہ اس پر قبضہ کر لیا۔ سیف الدّین کو شکست ہوئی۔ بہرام شاہ نے اسے بازاروں میں بُری طرح رسوا کیا۔ اور بے حد ایذا رسانی کے بعد اُسے قتل کر دیا۔

سیف الدّین کے قتل کا سُن کر اس کا چھوٹا بھائی علاء الدّین جو تاریخ میں ''جہاں سوز'' کے نام سے مشہور ہے، نے اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے لئے غزنہ پر حملہ کیا اور بہرام شاہ غزنوی کو شکست فاش دے کر پنجاب کی طرف بھگا دیا۔ علاء الدّین اِس قدر غضبناک تھا کہ اس نے مسلسل کئی دنوں تک غزنہ میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا اور غزنہ کے خوبصورت محلّات اور باغات کو کھنڈروں میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔ یہی

نہیں اُس نے محمود، مسعود اور مودود غزنوی کے سوا باقی تمام غزنوی سلاطین کی قبریں کھدوا کران کی ہڈیوں تک کو جلادیا اور اس طرح اس نے آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کیا۔

علاء الدّین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا حکمران ہوا مگر ۱۱۷۳ء میں اس کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب غوری خاندان کی سربراہی غیاث الدّین کو ملی، جو علاء الدّین جہاں سوز کا بھتیجا اور بہاء الدّین سام کا بیٹا تھا۔ غیاث الدّین نے اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدّین محمد کو تکیا آباد کے علاقے، جو کابل اور قندھار پر مشتمل تھا، کا حاکم مقرر کیا اور خود اندرونِ ملک اصلاح کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ان دونوں بھائیوں میں اتفاق اور اتحاد کی دولت ارزانی تھی۔ ۵۶۷ء میں دونوں بھائیوں نے غزنہ پر حملہ کر کے اسے دوبارہ اپنی سلطنت مین شامل کیا۔ اس واقعہ کے بعد غیاث الدّین نے غزنہ کی حکومت شہاب الدّین کے سُپرد کی اور خود کوہ فیروز واپس چلا گیا۔

برِّصغیر پر شہاب الدّین محمد غوری کے حملے

سلطان شہاب الدّین محمد غوری کے برّصغیر پر حملوں اور فتوحات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ملتان

شہاب الدّین غوری نے اپنے بھائی غیاث الدّین کے حکم سے ۱۱۷۵ء میں سب سے پہلے قرامطیوں کے گڑھ ملتان پر حملہ کیا۔ ملتان کے قرامطی حکمرانوں نے محصور ہو کر مدافعت کی، لیکن غوری افواج نے چند روز کی سخت یلغار کے بعد قلعہ فتح کر لیا۔ قرامطیوں نے خراج کی ادائیگی کا وعدہ کیا مگر شہاب الدّین محمد غوری نے ان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا اور علی کرماج نامی امیر کو وہاں اپنا نائب مقرر کر دیا۔ اس طرح ملتان غوری سلطنت کا ایک حصّہ بن گیا۔

اُچ

ملتان کی فتح کے بعد شہاب الدّین غوری نے اُچ کا رُخ کیا اور ۱۱۷۶ء میں اس پر حملہ آور ہوا۔ اُچ کے راجا کو غوری کی آمد کا پتا چلا تو قلعہ بند ہو گیا۔ غوریوں نے بڑھ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا، جو کئی ماہ تک جاری رہا، مگر محصورین نے ہتھیار نہ ڈالے۔ محاصرے کو بے نتیجہ دیکھتے ہوئے، بقول فرشتہ غوری نے وہاں کی رانی کے نام اس امر کا خط لکھا کہ اگر تو قلعے کو فتح کرنے میں میرے ساتھ تعاون کرے، تو میں تجھے اپنی ملکہ بنا لوں گا۔ چنانچہ وہ اِس شرط پر رضامند ہو گئی کہ سلطان اس کی بیٹی کو اپنے عقد میں لے لے۔ رانی نے راجا کو زہر دے کر ہلاک کر دیا اور پھر قلعے اور شہر کو غوریوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد شہاب الدّین نے رانی اور اس کی بیٹی کو غزنہ بھجوا دیا، جہاں پہنچنے کے چند دن بعد رانی انتقال کر گئی، پھر اس کے دو سال بعد اس کی بیٹی بھی فوت ہو گئی۔ شہاب الدّین غوری نے اُچ کی

نیابت بھی کرماج کے سپرد کر دی اور خود واپس لوٹ گیا۔

سندھ اور گجرات کاٹھیاواڑ

شہاب الدّین محمد غوری نے ۱۱۷۸ء میں وادیٔ سندھ کے زیریں علاقے پر حملہ کیا۔ اس کے بعد جنوبی حصوں کو فتح کیا اور اپنی سلطنت کو ساحلِ سمندر تک وسعت دی۔ اس کے بعد کچھ کے راستے گجرات کاٹھیاواڑ کی طرف متوجہ ہوا۔ انہلواڑہ کے راجا مول راج، جسے فرشتہ نے بھیم دیو لکھا ہے، نے بڑی سخت معرکہ آرائی کے بعد غوریوں کو شکست دی۔ شہاب الدّین محمد غوری بچ بچا کر غزنہ کو بھاگ نکلا۔ اس معرکے میں غوری افواج کو بے حد جانی نقصان اٹھانا پڑا۔

پشاور

راجا مول راج کے مقابلے میں ناکامی کے بعد شہاب الدّین محمد غوری نے اپنی مہمات کا رخ بدل دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ملتان اور اُچ پر قبضہ کر لینے کے باوجود وہ اس وقت تک لاہور کو فتح نہیں کر سکے گا جب تک کہ اس کا قبضہ پشاور پر نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ اُس نے ۱۱۷۹ء میں پشاور پر فوج کشی کی اور غزنویوں پر غلبہ حاصل کیا۔ آخر غزنوی حکمران نے صلح کی درخواست کی جسے سلطان نے قبول کر لیا۔ اس نے پشاور کو اپنی فوجی چھاؤنی کی حیثیت دی اور پھر لاہور کی تسخیر کے لئے منصوبے بنانے لگا۔

لاہور

پشاور کے بعد شہاب الدّین محمد غوری نے ۱۱۸۰ء میں لاہور پر حملہ کیا۔ سلطان خسرو ملک مقابلے کی تاب نہ لا کر قلعہ بند ہو گیا، لیکن غوریوں کے سخت محاصرے سے عاجز آ کر اس نے صلح کی درخواست کی، جسے منظور کر لیا گیا۔ خسرو ملک نے سالانہ خراج باقاعدگی سے ادا کرنے کا وعدہ کیا اور یرغمال کے طور پر اپنا چار سالہ بیٹا ملک شاہ سلطان کے حوالے کیا، جسے سلطان ہمراہ لے کر غزنہ چلا گیا مگر تین سال بعد خسرو ملک نے خراج

دینا بند کر دیا۔ اس لئے ۱۱۸۴ء میں سلطان نے ایک بار پھر پنجاب کا رخ کیا اور سیالکوٹ کو فتح کر کے وہاں ایک فوجی چھاؤنی قائم کی۔ یہاں اس نے حسین خرمیلی کو اپنا نائب مقرر کیا۔ ساز و سامان کی کمی کے باعث وہاں سے سلطان کو واپس جانا پڑا تاکہ لاہور پر حملے کے لئے مزید طاقت فراہم کر سکے۔ جونہی سلطان واپس لوٹا، خسرو ملک نے گکھڑوں کے ساتھ مل کر سیالکوٹ پر حملہ کر دیا، لیکن اسے ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ جب اس واقعہ کی خبر شہاب الدّین محمد غوری کو ملی، تو اس کی سرکوبی کے لئے ۱۱۸۶ء میں لاہور پر دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اس حملے میں اس کے ساتھ بائیس ہزار سواروں پر مشتمل فوج تھی۔ اس معرکے میں شہاب الدّین محمد غوری نے ایک سیاسی چال چلی اور وہ اس طرح کہ اس نے خسرو ملک کو صلح کا پیغام بھیجا اور اس کے بیٹے ملک شاہ کو رہا کر دیا۔ غوری کے اس رویّے کو دیکھ کر خسرو ملک قلعے سے باہر نکلا۔ غوری نے اُسے گھیر لیا اور گرفتار کر کے اپنے بھائی غیاث الدّین کے پاس کوہ فیروز بھجوا دیا۔ جہاں ۱۱۹۲ء میں خوارزم شاہ کے ساتھ مل کر بغاوت کرنے کے الزام میں اسے قتل کروا دیا گیا۔ چنانچہ اس واقعہ کے ساتھ ہی غزنوی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ شہاب الدّین محمد غوری نے علی کرماج ہی کو لاہور کا بھی گورنر مقرر کیا اور خود واپس غزنہ چلا گیا۔

ترائن کی پہلی لڑائی

ان دنوں اسلامی سلطنت کی حدود سرہند، ہانسی اور سرسہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن شہاب الدّین محمد غوری کی واپسی کے بعد دہلی اور اجمیر کے راجا پرتھوی راج نے مذکورہ علاقوں کے مسلمان حکمرانوں کو شکست دے کر، ان علاقوں کو اپنی حکمرانی کی حدود میں شامل کر لیا۔ جب یہ اطلاع شہاب الدّین غوری کو ملی، تو اس نے ایک بار پھر پنجاب پر حملہ کر دیا۔ سرہند فوجی نقطۂ نگاہ سے ایک اہم فوجی چھاؤنی تھی۔ اس کا ہندوؤں کے زیرِ نگیں رہنا اسلامی سلطنت اور حکومت کے لئے خطرے سے خالی نہ تھا۔ ادھر پرتھوی راج سرہند کے قلعے کو اپنی فوجی سرگرمیوں کا محور بنا کر جالندھر دوآب اور اسلامی علاقوں پر

قابض ہونے کی سوچ رہا تھا۔ لہٰذا دفاعی مصلحتوں اور مذکورہ صورت حال سے نپٹنے کے لئے سرہند کو اسلامی سلطنت میں شامل کرنا ازحد ضروری تھا۔ چنانچہ غوری نے ۱۱۹۰ء میں سرہند پر قبضہ کرلیا اور اپنے ایک امیر ضیاء الدّین تو لک کو سرہند کا حکمران مقرر کر کے لاہور سے ہوتا ہوا غزنہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ مگر وہ ابھی راستے میں ہی تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ دہلی کا راجا پرتھوی راج ایک ٹڈی دل لشکر کے ساتھ اسلامی علاقوں پر حملہ کرنے کی فکر میں ہے۔ دراصل سرہند کا دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلا جانا، پرتھوی راج کو بُری طرح کھٹکتا تھا۔ اس شہر کی فوجی اہمیت کے پیشِ نظر وہ بھی اِس شہر کو واپس لینا ضروری سمجھتا تھا۔ اِس لئے وہ اپنی اور اپنے باتحت راجاؤں کی دو لاکھ تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل افواج سے سرہند پر حملہ کرنے کے لئے بھٹنڈہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ شہاب الدّین محمد غوری کے ہمراہ اس وقت صرف چودہ ہزار سپاہی تھے۔ حالات کے پیشِ نظر اس نے اسی تعداد کے ساتھ پرتھوی راج کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ وہ وہیں سے پلٹا اور دریائے سرسوتی کے کنارے ترائن (تراوڑی) کے میدان میں جا ڈٹا، جہاں دونوں افواج کے درمیان ۱۱۹۱ء میں گھمسان کا رن پڑا۔ راجپوتوں نے ایک شدید حملہ کر کے غوری افواج کے میمنہ اور میسرہ کو منتشر کر کے رکھ دیا۔ شہاب الدین محمد غوری خود قلب میں تھا، جسے اس نے قابو میں رکھا۔ وہ بڑھ بڑھ کے جوہر شمشیر زنی دکھا رہا تھا کہ پرتھوی راج کے چھوٹے بھائی کھانڈے راؤ نے اُسے دیکھ لیا۔ اس نے اسی وقت اپنا ہاتھ سلطان کے گھوڑے کی جانب بڑھایا۔ جونہی اس کا ہاتھی قریب ہوا۔ سلطان کے گھوڑے نے اپنے اگلے پاؤں اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ سلطان نے اپنا نیزہ اُسے دے مارا جس سے اس کے سامنے کے دانت ٹوٹ گئے۔ اُدھر اس نے بھی تلوار سے سلطان پر وار کیا، جس سے سلطان کے بازو پر گہرا زخم آ گیا۔ یہ دیکھتے ہی ایک خلجی سپاہی اُچھل کر سلطان کے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور برق رفتاری سے سلطان کو میدانِ جنگ سے باہر نکال کے لاہور پہنچا دیا۔ غوری افواج نے جب اپنے سلطان کو اپنے اندر نہ پایا، تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے، نتیجۂ انہیں شکست کا مُنہ دیکھنا پڑا اور پرتھوی راج نے سرہند پر پھر سے قبضہ کرلیا۔

سلطان شہاب الدین محمد غوری نے چند ہفتے لاہور میں قیام کیا۔ پھر جب وہ صحت یاب ہو گیا تو اپنے گورنر علی کرماج کو ضروری ہدایات دینے کے بعد غزنہ چلا گیا۔

ترائن کی دوسری لڑائی

شہاب الدین غوری کو اس ہزیمت کا بہت رنج تھا۔ اس نے بدلہ لینے کا عزم مصمم کیا اور بغیر کوئی لمحہ ضائع کئے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے سب سے پہلے اپنے ان افسروں کی تادیب کی، جو میدان میں ثابت قدمی کا ثبوت نہ دے سکے۔ اس نے غزنہ کے بازاروں میں ان تمام کی تشہیر کی اور وہ بھی اس طرح کہ ان کے منہ سے جو بھرے توبرے باندھے دیئے اور حکم دیا کہ جو اپنے حصے کے جَو نہ کھائے، اسے قتل کر دیا جائے۔ خود سلطان نے اپنے اوپر آرام حرام کر لیا۔ تقریباً سال بھر حرام سرا میں نہ گیا اور نہ ہی لباس تبدیل کیا۔ اس نے مسلسل ایک سال ان تیاریوں میں گزارا۔

۱۱۹۲ء میں وہ ایک لاکھ ستر ہزار ترکی، افغانی اور خلجی سپاہیوں کا جرار لشکر لے کر غزنہ سے روانہ ہوا، لیکن اس نے اپنے امراء کو اپنے ارادے سے مطلق آگاہ نہ کیا۔ راستے میں ایک منظورِ نظر امیر نے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا، تو سلطان نے اسے کہا، ہندوؤں سے گزشتہ برس کی شکست کا انتقام لینے کا ارادہ ہے۔ اس امیر نے درخواست کی، آپ اگر ان تمام امراء کو معاف کر دیں جو سال بھر سے عتاب کی زد میں ہیں اور انہیں اعتماد میں لیں، تو آپ کی اس عنایت سے پچھلی کدورتیں دور ہو جائیں گی اور یہ امراء اگلے معرکے میں آپ کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔ سلطان نے اس امیر کی بات مان لی۔ دربار منعقد کیا اور تمام معتوب امراء کو خلعت عطا کرنے کے بعد انہیں تنبیہ کی کہ آئندہ اس غلطی کا اعادہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس پر ان لوگوں نے بھی وفاداری کا عہد کیا۔

شہاب الدین پہلے ملتان پہنچا، پھر وہاں سے لاہور آیا۔ لاہور سے اس نے اپنے ایک معتمد قوام الملک رکن الدین حمزہ کو اجمیر بھیجا تاکہ رائے پتھورا کو اطاعت کے لئے آمادہ کر سکے، لیکن رائے پتھورا نے سلطان کے سفیر کے ساتھ انتہائی توہین آمیز

سلوک کیا۔ اُدھر تمام ہندو راجوں کو دھرم کے نام پر اپنی اعانت کے لئے بلا بھیجا، اس کے بلانے پر ڈیڑھ سو راجے اپنے اپنے لشکر کے ہمراہ ترائن کے میدان میں آ گئے۔ چونکہ یہ لوگ ایک مرتبہ سلطان شہاب الدّین کو شکست دے چکے تھے، اس لئے ان کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف سلطان بھی اِس میدان میں آ کر خیمہ زن ہو گیا۔

ہندو لشکر کی جانب سے سلطان کو ایک خط بھیجا گیا، جس میں کہا گیا تھا کہ اگر اپنی اور اپنے لشکر کی عافیت چاہتے ہو تو واپس ہو جاؤ۔ ہم تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے، لیکن اگر تم نے جنگ کا راستہ اختیار کیا، تو تباہی یقیناً تمہارے حصے میں آئے گی۔ شہاب الدّین نے اس کا جواب اِس طرح دیا کہ میں از خود کوئی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ اگر تم لوگ مجھے مہلت دو تاکہ میں اِس ضمن میں اپنے بھائی سے نئی ہدایات لے سکوں کیونکہ میرا بھائی ہی کلی اختیارات کا مالک ہے، میں تو بس اس کا فرستادہ ہوں۔

ہندوؤں نے سلطان کی اِس بات کا یہ مفہوم لیا کہ واقعی سلطان ہماری قوت سے خائف ہے۔ چنانچہ وہ قدرے غافل ہو گئے۔ اُدھر سلطان نے راتوں رات لشکر کی صف بندی کر کے علی الصبح دشمن پر حملہ کر دیا۔ اس نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ اور حکم دیا کہ ہر حصہ باری باری جنگ کرے تاکہ سپاہیوں کو تھکان دُور کرنے کا موقع مل سکے۔ خود سلطان نے بارہ ہزار منتخب سواروں کا ایک دستہ، محفوظ کے طور پر اپنے ساتھ رکھا تاکہ ضرورت کے وقت اسے بروئے کار لا سکے۔

ہندو اس وقت حملے کی توقع نہیں کر رہے تھے، اس لئے جب حملہ ہوا، تو انہیں سنبھلنے میں کافی وقت لگا۔ اس افراتفری سے اسلامی لشکر نے پورا فائدہ اٹھایا۔ فوج کے چاروں دستے باری باری جنگ کرتے رہے۔ عصر کے وقت ہندوؤں کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ اس مرحلے پر سلطان اپنے محفوظ دستے کو میدان میں لے آیا، جس نے جنگ کا فیصلہ کر دیا۔ راجا کا بھائی کھانڈے راؤ اور دیگر نامور راجپوت سردار ہزاروں سپاہیوں کے ساتھ قتل ہو گئے۔ رائے پتھورا میدانِ جنگ سے مُنہ موڑ گیا، لیکن تھوڑے ہی فاصلے تک گیا تھا کہ افغان سپاہیوں کے ہتھے چڑھ گیا، جنہوں نے اسے قتل کر دیا۔ بعض روایات کے

مطابق اسے سلطان کی خدمت میں لایا گیا، جہاں اُسے قتل کر دیا گیا۔

پاک و ہند کی حدود میں سلطان شہاب الدین کی یہ آٹھویں یلغار تھی۔ اِس جنگ کے نتیجے میں ہانسی، سمانہ اور کہرام کے مشہور قلعوں پر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔ سلطان اجمیر گیا۔ رائے پتھورا کے بیٹے راجا کولہ نے باجگزاری قبول کی۔ وہاں سے سلطان نے دہلی پر چڑھائی کی۔ دہلی کے راجا نے بھی جنگ کی بجائے اطاعت کو بہتر جانا۔ سلطان نے یہ مفتوحہ علاقے اپنے نامور غلام ملک قطب الدین ایبک کے سپرد کئے اور خود غزنہ کی طرف مراجعت کی۔ اس کے بعد قطب الدین ایبک نے میرٹھ اور دہلی کو بھی اسی سال اپنی حدود میں شامل کر لیا۔ اگلے سال اس نے اپنی فتوحات کا دائرہ کول (علی گڑھ) تک وسیع کر لیا۔ پھر ایک گوالیار، بدایوں کو تاراج کرتا ہوا گجرات پہنچ گیا اور وہاں کے راجا بھیم دیو سے شہاب الدین کی شکست کا بدلہ لیا۔ کول کی فتح کے بعد قطب الدین ایبک نے اپنا مستقر دہلی کو بنا لیا، یعنی اب دہلی ہندوستان کے اسلامی فتوحات کا صدر مقام تھا۔

قنوج کی تسخیر

۱۱۹۴ء میں سلطان شہاب الدین محمد غوری ایک بار پھر ہندوستان آیا۔ اب اس کی منزل قنوج تھی، کیونکہ اگرچہ ہندو قوت کا بیشتر حصہ ترائن کی دوسری جنگ میں مفلوج ہو چکا تھا، لیکن قنوج اور بنارس ابھی بھی ہندو طاقت کے مضبوط گڑھے تھے، جو مسلم اقتدار کے لئے ایک مسلسل خطرہ بنے ہوئے تھے۔ مکمل استحکام حاصل کرنے کے لئے ان کا وجود ختم کرنا بہت ضروری تھا۔ قنوج کے راجا جے چند نے دو سو سے زائد ہاتھیوں کے ساتھ مقابلہ کیا۔ چندواڑہ اور اٹاوہ کے نواح میں میدانِ جنگ بنا۔ لیکن سلطان کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کے ہراول دستے کے سردار قطب الدّین ایبک نے جے چند کو شکست دے دی، جے چند میدانِ جنگ سے بھاگ بھی نہ سکا۔ بے اندازہ مالِ غنیمت کے علاوہ تین سو جنگی ہاتھی بھی سلطان کے ہاتھ لگے۔ قنوج کے بعد سلطان نے بنارس کو زیرِ نگیں کیا۔ اس طرح ہندو مت کا گڑھ بھی ہندوؤں کے قبضے سے نکل گیا۔ اِن تمام علاقوں پر قطب الدّین ایبک کو اپنا

نائب مقرر کر کے سلطان واپس غزنہ چلا گیا۔

۱۲۰۳ء میں سلطان شہاب الدّین نے خوارزم پر حملہ کیا، لیکن اِس مہم میں اسے بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بمشکل جان بچا کر غزنہ پہنچا۔ اسی اثناء میں وہاں کا نائب ایلدگز باغی ہو چکا تھا۔ وہاں سے سلطان ملتان پہنچا تو یہاں بھی اس کا نائب بدعہد ہو چکا تھا۔ مگر اب شہاب الدّین قدرے سنبھل چکا تھا۔ چنانچہ اس نے ملتان پر حملہ کر کے فتح کر لیا اور کافی فوج جمع کر کے دوبارہ غزنہ کا رخ کیا۔ ایلدگز یہ صورتِ حال دیکھ کر معافی کا خواستگار ہوا۔ سلطان نے ازراہِ ترحم اسے معاف کر دیا اور اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے میں مشغول ہو گیا۔

گکھڑوں کی شورش

اسی دوران میں پنجاب میں گکھڑ قبائل نے سر اٹھایا۔ انہوں نے عام زندگی کو معطل کر کے رکھ دیا۔ راستے غیر محفوظ ہو گئے اور ہر طرف لوٹ مار اور غارتگری کا بازار گرم ہو گیا۔ ان باغیوں نے لاہور پر حملہ کیا، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ سلطان کو ان کے متعلق شکایت پہنچی۔ چنانچہ جب شہاب الدّین دوسری الجھنوں سے فارغ ہوا تو اس نے گکھڑوں کی طرف توجہ کی۔ قطب الدین ایبک بھی اپنی قوت کے ساتھ ہمرکاب ہو گیا۔ گکھڑوں کے خلاف یہ مہم بہت کامیاب رہی۔ ان کی طاقت پاش پاش ہو گئی۔ بے شمار قتل ہو گئے یا قید کر لئے گئے۔ باقی ماندہ پہاڑوں اور جنگلوں میں جا چھپے۔ ان کی بیخ کنی کے بعد سلطان لاہور آیا۔ جہاں ایک شاندار جشن منایا گیا۔ اس جشن میں سلطان نے قطب الدّین ایبک کو ہندوستان میں اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ کچھ دن بعد ایبک دہلی چلا گیا اور شہاب الدّین غزنہ۔

اس دوران میں گکھڑ قبائل میں اسلام کی تبلیغ کی گئی اور ان کی بہت بڑی تعداد مسلمان ہو گئی، لیکن ان میں بعض کے دل میں اب بھی سلطان کے خلاف بہت نفرت تھی۔ وہ بہرحال اپنے منتقمانہ جذبات کی تسکین چاہتے تھے اور اسی غرض سے یہ گروہ سلطان کی

فوج میں شامل ہو گیا تھا تاکہ کسی طرح موقعہ پا کر وہ اپنے عزائم کو تکمیل دے سکیں۔ اس کے لئے انہیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ سلطان اپنی مہم سے فارغ ہو کر غزنہ جانے کے لئے دریائے سندھ کے کنارے روہتک کے مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا کہ محافظوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر چند گکھڑ سلطان کے خیمے میں گھس آئے اور قبل اس کے کہ محافظ خبردار ہوتے انہوں نے سلطان پر حملہ کر کے شہید کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۵ جون ۱۲۰۵ء کو پیش آیا۔ بعض مؤرخین قاتلوں کو قرامطی قرار دیتے ہیں۔

شخصیّت اور کردار

شہاب الدین محمد غوری کو برصغیر کی تاریخ اور خاص کر اسلامی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اسے برصغیر میں اسلامی سلطنت کا بانی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ۱۱۹۲ء کی جنگِ ترائن میں یہاں کے راجپوت راجاؤں کو شکستِ فاش دے کر اس نے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا اور یہاں مستحکم بنیادوں پر اسلامی حکومت استوار کی، جو صدیوں تک بڑے تزک و احتشام سے اپنی عظیم روایات سے قائم رہی۔

شہاب الدّین محمد غوری ایک رحمدل، انصاف پسند، خدا ترس اور مستقل مزاج انسان تھا۔ وہ اہلِ علم و قلم، فقراء اور اولیاء اللہ کی مجالس میں بیٹھنا اور ان سے فیض حاصل کرنا اپنے لئے باعثِ سعادت خیال کرتا تھا۔ وہ اِن لوگوں کی عزت و تکریم کو رحمتِ خداوندی کا باعث سمجھتا تھا۔ حرص اور خود غرضی سے نفرت کرتا تھا اور دنیاوی شان و شوکت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک فرمانبردار قسم کا آدمی تھا۔ اسی لئے اپنے بھائی غیاث الدینؒ کا حکم ماننے میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ترائن کی دوسری لڑائی کے موقع پر اس نے پرتھوی راج کو خط لکھا، تو اپنے آپ کو اپنے بھائی کے ملازم کی حیثیت سے ظاہر کیا۔ بقول شیخ اکرام اس نے اپنے بھائی کا بھرم اس حد تک برقرار رکھا کہ قطب مینار دہلی پر جو نام کندہ کرائے، ان میں سب سے پہلے غیاث الدّین کا نام لکھوایا۔ تاریخ میں ان جیسے باہمی اتحاد و اتفاق کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ اُس نے تمام معاہدے اپنے بھائی کے نام سے کئے۔

غیاث الدین کی وفات کے بعد اس نے اپنے بھائی کے رشتے داروں اور بچوں کو ان کے حق سے زیادہ دیا اور اس کی اولاد کو اپنی اولاد سے بڑھ کر جانا۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ غوری نے ایسی مضبوط بنیادوں پر کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ محمود غزنوی جیسے ناقابلِ شکست جرنیل بھی نہ دے سکے۔ وہ محمود غزنوی سے عظیم تر سپہ سالار تھا۔ اپنی مستقل مزاجی کی بدولت اس نے ناکامیوں کو عظیم کامیابیوں کی صورت میں بدل کر رکھ دیا۔ وہ مایوس ہو کر بیٹھ رہنا پسند نہیں کرتا تھا اور مشکلات کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کرنا جانتا تھا۔

سلطان شہاب الدین محمد غوری بڑا مردم شناس بھی تھا۔ اس کے تربیت یافتہ غلاموں میں ناصر الدین قباچہ، تاج الدین یلدوز اور قطب الدین ایبک جیسے عظیم اور باتدبیر جرنیلوں کے نام آتے ہیں، جنہوں نے اس کے نام کے ساتھ ساتھ تاریخ اسلام کو بھی چار چاند لگا دیئے۔ اس نے اپنے غلاموں کو ہمیشہ اپنی اولاد متصوّر کیا اور ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ وہ اپنے درباریوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ جنہیں تم غلام کہتے ہو، وہ میرے بیٹے ہیں۔ ایک مرتبہ جب تاج الدین یلدوز نے بغاوت کا راستہ اختیار کیا، تو سلطان نے اُس پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد سزا دینے کی بجائے اُسے معاف کر دیا۔

الغرض سلطان شہاب الدین محمد غوری کا نام تاریخِ اسلام اور تاریخِ پاکستان و ہند کے حکمرانوں میں ہمیشہ سرِ فہرست رہے گا اور اس کی گوناگوں خوبیوں کی بدولت اسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔

خاندانِ غلاماں

۱۲۰۶ء تا ۱۲۹۰ء

اسلام معاشرتی امتیازات کے تصور کو ختم کرتا ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجِ آخر کے موقعہ پر اس تصور کو مکمل وضاحت سے بیان فرمایا تھا کہ اللہ کے ہاں سب انسان برابر ہیں۔ اگر کسی کو کسی پر فوقیت ہے بھی تو محض ''تقوے'' کی بنا پر۔ اسلام سے قبل معاشرتی زندگی میں غلاموں کو کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ اور ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاشرتی برائی کو ختم کرنے کا عزم کیا اور بالآخر آقا و غلام، عربی و عجمی اور گورے و کالے کی اِس غیر مہذب تقسیم کو ختم کر دیا۔ حضرت عمار یاسر رضی اللہ عنہ، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل تاریخِ تہذیب کا روشن ترین باب ہے۔

شہاب الدین محمد غوری اولادِ نرینہ سے محروم تھا۔ ایک بار اس کے بعض امراء نے اس کی توجہ اس پہلو کی جانب دلا کر اظہارِ تشویش کیا تو اس نے جواب دیا کہ اگر میرے دو چار بیٹے ہوتے بھی تو کیا تھا جبکہ میرے سینکڑوں فرزند موجود ہیں۔ یہاں اسکا اشارہ ان غلاموں کی طرف تھا جن کی پرورش اور تربیت اس نے اپنی ذاتی نگرانی میں کی تھی۔ اور جن کی نجابت، شجاعت اور فراست پر اسے مکمل اعتماد تھا۔ اور جو اس کی زندگی ہی میں کئی اہم کارنامے سرانجام دے چکے تھے۔

شہاب الدین محمد غوری کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا سلطان محمود بن غیاث الدین تخت نشین ہوا۔ اس وقت قطب الدین ایبک جو برصغیر میں نائب السلطنت تھا، نے خود مختار حیثیت اختیار کر کے ایک منفرد المثال سلسلۂ سلاطین کی ابتداء کی جو تاریخ پاک و

ہند میں خاندانِ غلامان کے نام سے مشہور ہے۔ اس سلسلے کے تمام بادشاہ یا تو غلام تھے یا غلام زادے۔ قطب الدین ایبک سلطان محمد غوری کا غلام تھا۔ ایبک کے بعد اس کا بیٹا آرام شاہ بادشاہ بنا، وہ تو غلام ابنِ غلام ہوا۔ اس کے بعد شمس الدین التمش تخت نشین ہوا جو ایبک کا غلام تھا۔ رضیہ سلطانہ اور اس کے بھائی رکن الدین فیروز، بہرام، ناصر الدین محمود التمش کی اولاد ہونے کے باعث غلام زادے ہوئے۔ علاء الدین مسعود، التمش کا پوتا تھا۔ غیاث الدین بلبن التمش کا غلام تھا۔ بلبن کے بعد اس کا پوتا کیقباد سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس تفصیل سے اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ اس سلسلے کے تمام بادشاہ یا تو غلام رہ چکے تھے یا غلاموں کی اولاد تھے۔ وقت کا دھارا ان کے موافق نہ تھا۔ اس لئے یہ کئی بار بکے اور خریدے گئے۔ حالانکہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام بادشاہ جن کی زندگی کی ابتداء غلام کی حیثیت سے ہوئی، انتہائی شریف و نجیب گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر غلام ہونے کے باوجود آقاؤں کی نظر التفات اور اپنی فطری جسمانی اور دماغی استعداد کے باعث وہ تاریخ میں اپنا مقام پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوئے۔ مسلمان آقاؤں کا اپنے غلاموں کے ساتھ اس طرح حسنِ سلوک سے پیش آنا اور مسلمان معاشرے کا ان غلاموں کو بحیثیت بادشاہ کے قبول کرنا، جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک بے نظیر عملی مظاہرہ ہے۔

قطب الدین ایبک، (۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء)

برصغیر کا پہلا مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک ترکی میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں غلام کی حیثیت سے فروخت ہوا۔ مالک مہربان تھا جس نے اس کی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا اور اس کے لئے تعلیم و تربیت کا بہت اچھا اہتمام کیا۔ فن سپہ گری میں بھی اس نے مہارت حاصل کی۔۔۔ بعد ازاں گردشِ دوراں اسے سلطان شہاب الدین غوری کے پاس لے گئی۔ سلطان کے ہاں اس کے جوہر کھلے اور اس نے ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع

کیں۔شہاب الدین کی ہمراہی میں اس نے بہادری کے کئی کارنامے سرانجام دیئے اور بہت سے مشکل مراحل پر وہ سلطان کے کام آیا۔ برصغیر کے تمام معرکوں میں وہ سلطان کے ہمرکاب رہا۔ بالآخر سلطان اس کی خدمات کا دل سے معترف ہو گیا اور اس نے ایبک کو مقبوضہ ہند میں اپنا نائب مقرر کر کے ادھوری فتوحات کو مکمل کرنے کا حکم دیا۔ ایبک نے یہ فرض بحسن وخوبی پورا کیا۔ مقبوضات کا انتظام بہتر بنایا۔ رعایا کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ اسی وجہ سے بعد میں عوام نے اسے بحیثیت بادشاہ قبول کرنے میں پس وپیش نہ کیا۔

نائب السلطنت بننے کے فوراً بعد اس نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۱۹۲ء میں اس نے ہانسی کی بغاوت کو فرد کیا۔ میرٹھ اور بلند شہر فتح کرنے کے بعد اس نے ۱۱۹۳ء میں دہلی کو بھی فتح کر لیا۔ اور کہرام کے بجائے دہلی کو اپنا مستقر بنایا۔ چندواڑہ فتح کیا۔ ۱۱۹۴ء میں پرانے حریف پرتھوی راج کے بھائی کی بغاوت فرد کی۔ ۱۱۹۶ء میں پرتھوی راج کے بیٹے کا بھڑکایا ہوا شعلۂ بغاوت سرد کیا۔ ۱۱۹۷ء میں بھیم دیو والئی گجرات کو شکست دے کر اپنے آقا کا بدلہ چکایا۔ تھنگر، گوالیار اور بدایوں کی فتح نے سلطنتِ دہلی کے استحکام میں اضافہ کیا۔ ۱۲۰۲ء میں کالنجر کا قلعہ محاصرے کے بعد فتح ہوا۔ اس مہم میں قطب الدین ایبک کے ہمراہ اس کا غلام شمس الدین التمش بھی تھا۔ ایبک کے ایک بہادر جرنیل بختیار خلجی نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بنگال اور بہار پر قبضہ کر کے سلطان محمد غوری کے ادھورے کام کو مکمل کیا۔

۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو سلطان محمد غوری کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک متوقع انتشار کو روکنے کے لئے برصغیر کی طرف روانہ ہوا۔ وہ جون ۱۲۰۶ء میں لاہور پہنچا جہاں شہریوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ دوسرے ہی دن اس کی تاج پوشی ہوئی۔ امراء اور عوام نے اسے بادشاہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ دو سال تک وہ ''ملک'' ہی کہلاتا رہا مگر ۱۲۰۸ء میں سلطان محمود بن غیاث الدین نے نہ صرف اُسے آزاد کر دیا بلکہ شاہی علامات ''چتر'' اور ''دورباش'' بھیج کر اس کی خودمختار حیثیت پر مہر توثیق ثبت کر دی۔ اِس طرح قطب الدین ایبک کو برصغیر کا پہلا مسلمان فرمانروا ہونے کا اعزاز مل گیا۔

سلطان شہاب الدین محمد غوری کا ایک دوسرا قابل غلام تاج الدین یلدوز غزنی کا گورنر تھا۔ وہ قطب الدین سے جلتا تھا اور اسے ہٹا کر خود برصغیر میں سلطان کا جانشین بننا چاہتا تھا۔ اس نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کی اطلاع ملنے پر ایبک دہلی سے روانہ ہوا۔ لاہور کے قریب جنگ میں شکست کھانے کے بعد یلدوز غزنی کی طرف بھاگ گیا۔ قطب الدین ایبک نے لاہور کے علاقے پر دوبارہ قبضہ حاصل کرنے کے بعد غزنی تک اس کا پیچھا کیا۔ مگر یلدوز نے جلد ہی اپنی طاقت مجتمع کر کے اسے غزنی سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اِس کے بعد ایبک لاہور ہی میں مقیم رہا۔ تاکہ اگر یلدوز پھر یلغار کرے تو اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔ مگر پھر یلدوز کو ہمت نہ پڑی۔ بعد میں ایبک نے یلدوز کی بیٹی سے شادی کر کے اپنی اس سرحد کو محفوظ بنا لیا۔

ایبک نے اپنی سلطنت کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے اپنی ایک بیٹی کی شادی حاکم ملتان ناصر الدین قباچہ سے اور دوسری کی اپنے غلام شمس الدین التتمش سے کر دی جو طبقۂ امراء میں سرکردہ حیثیت کا مالک تھا۔ بعد ازاں بنگال کا حاکم علی مردان بھی اس کا باجگزار بن گیا۔

ایبک صرف چار سال حکومت کرنے کے بعد چار نومبر ۱۲۱۰ء کو لاہور میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گرا اور فوت ہو گیا۔ لاہور ہی میں دفن ہوا۔ شمس الدین التتمش جب پہلی بار بادشاہ کی حیثیت سے لاہور آیا تو اس نے قطب الدین ایبک کی قبر پر ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا جو امتدادِ زمانہ سے بالکل ختم ہو گیا۔ آج کل پھر اس پر ایک مقبرہ تعمیر کیا جا رہا ہے۔

ایبک ایک بہادر جرنیل اور قابل منتظم تھا۔ عوام کی فلاح و بہبود کا بہت خیال رکھتا تھا نظم و نسق کی بحالی کے لئے اس نے خاص اقدامات کئے۔ عدل و انصاف کا اہتمام بہت اعلیٰ تھا۔ اس کے عہدۂ انتظام کی وجہ سے چوریاں ڈاکے ختم ہو گئے۔ حالات و واقعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کے بارے میں یہ تبصرہ بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ ''اس کے عہد میں شیر بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔''

آرام شاہ، (۱۲۱۰ء تا ۱۲۱۱ء)

قطب الدین ایبک کی ناگہانی وفات کے بعد تخت و تاج سنبھالنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ جس کی وجہ سے مملکت میں انتشار کی صورت پیدا ہو گئی۔ ایسے وقت میں امراء نے اس کے بیٹے آرام شاہ کو لاہور میں ہی تخت نشین کر دیا۔ لیکن دہلی کے اکثر امراء اور عوام نے اسے بحیثیت بادشاہ قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ لوگ اسے نااہل سمجھتے تھے۔ سیاسی بدنظمی کی وجہ سے اُچ کے حاکم ناصر الدین قباچہ اور بنگال کے حاکم علی مردان نے مرکز سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس پر بعض امراء نے بدایوں کے گورنر شمس الدین التمش کو حکومت سنبھالنے کی دعوت دی۔ التمش ایک آزمودہ جرنیل اور قابل منتظم تھا۔ التمش جب تخت پر قبضہ کرنے کے لئے دہلی کی جانب روانہ ہوا تو آرام شاہ اِس کا مقابلہ کرنے کے لئے لاہور سے آگے بڑھا۔ دہلی کے قریب جنگ میں آرام شاہ کو شکست ہوئی اور التمش نے ایبک کے جانشین کی حیثیت سے اقتدار سنبھال لیا۔

شمس الدّین التمش، (۱۲۱۱ء تا ۱۲۳۶ء)

شمس الدین التمش ترکی الاصل تھا۔ البری قبیلے کے سردار ایلم خان کا بیٹا حسین و ذہین و فطین ہونے کی وجہ سے بھائیوں کے حسد کا شکار ہو کر بچپن ہی میں غلام کی حیثیت سے فروخت ہوا۔ آخری بار فروخت ہو کر ایبک کے پاس پہنچا۔ التمش نے اپنی صلاحیتوں کے باعث بہت جلد اہمیت حاصل کر لی۔ ایبک اسے بیٹا کہہ کر پکارتا تھا۔ ترقی کے منازل بہت جلد طے کر کے وہ برن، بدایون اور گوالیار کا حاکم مقرر ہوا۔ اس نے پنجاب کے کھوکھروں کے خلاف اپنی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے غلام سے آزاد کا درجہ حاصل کیا اور امرائے چہلگانی کا سربراہ بنا۔

اس تمام عرصے میں اسے حکومت چلانے کا وسیع تجربہ حاصل ہوا۔ جب وہ سربراہِ سلطنت ہوا تو اس کی شہرت ایک بہترین سپاہی اور ماہر امور مملکت کی حیثیت سے ہر طرف پھیل چکی تھی۔ اس لئے اُسے بدایوں سے بلا کر تخت و تاج سنبھالنے کی دعوت دی

گئی۔ کیونکہ لوگ جانتے تھے کہ اس وقت اس سے بڑھ کر کوئی اہل موجود نہیں۔ چنانچہ التتمش نے ۱۲۱۱ء میں دہلی پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

حکومت سنبھالتے ہی التتمش کو مشکلات کے ایک خاصے طویل سلسلے سے دوچار ہونا پڑا۔ دربار دہلی کے بعض امراء اسے غلام سمجھتے ہوئے اس کی اطاعت سے گریزاں تھے۔ بنگال میں علی مردان آمادۂ بغاوت ہوا۔ سندھ کے حکمران ناصرالدین قباچہ نے لاہور پر قبضہ کر کے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ غزنی کا گورنر تاج الدین یلدوز اپنے آپ کو سلطان شہاب الدین غوری کا واحد جانشین سمجھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ التتمش اس کے نائب کی حیثیت سے برصغیر پر حکومت کرے۔ اسی احساس کے تحت اس نے التتمش کے نام کئی احکام بھی صادر کیے۔ راجپوت راجگان بھی مرکز کی اطاعت سے منحرف ہو گئے۔ ان میں سے سب سے بڑی مشکل تاتاری حملے کی صورت میں پیش آئی، لیکن سلطان شمس الدین التتمش نے اپنے تدبر اور فراست سے یکے بعد دیگرے ان تمام مشکلات پر قابو پا لیا اور جب وہ فوت ہوا تو تمام شمالی برصغیر پر اس کی عملداری قائم ہو چکی تھی۔

سب سے پہلے وہ باغی ترک امراء کو جمنا کے گھاٹ پر موت کے گھاٹ اتار کر فتح وظفر سے ہمکنار ہوا۔ اب تاج الدین یلدوز کی باری آئی جو پنجاب پر قابض ہو گیا تھا کیوں کہ غزنی پر جلال الدین خوارزم شاہ اور خوارزم پر چنگیز خاں قابض ہو چکا تھا۔ یہ ۱۲۱۴ء کا واقعہ ہے۔ ۱۲۱۶ء میں التتمش نے ایک طاقتور فوج جمع کر کے ترائن کے مقام پر تاج الدین یلدوز کو شکست دی۔ اسے گرفتار کر کے بدایوں کے قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ اور وہیں وہ اس دنیا سے رخصت ہوا۔

یلدوز کی شکست کے بعد التتمش کی حکومت سے ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا۔ لیکن ابھی اس سے بھی بڑا خطرہ سرحدوں پر منڈلا رہا تھا۔ چنگیز خان، جلال الدین خوارزم شاہ کے تعاقب میں غزنی پہنچا۔ تو وہ وہاں سے پنجاب کی طرف بھاگا۔ چنگیز خاں نے یہاں بھی اس کا پیچھا کیا۔ دریائے سندھ کے کنارے ان کی آخری جنگ ہوئی۔ جلال الدین کی فوجی طاقت بہت کم ہونے کی وجہ سے اسے بہت جلد شکست ہو گئی۔ مگر وہ اپنی کچھ فوج کے ساتھ

دریائے سندھ عبور کرنے میں کامیاب ہوگیا۔جلال الدین خوارزم شاہ نے التمش سے پناہ کی درخواست کی مگر التمش کو جلال الدّین کے دہلی آنے کے لئے مضمرات بخوبی معلوم تھے۔یعنی حملہ تاتار۔جسے برداشت کرنا التمش کی طاقت سے فزوں تر تھا۔چنانچہ اس نے بڑی خوبصورتی سے شہزادہ جلال الدّین کو آب وہوا کے ناموافق ہونے کے بہانے سے ٹال دیا۔اس طرح سلطان نے نوزائیدہ سلطنت دہلی کو ایک بہت بڑے طوفان بلاخیز کی تباہ کاری سے محفوظ کرلیا۔دوسرے تاتاریوں کی راہ میں قدرتی رکاوٹ ہندوستان کی گرمی بنی اور وہ واپس چلے گئے۔

اُچ اور ملتان کے حاکم ناصر الدّین قباچہ نے اطاعت سے انحراف کیا۔اور اپنی پوزیشن مضبوط بنا کر لاہور پر قبضہ کرلیا۔جلال الدین خوارزم شاہ نے اسے لاہور سے نکال دیا۔خوارزم شاہ کے قدم پنجاب میں نہ جمے اور اسے دہلی سے بھی مایوسی ہوئی،تو اس نے ملتان کا رُخ کیا۔بعدازاں وہ ایران چلا گیا مگر اس کے حملوں کے باعث ناصر الدّین قباچہ کی حالت بہت کمزور ہوگئی۔اسی لئے جب التمش نے ۱۲۲۸ء میں ناصر الدّین قباچہ پر حملہ کیا تو اس میں مقابلے کی تاب نہ تھی اور وہ اچ سے بھاگ کر بھکر کے دریائی قلعے میں محصُور ہوگیا۔سلطانی افواج نے اس کا محاصرہ کرلیا۔آخر تین ماہ بعد جب اسے اپنی شکست کا یقین ہوگیا تو وہ دریا پار کرنے کی غرض سے کشتی میں سوار ہوا۔مگر ڈوب گیا۔اس نے ملتان پر بیس بائیس سال حکومت کی۔بہت سے ارباب علم و دانش اس کے دربار سے وابستہ تھے۔جنہیں بعدازاں سلطان التمش اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔

علی مردان حاکم بنگال کو درباری امراء نے قتل کرکے امیر حسام الدّین کو حاکم بنا دیا۔وہ اگرچہ ہردلعزیز ضرور تھا مگر تاج دہلی کا باغی ہوگیا تھا۔اس نے باجگزاری سے انکار کردیا تھا۔اپنے عہد کے اوائل میں سلطان التمش شمالی سرحد پر تاتاریوں کی موجودگی سے پریشان رہا تھا۔اس لئے بنگال کی طرف توجہ نہ دے سکا۔۱۲۲۵ء میں سلطان فوج لے کر بنگال پہنچا۔مگر امیر حسام الدّین بغیر لڑے مطیع ہوگیا۔سلطان نے بھی اس کی معذرت قبول کرلی۔لیکن بعد میں حسام الدین پھر اپنے وعدے سے پھر گیا۔اور دوبارہ اپنی خود

مختاری کا اعلان کر دیا۔ اودھ کا گورنر شہزادہ ناصر الدین محمود، التتمش کے حکم سے بنگال گیا اور اسے شکست دے کر قتل کر دیا۔ ناصر الدین محمود کی اچانک وفات کے بعد خلجی سرداروں نے بالکا کی قیادت میں دوبارہ بغاوت کر دی۔ جسے فرو کرنے کے لئے بادشاہ بذاتِ خود بنگال گیا اور بالکا کو قتل کر کے خلجی بغاوت کی آگ کو بجھا دیا۔ اب کی بار بنگال کے معاملے میں ایک انتظامی تبدیلی یہ کی کہ بہار کو بنگال سے الگ ایک صوبہ بنا دیا۔

جب تمام علاقوں پر سلطان التتمش کو اقتدار حاصل ہو گیا تو اس نے ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے خلافت کدہ بغداد سے توثیق چاہی۔ اس پر ۱۸ فروری ۱۲۲۹ء کو خلیفہ بغداد کا ایلچی توثیق نامہ لے کر دہلی پہنچا۔ جہاں اس کا انتہائی پرجوش اور عظیم الشان استقبال کیا گیا۔ کئی روز جشن جاری رہا۔ ایک خاص تقریب میں خلیفہ کا خط پڑھا گیا۔ اور سلطان نے خلیفہ کی ارسال کردہ خلعت زیب تن کی۔ اس طرح سلطان نے اپنی آئینی حیثیت سے متعلق اپنے مخالفوں کے عذر کا خاطر خواہ جواب فراہم کر دیا۔ اور اس کی آئینی اور سیاسی حیثیت کو مذہبی جواز بھی مل گیا۔

۱۲۳۵ء میں گکھڑوں کی مہم کے دوران اچانک بیماری کے باعث سلطان دہلی واپس آ گیا۔ ۳۰ اپریل ۱۲۳۶ء کو اس نے اِس جہان سے رحلت کی اور مسجد قبۃ الاسلام میں دفن ہوا۔ سلطان شمس الدین التتمش کی سیرت کے بارے میں معاصر مورخ قاضی منہاج الصراج کا یہ تبصرہ سب سے زیادہ جمع ہے:

> ''وہ مشفق، غیر جانبدار، پرجوش اور بہادر سپاہی، علم و عدل کا مربی، عدل گستر، فریدون کی مانند شان و شوکت کو حامل، کیقباد جیسی شاہانہ صفات کا پیکر، سکندر اعظم جیسی عظمت و جلالت کا شہنشاہ اور بہرام جیسی سطوت رکھنے والا حکمران تھا۔ علاوہ ازیں اس جیسا نیک شفیق، اور صوفیائے کرام و علماء کا مربی اور قدردان کوئی حکمران تختِ دہلی پر نہیں بیٹھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند اور نماز جمعہ مسجد میں جا کر ادا کرنے کا عادی تھا۔'' (طبقات ناصری)

رُکن الدین فیروز

اگرچہ التتمش کے کافی بیٹے تھے مگر ان میں جوہرِ قابل صرف ناصر الدین محمود ہی تھا۔ جو اس کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ اور اسی میں نظامِ حکومت چلانے کی صلاحیت تھی۔ باقی لڑکے سب ہی نا اہل تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں امراء نے التتمش سے جانشینی کے مسئلے پر بات کی تو اس نے جواب دیا کہ اس کی اولاد میں سوائے اس کی بیٹی رضیہ کے کوئی بھی اس بارِ گراں کا متحمل نہیں۔ لیکن امراء نے ایک خاتون کو سربراہ تسلیم کرنے سے عذر کیا۔ التتمش کی وفات کے بعد امراء نے اس کے لڑکے رکن الدین فیروز شاہ کو بادشاہ بنا دیا۔ رکن الدین صرف نام کا بادشاہ تھا۔ اصل اقتدار اس کی ماں شاہ ترکان کے ہاتھ میں تھا۔ تخت نشین ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد اس نے امور سلطنت سے قطعاً لاپرواہی اختیار کر کے اپنے آپ کو رنگ رلیوں میں مبتلا کر لیا۔ رکن الدین فیروز شاہ علماء اور دانشمندوں کی صحبت کے بجائے مسخروں اور بہروپیوں کی صحبت کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کی ہوس کاریوں نے اکثر امراء کو اس سے بدظن کر دیا۔ دور نزدیک کے بہت سے علاقے مرکز سے علیحدہ ہو گئے۔ شاہ ترکان نے اپنی چالاکی کی بدولت اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ اس نے سازش سے التتمش کے چھوٹے بیٹے قطب الدین کو توقتل کر دیا لیکن رضیہ اس کی سازش کا شکار ہونے سے بال بال بچ گئی۔ بالآخر سات ماہ کی دگرگوں حکومت کے بعد فیروز شاہ اور اس کی ماں عوام اور خواص کے غیظ و غضب کا نشانہ بن کر تخت و تاج کے علاوہ اِس دنیا سے بھی رخصت ہوئے۔

رضیہ سُلطانہ، (۱۲۳۶ء تا ۱۲۴۰ء)

رضیہ سُلطانہ اسلامی تاریخ میں انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں نظامِ حکومت چلانے کی بے پناہ صلاحیتیں تھیں۔ رضیہ مضبوط ذہنی اور جسمانی قویٰ کی مالک تھی۔ وہ صائب الرائے، رعیّت پرور اور انصاف کیش تھی۔ لیکن ان تمام اوصاف سے متصف ہونے کے باوجود وہ محض نسوانیت کے باعث استحکام سلطنت حاصل نہ کر سکی۔ اگر وہ

عورت کے بجائے مرد ہوتی تو اپنی ان صلاحیتوں کی مدد سے دنیا کے چند کامیاب ترین بادشاہوں میں نمایاں مرتبہ کی حامل ہوتی۔ لیکن اس کی نسوانیت اس کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔

رکن الدین فیروز شاہ کے زوال کے بعد عوام وخواص نے رضیہ کی تخت نشینی کی حمایت کی۔ حکومت حاصل ہونے کے بعد ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ رضیہ کی مشکلات میں بھی بہت اضافہ ہو گیا۔ امراء کا ایک طبقہ اس کے خلاف تھا۔ اس گروہ نے ہانسی، لاہور، ملتان اور بدایوں کے گورنروں کے ساتھ مل کر دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ رضیہ نے سیاسی فراست سے ان میں پھوٹ ڈال دی۔ اور محاصرہ ختم ہو گیا۔ اکثر باغی گرفتار ہو کر قتل ہوئے۔ راجپوتوں کی بغاوت فرو کرنے کے لئے اس نے اپنا لشکر بھیجا۔ دہلی پر قرامطہ کی یورش کو کچلا۔

تخت نشین ہونے کے بعد بھی کچھ مدت اس نے پردے میں گزاری، لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ انتظامِ مملکت میں پردہ حائل ہوتا ہے تو اس نے نقاب اتار دیا اور زنانہ لباس کے بجائے مردانہ لباس میں دربار لگانا اور فوجوں کی قیادت کرنا شروع کر دیا۔ اور مذہبی حلقوں کی جانب سے بھی اس پر تنقید شروع ہو گئی۔

اس وقت کاروبارِ حکومت پر صرف چند ترک امراء کی اجارہ داری تھی اور وہ کسی کو ان معاملات میں دخل اندازی کی اجازت نہ دیتے تھے۔ رضیہ نے اس وقت ایک بالکل صحیح فیصلہ یہ کیا کہ جب تک ان امراء کا زور نہیں ٹوٹے گا سلطنت کو استحکام نصیب نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اس نے بعض غیر ترک امراء کی سرپرستی شروع کی۔ ان میں سے ایک حبشی غلام جمال الدین یاقوت سلطانہ کے بہت قریب ہو گیا۔ اس پر سلطانہ کے مخالفوں کو اس کے خلاف تنقید کرنے کا ایک نیا جواز مل گیا۔

بھٹنڈہ کے حاکم التونیہ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے وہ خود فوج لے کر گئی۔ مگر راستے میں اس کے بعض امراء نے اس کی اطاعت سے گریز کیا اور اس کے معتمد خاص حبشی غلام یاقوت کو قتل کر دیا اور رضیہ کو گرفتار کر کے التونیہ کے حوالے کر دیا۔

ادھر ترک امراء نے دہلی میں التتمش کے دوسرے بیٹے بہرام شاہ کو بادشاہ بنا دیا۔ عہدوں کی تقسیم کے وقت التونیہ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس پر اس نے رضیہ سے معاونت چاہی اور اسے رہا کر کے اس سے شادی کر لی اور دونوں دارالسلطنت دہلی پر حملہ آور ہوئے مگر بہرام شاہ کی فوج سے شکست کھا کر بھاگے۔ ان کی تمام فوج ضائع ہوگئی اور دونوں جان سے گئے۔

معزالدّین بہرام شاہ، (۱۲۴۰ء تا ۱۲۴۲ء)

اِلتتمش کے وارثوں کی نا اہلی سے فائدہ اٹھا کر امرائے چہلگانی نے امورِ مملکت پر مکمل اختیارات حاصل کر لئے۔ حتیٰ کہ رضیہ کے بعد اس کے بھائی بہرام کو اس شرط کے ساتھ اقتدارِ اعلیٰ دیا گیا کہ وہ امرائے چہلگانی کے مشوروں کا پابند رہے گا۔ انہوں نے نائب السلطنت کا ایک نیا عہدہ بھی بنایا۔ جس پر اختیار الدّین التگین کا تقرر ہوا۔ اب تمام سیاسی اقتدار بادشاہ کے بجائے نائب السلطنت کو حاصل تھا۔ اختیار الدّین نے بادشاہ کی بیٹی سے شادی بھی کر لی جس سے اس کی حیثیت مزید مستحکم ہوئی اور اب اس کے ذہن میں بادشاہ بننے کی خواہش انگڑائیاں لینے لگی۔ بہرام شاہ نے اس سازش کا علم ہونے پر اختیار الدین کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد سفر بھی نائب السلطنت کی حیثیت سے بادشاہ کا اعتماد حاصل نہ کر سکا اور بہرام شاہ کی کسی حکم عدولی پر موت سے ہمکنار ہوا۔ ان دو مقتدر امراء کی موت نے امرائے چہلگانی میں تہلکہ مچا دیا۔

اِسی اثناء میں ملتان پر منگول حملے کی خبر آئی تو بہرام شاہ نے نظام الملک کو حاکم ملتان کی مدد کو بھیجا۔ منگولوں کو جب اِس کمک کا علم ہوا تو انہوں نے دسمبر ۱۲۴۱ء میں ملتان کا محاصرہ اٹھا کر لاہور کو گھیر لیا۔ لاہور کے حاکم قراکش نے ان کا مقدور بھر مقابلہ کیا لیکن کچھ بن نہ آئی اور ان وحشیوں نے لاہور فتح کر لیا۔ اور قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار خوب گرم کیا۔

نظام الملک کی سرکردگی میں جو فوج ملتان کی طرف گئی تھی وہ کچھ دُور جا کر واپس

آ گئی اور اس نے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ کچھ دِن کے بعد محاصرین شہر میں داخل ہو گئے اور بہرام شاہ کو قتل کر دیا۔

علاء الدّین مسعود شاہ، (۱۲۴۲ء تا ۱۲۴۶ء)

بہرام کے زوال کے بعد درباری امراء میں سے ایک با اثر امیر کشلو خان نے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا۔ لیکن التتمش کے خاندان میں سے کسی کا تخت نشین ہونا مصلحت وقت تھی اس لئے امرائے چہلگانی نے آخر کار رکن الدّین فیروز شاہ کے کمسن بیٹے علاء الدین مسعود شاہ کو تخت نشین کر دیا۔ اس کے چار سالہ عہد حکومت میں بہت سے ہنگامے رونما ہوئے۔ سازشی امراء کی ریشہ دوانیاں، مختلف صوبوں میں بغاوت اور سب سے بڑھ کر تاتاریوں کا تمدّن دشمن طرزِ عمل، ان سب باتوں کے باوجود ابتدائی دو سال نسبتاً عافیت کے تھے۔

نائب المملکت کے منصب پر پہلے قطب الدین فائز ہوا۔ مگر دربار، امراء کی رقابت کے باعث معزول ہوا۔ مہذب الدین بھی زیادہ دیر تک نہ ٹک سکا اور اس کے بعد امرائے چہلگانی کے سربراہ بلبن کی باری آئی۔ بلبن نے فہم و فراست سے تمام امراء کو اپنا طرفدار بنا کر اپنی حیثیت مضبوط کر لی۔

مرکز میں انتشار سے فائدہ اٹھا کر بنگال کا حاکم طغان خان باغی ہو گیا اور اس نے بڑھ کر بہار اور اودھ پر بھی قبضہ کر لیا۔ ملتان اور اُچ بھی تاج دہلی سے منقطع ہو گئے۔ اسی سال تاتاریوں نے پھر پنجاب کا رُخ کیا اور اپنے سردار منگو خان کی قیادت میں اچ کا محاصرہ کر لیا۔ اس موقعے پر دہلی سے ایک فوج ناصر الدین محمود کی سرکردگی میں بھیجی گئی جس کا منصوبہ شمال کی طرف سے بڑھ کر منگولوں کو گھیرے میں لینے کا تھا، لیکن منگول اِس چال کو سمجھ گئے۔ اور محاصرہ اٹھا کر بھاگ گئے۔ اور یوں اُچ منگولوں کی تباہ کاری سے بچ گیا۔

اِس تمام عرصے میں بلبن کا اثر دربار میں بڑھتا گیا۔ چنانچہ اس نے امرائے چہلگانی کے ساتھ مل کر بادشاہ کو اس کی چند ناپسندیدہ پالیسیوں کی وجہ سے جون ۱۲۴۶ء

میں معزول کر دیا اور اس کے چچا ناصر الدین محمود کو تخت پر بٹھا دیا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ سلطان التمش کے بڑے لڑکے کا نام بھی ناصر الدین محمود تھا۔ وہ بنگال کا گورنر بھی رہا۔ اور عالم شباب میں ہی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان کے ہاں یہ بیٹا پیدا ہوا تو اس کی یاد میں اس کا نام بھی ناصر الدین محمود ہی رکھا گیا۔

ناصر الدین محمود، (۱۲۴۶ء تا ۱۲۶۶ء)

۱۰ جون ۱۲۴۶ء کو ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا۔ وہ ایک غیر متنازعہ شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد بادشاہ اور امراء کی چپقلش ختم ہو گئی اور دربار میں سکون ہو گیا۔ ناصر الدین محمود ایک دین دار، درویش صفت اور فقیر منش انسان تھا۔ صلح کل اِس کا مسلک تھا اور رحم دلی وانصاف پروری اس کا کیش۔ تقریباً تارک الدنیا تھا اپنا وقت دینی مشاغل اور خاص کر کتابت کلام اللہ میں صرف کرتا تھا۔ اس کی گھریلو زندگی بہت سادہ تھی۔ گھر کا تمام کام کاج اس کی زوجہ کے سپرد تھا۔ جس کی معاونت کے لئے کوئی خادمہ بھی موجود نہ تھی۔ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے اس نے خزانے سے کبھی کچھ حاصل نہ کیا۔

ناصر الدین محمود آج کل کی اصطلاح میں محض ایک ''دستوری بادشاہ'' تھا۔ امورِ مملکت میں اُسے کوئی دخل حاصل نہ تھا۔ خوش قسمتی سے اسے بلبن جیسا قابل وزیر مل گیا جس نے اس دگرگوں حالت میں محض اپنی قابلیت سے سلطنت دہلی کو استحکام بخشا۔

ناصر الدین محمود کو سریر آرائے سلطنت ہوئے ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی کہ تاتاریوں نے شمالی سرحدوں پر حملہ کر دیا۔ بلبن فوراً اس فتنے کی سرکوبی کے لئے آگے بڑھا اور کامران لوٹا۔ جولائی ۱۲۴۷ء میں سلطان خود فوج کے ساتھ ملتان وارد ہوا۔ آمد کا مقصد گکھڑوں کو ان کے باغیانہ طرزِ عمل کی سزا دینا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف یہ لوگ تاتاریوں کی رہنمائی اور مدد کرتے تھے۔

۱۲۴۸ء میں بادشاہ نے اپنے وزیر بلبن کی بیٹی سے شادی کر لی جس سے دربار

میں بلبن کی حیثیت مزید مضبوط ہوگئی۔ اگلے سال پھر بادشاہ ملتان آیا۔ بیاس کے کنارے لاہور کا حاکم شیر خان بھی بیس ہزار شہسواروں کے ساتھ آ کر شامل ہو گیا۔ بادشاہ نے ملتان میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران فیض الدین بلبن کو ناگور اور اُچ کے علاقے کا حاکم نامزد کیا۔ پھر دہلی واپس چلا گیا۔ ۱۲۵۰ء میں لاہور کے مدبّر اور دلیر حاکم شیر خان نے غزنی پر حملہ کر کے وہاں سے تاتاریوں کو نکال باہر کیا۔ اور غزنی کو ایک بار پھر تاج دہلی سے وابستہ کر دیا۔ بلبن دربار کی سب سے بااثر شخصیت بن گیا اور امرائے چہلگانی جن کا وہ سربراہ تھا، نے اس کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ ان کے کہنے سننے پر بادشاہ نے بلبن کو معزول کر کے اسے اپنی جاگیر ہانسی میں چلے جانے کو کہا۔ اس کے ساتھ ہی بلبن کے بھائی شیر خان اور کشلو خان کو بھی معزول کر دیا۔ اور عماد الدین ریحان کو اپنا نائب السلطنت مقرر کیا مگر اس سے انتظام حکومت نہ چل سکا۔ اور مجبوراً بلبن کو واپس بلانا پڑا۔

۱۲۵۷ء میں تاتاری ایک بار پھر حملہ آور ہوئے اور پنجاب میں کافی لوٹ مچائی۔ بادشاہ ان کی سرکوبی کے لئے آیا مگر یہ لوگ پہلے ہی فرار ہو گئے۔ مارچ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان کے ایک ایلچی نے پنجاب کا دورہ کیا اور وہ دہلی بھی گیا۔ جہاں اس کا شایانِ شان استقبال کیا گیا۔

۱۲۶۶ء میں ناصر الدین محمود بیمار ہوا اور خاصی طویل بیماری کے بعد ۱۲۶۶ء میں فوت ہوا۔

غیاث الدّین بلبن، (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء)

خاندانِ غلاماں میں التمش کے بعد سب سے نمایاں شخصیت بلبن کی ہے۔ بلبن نے ایک بہت ہی نازک وقت زمامِ اقتدار سنبھالی۔ ملک میں ہر طرح کے بحران موجود تھے۔ سماج دشمن عناصر نے رعایا کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ درباری اور محلاتی سازشوں کے باعث داخلی استحکام مفقود تھا بہت سے صوبے باغی ہو چکے تھے۔ کئی ہندو راجگان آمادہ فساد

تھے۔ اور سب سے بڑھ کر فتنۂ تاتار، جس کی غارت گری اور ہلاکت خیزی نے عوام کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ اس عالم میں ایک ایسے حکمران کی ضرورت تھی جو مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہو۔ بلبن نے اپنے آپ کو اِس منصب کا پوری طرح اہل ثابت کیا۔

بلبن بادشاہت کے بارے میں ایک مخصوص نظریہ رکھتا تھا۔ وہ سیاست کی اصطلاح میں ''ربانی حقوق'' کے نظریے کا قائل تھا۔ کہ عوام کو بادشاہ کی امتیازی حیثیت تسلیم کرنی چاہیے۔ کیونکہ بادشاہ عوام کی نسبت بہت زیادہ فضیلت کا حامل ہے۔ بادشاہ کو چاہیے کہ لوگوں کو وحشت اور بربریت سے ڈرانے کے بجائے اپنی شان وشوکت سے مرعوب کرے۔ وہ اپنے اس فلسفے پر پوری طرح عمل کرتا تھا۔ بڑے کروفر سے دربار میں آتا اور وہاں بڑی شان وشوکت سے بیٹھتا۔ دربار کی آرائش پر بڑی توجہ دی گئی تھی۔ دربار میں نہ کبھی خود مسکرایا اور نہ کسی کو کبھی جرأت ہوئی۔ محل میں بھی اپنی آن بان کا مکمل خیال رکھتا تھا۔ خاص خدمتگاروں کے سامنے بھی معمولی لباس میں نہ آتا۔

بلبن صرف ترکوں کو ہی حکومت چلانے کے قابل سمجھتا تھا۔ کسی غیر ترک سے بات کرنا اپنی شاہانہ عظمت کے خلاف سمجھتا تھا۔ اِس کی اِس حکمت کی وجہ سے عوام وخواص پر اس کا دبدبہ قائم ہو گیا۔ اور اس نے مشکلات پر قابو پا کر بعد ازاں بڑے اطمینان کے ساتھ حکومت کی۔

سلطان غیاث الدین بلبن کی زندگی کا پس منظر یوں ہے کہ یہ ترکی الاصل تھا۔ بچپن ہی میں منگول اسے پکڑ کر لے گئے۔ اور یہ بکتا بکاتا بالآخر التمش کے پاس پہنچا۔ التمش اس کی ذہنی استعداد سے بہت متاثر ہوا اور اس کے لئے خاص تعلیم وتربیت کا بندوبست کیا۔ اپنی قابلیت کی بنا پر اس نے امرائے چہلگانی میں اہم مقام پیدا کر لیا۔ یہ رضیہ کے زمانے میں امیر شکار تھا۔ مگر رضیہ کے مخالف گروہ میں تھا۔ بہرام نے اسے راداڑی اور ہانسی کی جاگیریں عطا کیں۔ اس کے بہترین انتظام کی وجہ سے ان علاقوں کے باشندوں کی حالت بدل گئی۔ منگولوں کی کئی یورشیں روکیں۔ علاء الدین مسعود کو معزول کر کے اس نے ناصر الدین محمود کو تخت نشین کیا اور خود وزیرِاعظم بن گیا۔

ناصر الدّین محمود کی وفات کے بعد بلبن بغیر کسی مخالفت کے بادشاہ بن گیا۔

تخت نشینی کے بعد اس نے سب سے پہلے دہلی کے قرب و جوار سے ڈاکوؤں اور رہزنوں کا صفایا کیا جنہوں نے راستے غیر محفوظ بنا رکھے تھے۔ دہلی اور بنگال کا طویل راستہ بھی لٹیروں کی زد میں تھا۔ اسے بھی پاک کیا۔ روہیل کھنڈ میں ہندو زمیندار آمادۂ بغاوت ہوئے۔ ان کی موثر سرکوبی کی۔

التمش نے بہت سے زمینداروں کو زمینیں دے رکھی تھیں۔ لیکن اب یہ لوگ ضعیفی کی وجہ سے کسی کام کے قابل نہ تھے۔ بلبن نے ان سے زمینیں واپس لے کر ان کی پنشن مقرر کر دی۔ مگر بعد میں فخر الدّین کوتوال کی سفارش پر اس نے اپنا یہ حکم واپس لے لیا۔

ترکان چہلگانی تمام امورِ مملکت پر حاوی تھے۔ بادشاہ اور امراء کی یہ کشمکش استحکام سلطنت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ بلبن بھی امرائے چہلگانی سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر اب اس نے ان کا زور توڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ بلبن نے ان کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ حکومت کے مخالفوں کے خلاف خنجر اور زہر دغا کا استعمال عام ہوا۔ بلبن ان کی معمولی غلطی کو بھی نظر انداز نہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے بعض روایات کے مطابق اپنے رشتے کے ایک بھائی کو بھی زہر سے ختم کرا دیا تھا۔ جو لاہور کا گورنر تھا۔ مگر کچھ عرصہ دہلی میں حاضری نہ دے سکا۔

منگولوں کے حملوں کی وجہ سے پیدا شدہ صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے بلبن نے شہزادہ سلطان محمد کو لاہور اور ملتان کا گورنر مقرر کیا۔ یہ شہزادہ بے پناہ فوجی اور انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے اپنے فرائض کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ یہ شہزادہ علماء اور فضلاء کا بڑا سرپرست بھی تھا۔ جب یہ دہلی سے ملتان آیا تو تمام بڑے بڑے فضلاء کو ساتھ لے آیا۔ ان میں مشہور صوفی اور شاعر امیر خسرو دہلوی بھی شامل تھے۔ ملتان آ کر شہزادہ محمد نے دفاعی انتظامات کو موثر بنایا۔ منگول حملہ آور اوّل تو ادھر کا رُخ ہی نہ کرتے اور اگر آ بھی جاتے تو سخت نقصان اٹھا کر واپس جاتے۔ اس کے انتظامات کی وجہ سے

پنجاب میں امن قائم ہو گیا۔ اور یہاں کے باشندوں نے سکھ کا سانس لیا۔

۱۲۸۵ء میں فارس کے منگول حاکم اور ہلاکو خاں کے پوتے ارغان خان کے جرنیل تیمور خان نے بیس ہزار فوج کے ساتھ پنجاب پر حملہ کر دیا اور پنجاب میں خوب تاخت و تاراج ہوئی۔ بستیوں کی بستیاں اُجڑ گئیں۔ اس وقت پنجاب کا صدر مقام ملتان تھا۔ شہزادہ محمد سلطان انتہائی سرعت کے ساتھ لاہور آیا اور راوی کے کنارے خیمہ زن ہو گیا۔ منگول جرنیل نے جب دوسرے کنارے پر بھاری لشکر دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ مگر شہزادے نے کہا کہ تسلی سے دریا عبور کر لو۔ ہم اس دوران میں تمہیں کچھ نہ کہیں گے۔ دریا عبور کرنے کے بعد دونوں فوجوں میں معرکہ شروع ہوا۔ دونوں طرف سے بہادری کے جوہر دکھائے گئے۔ دونوں جرنیل بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ منگول آخر کار شکست کھا کر بھاگ گئے۔ شاہی افواج نے ان کا تعاقب کیا۔ شہزادہ اپنے مختصر دستے کے ساتھ پیچھے رہ گیا۔ وہ ایک جگہ پڑاؤ ڈالے پڑا تھا کہ منگولوں کے ایک دستے نے اچانک گھات سے نکل کر ان پر حملہ کر دیا۔ شہزادہ اور اس کے ہمراہی جان توڑ کر لڑے مگر تاتاریوں کی زبردست عددی فوقیت کے سبب اکثر مارے گئے اور بقیہ قید کر لئے گئے۔ شہید ہونے والوں میں شہزادہ محمد بھی تھا۔ بلبن کے عہد میں یہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔

شہزادے کی شہادت کی اطلاع بلبن پر بجلی بن کر گری۔ وہ اِس حادثے کو برداشت نہ کر سکا۔ یہی شہزادہ اس کا متوقع جانشین بھی تھا۔ اور اب اسے اپنے بعد خلا نظر آتا تھا۔ اس کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ تو اس نے اپنے دوسرے بیٹے بغرا خان کو جو بنگال کا گورنر تھا، بلایا۔ مگر وہ نہ آیا تو اس نے امراء کو بلا کر سلطان محمد کے بیٹے کیخسرو کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ اس نامزدگی کے تین دِن بعد بلبن رحلت کر گیا۔ امراء نے اس کی خواہش کے برعکس بغرا خان کے بیٹے کیقباد کو بادشاہ بنا دیا۔

معزالدّین کیقباد، (۱۲۸۷ء تا ۱۲۹۰ء)

شہزادہ کیقباد سترہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ بلبن کی کڑی نگرانی میں اس کی

تربیت ہوئی۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ کہاں وہ پابندیاں اور کہاں یہ مکمل آزادی۔ اس مکمل آزادی نے شہزادے کی طبیعت میں لاپرواہی پیدا کر دی۔ وہ امورِ مملکت اپنے وزیر نظام الدین کے سپرد کر کے خود لہو ولعب میں مبتلا ہو گیا۔ اس سے نظامِ حکومت بری طرح متاثر ہوا۔

کیقباد کے ابتدائی ایام میں تاتاریوں نے پنجاب پر پھر حملہ کیا۔ دہلی سے ایک فوج ملک یادبرلاس کی سرکردگی میں بھیجی گئی جس نے لاہور کے قریب تاتاریوں کو زبردست شکست دی۔ ان کی ایک بہت بڑی تعداد قید ہوئی اور دہلی لے جا کر قتل کر دی گئی۔

کیقباد کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کا علم جب اس کے والد بغرا خان حاکم بنگال کو ہوا تو وہ اپنے بیٹے کو ان حرکتوں کے مضر نتائج سے متنبہ کرنے کے لئے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ بڑی ردوکد کے بعد دریائے گھاگرہ کے کنارے ان کی ملاقات ہوئی۔ اِس ملاقات کا تفصیلی حال امیر خسرو نے اپنی مثنوی ''قران السعدین'' میں نظم کیا ہے۔ وقتی طور پر کیقباد نے باپ کی باتیں سن لیں مگر ان کو اپنے دِل میں کوئی جگہ نہ دی۔ بغرا خان واپس بنگال چلا گیا اور کیقباد دہلی آ کر پھر انہیں مشاغل میں محو ہو گیا۔

انتظامِ سلطنت کے سلسلے میں بادشاہ کی عدم توجہی کے باعث طبقۂ امراء میں سے تین امراء بہت طاقت حاصل کر گئے۔ جن میں سے ملک جلال الدّین خلجی سب سے زیادہ بااثر تھا۔ ترک امراء ذہنی طور پر ایک غیر ترک کی قیادت کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ اس لئے وہ اِس کے خلاف کمربستہ ہو گئے۔ اِسی اثنا میں کیقباد فالج میں مبتلا ہو گیا۔ اور بالآخر مارچ ۱۲۹۰ء میں کیقباد کا تختہ الٹ کر ملک جلال الدّین فیروز خلجی نے تخت وتاج پر قبضہ کر لیا۔

کیقباد کو ایک سپاہی، جس کے باپ کو اس نے قتل کرایا تھا، نے دریا میں پھینک دیا۔ کیقباد کے ساتھ ہی خاندانِ غلامان کا دَور ختم ہو گیا۔

خلجی خاندان

جلال الدّین خلجی

خاندان غلاماں کے خاتمے کے بعد حکومت خاندان خلج کے ہاتھ آئی۔ مورخین اِس واقعے کو تاریخ پاک و ہند کا ایک اہم واقعہ قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ خاندان کسی اعلیٰ نسلی پس منظر کا مالک نہ تھا۔ اس لئے شروع میں امراء نے جلال الدّین کی اطاعت سے گریز کیا۔ مگر اس نے اپنی مخصوص حکمتِ عملی سے اس بے چینی کو ختم کر دیا۔ اور آہستہ آہستہ سب لوگ اس کو اپنا بادشاہ تسلم کرنے لگے۔

بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کی دارالحکومت میں موجودگی کو جلال الدّین اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے ملک چھجو کو دہلی چھوڑ کر اپنی جاگیر میں چلے جانے پر مجبور کر دیا۔ بتدریج دہلی میں اس کے لئے فضا ہموار ہو گئی۔ لیکن ۱۲۹۱ء میں ملک چھجو نے بغاوت کر دی۔ وہ اپنے آپ کو تخت کا زیادہ اہل سمجھتا تھا۔ سلطان خود اس کے مقابلے کے لئے گیا۔ بدایوں کے نزدیک سلطان کے بیٹے ارکلی خان نے اپنے ہراول دستے کی مدد سے ملک چھجو کو شکست دی۔ اسے گرفتار کر کے بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔ سلطان نے اپنی فطری رحمدلی کی وجہ سے اسے معاف کر کے ملتان بھیج دیا۔

مؤرخین اِس معاملے میں اختلاف کرتے ہیں کہ آیا سلطان واقعی رحم دل اور نرم خُو تھا یا اس کا یہ طرزِ عمل محض مصلحت وقت کی وجہ سے ہوا تھا۔ کیوں کہ جہاں اِس کی رحمدلی کے لئے واقعات ہیں وہیں اس کے برعکس واقعات بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ اِس سلسلے میں خاص طور پر ''سیدی مولا'' کے واقعے کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

۱۲۹۲ء میں پنجاب پھر ترکتاز کا نشانہ بنا۔ سلطان جلال الدّین خلجی نے منگولوں کو شکست دی اور وہ واپس فرار ہو گئے۔ مگر ان کا ایک سردار لغو خان، جو چنگیز خان کی

اولاد سے تھا، نے اپنے تین ہزار ساتھیوں کے ساتھ اسلام قبول کرلیا۔ سلطان نے دہلی کے قریب ان کو آباد کیا اور ان کی ہر طرح دیکھ بھال کی۔

ملک چھجو کے زوال کے بعد سلطان جلال الدین خلجی نے اپنے بھتیجے اور داماد علاء الدّین خلجی کو کڑہ وغیرہ کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔ علاء الدّین کی نیت خود مختاری حاصل کرنے کی تھی۔ چنانچہ اس نے سلطان سے بھیلہ پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کی جو سلطان نے اسے دے دی۔ لیکن دراصل اس کا ارادہ دکن کی کسی مالدار ریاست پر حملہ کرنے کا تھا۔ اِس مقصد کے لئے اس نے دیوگیر کو منتخب کیا اور اپنے منصوبے کو اخفا میں رکھتے ہوئے اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس ریاست کی فتح سے اسے بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ لیکن یہ مال اس نے فوراً جلال الدّین خلجی کی خدمت میں پیش نہ کیا۔

علاء الدین نے اپنے صوبے میں واپس پہنچ کر چچا کی خدمت میں معذرت کا خط لکھا کہ اس نے بغیر اجازت دیوگیر پر حملہ کیا۔ دربار میں اس کے بھائی الماس بیگ نے بادشاہ کو تجویز پیش کی کہ وہ خود کڑہ جا کر اپنے بھتیجے کی معذرت قبول کرے۔ چنانچہ امراء کے منع کرنے کے باوجود بادشاہ وہاں چلا گیا۔ بادشاہ کی فوج نے ایک کنارے پر ڈیرے ڈال دیئے اور دوسرے کنارے پر علاء الدّین مع لشکر کے موجود تھا۔ الماس بیگ فوج کو اس کنارے چھوڑ کر بادشاہ کو علاء الدین کے پاس لے گیا۔ وہاں علاء الدین نے اپنے چچا کا شایان شان استقبال کیا۔ وہ اسے اپنی فوجیں دکھانے کے لئے لے چلا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق علاء الدین کے دو آدمیوں نے پیچھے سے حملہ کر کے جلال الدّین کو قتل کر دیا۔

علاء الدّین خلجی، (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء)

علاء الدین خلجی اپنے چچا جلال الدین کو قتل کرنے کے بعد دہلی میں وارد ہوا۔ لوگ اس کی داد و دہش کے باعث اِس کے سفاکانہ طرزِ عمل کو بھول گئے اور وہ ۲۰ اکتوبر ۱۲۹۶ء کو دہلی میں تخت نشین ہوا۔ جلال الدّین خلجی کی زوجہ اور اس کا کمسن بیٹا قدر خان

ملتان چلے گئے۔ جہاں جلال الدین کا دوسرا بیٹا ارکلی خان گورنر تھا۔ علاء الدین کے بھائی ظفر خان نے ملتان پر حملہ کیا اور ان لڑکوں کو گرفتار کرنے کے بعد انہیں اولاً ہانسی میں نظر بند کیا اور بعد ازاں قتل کر دیا۔ ان کی ماں کو دہلی میں قید کر دیا گیا۔ ارکلی خان کے دونوں بچے بھی قتل کر دیئے گئے۔

علاء الدین خلجی کے عہد کا ابتدائی حصہ منگول حملوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ منگول بار بار حملہ آور ہوے۔ لاہور، ملتان اور سندھ کا علاقہ تاتاریوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اس لئے سلطان کو ساری قوت اِس فتنے کو کچلنے کے لئے صرف کرنا پڑی۔ اس نے بلبن کی سرحدی حکمتِ عملی کا مطالعہ کیا اور اس کے مطابق عمل کر کے اس مشکل پر کافی حد تک قابو پالیا۔ پرانے قلعوں کی مرمت اور نئے قلعوں کی تعمیر کرائی۔ فوج کو مضبوط بنایا۔ ان اقدامات کی وجہ سے خارجی امن قائم ہو گیا۔

۱۲۹۷ء میں امیر داؤد کی قیادت میں ایک لاکھ تاتاریوں کا لشکر جرار پنجاب اور سندھی فتح کے ارادے سے آیا۔ سلطان نے اپنے بھائی الپ خان کو اِن کے مقابلے میں بھیجا۔ لاہور کے قریب دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ ہلاکت خیز لڑائی کے بعد منگول بارہ ہزار لاشیں چھوڑ کر فرار ہو گئے جن میں ان کے کئی اعلیٰ افسر بھی تھے۔

اگلے سال یعنی ۱۲۹۸ء میں دو لاکھ تاتاریوں کا ٹڈی دل لشکر قتلغ خان کی سرکردگی میں اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے برصغیر میں داخل ہوا۔ یہ لوگ راستے کی بستیاں اجاڑنے پر اپنی طاقت ضائع کئے بغیر انتہائی سرعت کے ساتھ دارالسلطنت دہلی جا پہنچے۔ سلطان نے بذاتِ خود فوج کی کمان کی اور ایک خون ریز معرکہ کے بعد تاتاری بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ علاء الدین کے بہادر جرنیل ظفر خان نے ان کا تعاقب کیا جس سے دشمنوں کا بہت نقصان ہوا مگر خود ظفر خان بھی مارا گیا۔

اِس فتح کے بعد سلطان اپنے آپ کو کوئی مافوق الفطرت ہستی سمجھنے لگا۔ اِسکے ذہن پر تکبر اور نخوت چھا گئی۔ اِس کے دماغ میں ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کا سودا سما گیا۔ دوسرا خیال جس کا اظہار اس نے اپنے امراء کے سامنے کیا یہ تھا کہ ہندوستان میں

اپنا نائب چھوڑ کر دنیا فتح کرنے نکلوں گا۔ اس نے سکندر ثانی کا لقب اختیار کر لیا۔ مگر اپنے ایک وزیر کے کہنے سے وہ اپنے اِن خیالات سے باز آ گیا۔

۱۳۰۳ء میں جب سلطان علاء الدّین خلجی راجپوتانہ اور ورنگل کی مہموں میں مصروف تھا۔ منگول اس کے اِس کمزور پہلو سے فائدہ اٹھا کر دہلی پر چڑھ دوڑے۔ تاتاری بغیر کسی مزاحمت کے دہلی پہنچ گئے۔ مگر ان کے لشکر میں وَبا پھوٹ پڑی اور وہ واپس چلے گئے۔

۱۳۰۴ء میں سلطان کو پھر ترکتاز کا سامنا کرنا پڑا۔ تاتاریوں کا ایک عظیم لشکر علی بیگ کی قیادت میں پنجاب کو روندتا ہوا امروہہ تک آ پہنچا۔ سلطان نے ملک کافور کو فوج دے کر بھیجا۔ اب کی بار پھر منگولوں کو عبرتناک شکست ہوئی۔ ان کے سات ہزار سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ علی بیگ نو ہزار فوج کے ساتھ گرفتار ہوا۔ دہلی میں ساری فوج کو قتل کر دیا گیا۔ اور سردار کو ہاتھی کے پاؤں تلے کُچل دیا گیا۔

اگلے سال تاتاریوں نے علی بیگ کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لئے پھر حملہ کیا اور ملتان کی طرف تباہی مچا دی۔ سلطان کے جرنیل غازی بیگ تغلق نے انہیں زبردست شکست دی اور ہزاروں منگولوں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ ان کے بچے اور عورتیں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں لونڈی غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیئے گئے۔

منگولوں کا آخری بڑا حملہ اقبالمند کی قیادت میں ہوا۔ اس بار بھی تغلق نے ان کو شکست دی۔ کئی ہزار قید ہو کر موت کے گھاٹ اترے۔ تغلق نے کابل تک ان کا تعاقب کیا۔ اس شکست کے بعد منگولوں کو تو پھر کبھی ہندوستان پر جارحیت کی جرأت نہ ہوئی لیکن تغلق نے جارحانہ طرزِ عمل اختیار کر کے انہیں دفاعی حالت میں رہنے پر مجبور کر دیا۔

سلطان علاء الدّین کا عہد کئی لحاظ سے باقی بادشاہوں سے مختلف ہے:

۱۔ اس کے عہد میں پہلی بار دکن کی فتح کی طرف توجہ دی گئی۔ کیوں کہ برسرِ اقتدار آنے سے قبل ہی اس کو دکن کی دولت سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اپنی گورنری کے زمانے میں دیوگڑھی کو فتح کر

کے اس نے بے شمار مال غنیمت حاصل کیا تھا۔ دیوگڑھی کو دوبارہ ۱۳۰۸ء میں فتح کیا۔ ۱۳۰۹ء میں درنگل ایک بار کی ناکامی کے بعد فتح ہوا۔ یہاں کی مال غنیمت میں مشہور عالم ''کوہ نور'' ہیرا بھی شامل تھا۔ دوارسمدر اور معبر ۱۳۱۰ء میں سرنگوں ہوئے۔ ۱۳۱۲ء میں دکن کی آخری مہم دیوگڑھی کے لئے راجا شنکر دیو کے خلاف تھی جو مرکز کی اطاعت سے روگرداں ہو گیا تھا۔ شنکر دیو کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ ان میں سے اکثر فتوحات سلطان کے بہادر جرنیل ملک کافور کے ہاتھوں انجام پائیں۔ اس سے ملک کافور کا وقار سلطان کی نظروں میں بہت بڑھ گیا۔ دکن کی فتوحات سے بے اندازہ مالِ غنیمت حاصل ہونے کی وجہ سے سلطان کے خزانہ کی مالی حالت بہت مضبوط ہو گئی۔

۲۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں کئی بغاوتیں ہوئیں جنہیں فرو کر دیا گیا۔ پہلی بغاوت نومسلم منگولوں نے کی۔ اس کو اس سختی سے کچلا گیا کہ اب تک ان کا انجام وجۂ عبرت ہے۔ یعنی نہ صرف باغیوں کو قتل کیا گیا بلکہ ان کی عورتیں کو بھی اوباشوں کے سپرد کر دیا گیا۔ ان کی عصمت دری کرائی گئی۔ اور ماؤں کے سامنے ان کے بچے ذبح کر دیئے گئے۔ سلطان کے بھتیجے آکت خان نے تنہائی میں اس پر حملہ کر کے زخمی کر دیا مگر سلطان بچ نکلا۔ اور آکت خان اپنے انجام کو پہنچا۔ سلطان رنتھبور میں مصروف تھا کہ اس کے رشتے کے بھائی عمر خان اور منگو خان نے بغاوت برپا کر دی۔ سلطان نے ان کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی اور یہ دونوں گرفتار ہو کر قتل ہوئے۔ سرکاری اراضی کے ناظم حاجی مولا نے دہلی سے سلطان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر بغاوت کر دی مگر سلطان کے جرنیل

امیر حمید الدین نے اس کو قتل کر کے حالات پر قابو پالیا۔ ہندوؤں نے بھی کئی مقامات پر محصولات کی ادائیگی سے انکار کیا۔

اِن بغاوتوں کے اسباب معلوم کرنے کے لئے سلطان نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ جس نے تحقیقات کے بعد حالات کو بہتر بنانے کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں:

(ا) شراب کا استعمال بند کیا جائے۔ کیوں کہ شراب پی کر امراء کے ذہن میں باغیانہ خیالات آتے ہیں۔

(ب) جاسوسی کا نظام ناکارہ ہے اِن کو از سرِ نو منظم کیا جائے۔

(ج) امراء کی آپس کی رشتہ داریاں گروہ بندیاں پیدا کر دیتی ہیں اور مضبوط دھڑا بغاوت کر دیتا ہے۔

(د) اشیائے صرف کی ارزانی اور آمدنی کی زیادتی کے سبب عوام میں خودسری کے رجحان پنپ رہے ہیں۔ اس لئے ان کی آمدنی پر پابندی عائد کی جائے۔

(س) علاء الدین کے عہد کی تیسری اہم بات اس کی ہمہ گیر نوعیت کی اصلاحات ہیں۔ فوجی اصلاحات نافذ کر کے دفاعی قوت کو زیادہ موثر بنایا۔ تمام زمین کی پیمائش کر کے اس پر نئی شرح سے لگان عاید کیا۔ اقتصادی نظام کو بہتر بنایا۔ تمام اشیائے صرف کی قیمتیں مقرر کیں۔ اجناس کو پیدا کرنے والے علاقوں سے تجارتی مرکزوں میں پہنچانے کا معقول بندوبست کیا۔ قحط کے دنوں میں بھی کسی چیز کی قلت محسوس نہ ہوتی، کیونکہ حکومت اپنے ذخائر سے اِس کمی کو پورا کر دیتی۔ مہنگا کپڑا صرف پرمٹ پر ملتا تھا۔ جو بڑے بڑے عہدہ داروں کو جاری کئے جاتے تھے۔ منڈی کے سارے نظام پر سلطان کا احتساب بہت سخت تھا۔ ذرا سی بدعنوانی پر بڑی کڑی سزائیں دیتا

تھا۔

سلطان علاء الدّین نے تقریباً بیس سال حکومت کی۔ اس کی حکومت کی سرحدیں اپنے تمام پیش روؤں سے وسیع تھیں۔ مگر اس کے آخری ایام خوشگوار نہ گزرے۔ اس نے تمام اختیارات ملک کافور کو سونپ دیئے۔ جس نے اپنی شخصیت کے استحکام کے لئے سلطان کو دوسرے تمام وفاداروں سے بدظن کر دیا۔ کسی کو قتل اور کسی کو قید میں ڈال دیا۔ گجرات اور چتوڑ کی بغاوت کے بعد سلطان حوصلہ ہار بیٹھا اور ۱۹ دسمبر ۱۳۱۶ء کو انتقال کر گیا۔

سلطان کی وفات کے بعد ملک کافور نے اس کے کمسن بیٹے عمر خان کو تخت پر بٹھا دیا۔ دوسرے شہزادوں کو اندھا کر دیا اور ملکہ کو نظر بند کر دیا۔ اِس نے قطب الدّین پر بھی کئی حملے کیئے مگر وہ ہر بار بچ نکلا۔ اس کی اِن حرکتوں کی وجہ سے تمام امراء اس کے خلاف ہو گئے۔

مگر صرف ۳۵ دن کے اقتدار کے بعد وہ مقتول ہو کر اپنے انجام کو پہنچا۔ اِس کے بعد علاء الدّین کا تیسرا بیٹا قطب الدّین مبارک شاہ تخت پر بیٹھا۔

قطب الدّین مبارک شاہ، (۱۳۱۷ء تا ۱۳۲۱ء)

ملک کافور کا خاتمہ ہوا تو سلطان علاء الدین خلجی کے ایک اور بیٹے قطب الدین کو تخت پیش کیا گیا۔ یہ شہزادہ اقتدار کی کشمکش کے دوران میں قید رہا تھا۔ چونکہ اسے قید خانہ کی صعوبتوں کا ذاتی تجربہ تھا اِس لئے اس نے تخت پر بیٹھتے ہی تقریباً ستر ہزار قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ اس نے اپنے باپ کے زمانے کے کئی قوانین بھی منسوخ کر دیئے۔ بہت سے محصولات ختم کر دیئے۔ فوج کو چھ مہینے کی تنخواہ انعام کے طور پر دے دی۔ عوام پر بھی عنایات کا مینہ برسا۔ منشیات پر سے پابندی ہٹا دی گئی۔ اِن بے سوچے سمجھے اقدامات کی وجہ سے وقتی طور پر تو عوام اس کے حامی بن گئے مگر درحقیقت انتظام سلطنت بری طرح متاثر ہوا۔ حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہوگئیں۔ شاہی وقار خاک میں مل

گیا۔ اِن سب باتوں کے علاوہ بادشاہ کا اپنا طرزِ عمل بھی نہایت پست تھا۔ وہ شراب نوشی اور اس کے لوازمات میں مبتلا ہو گیا۔ علماء اور فضلاء کے بجائے مخنثوں، مسخروں اور بھانڈوں کی محفلیں سجانے کی وجہ سے بادشاہ کا رعب و دبدبہ ختم ہو گیا اور ہر طرف بدامنی پھیل گئی۔

بادشاہ اپنے ایک نومسلم امیر خسرو خان پر بہت مہربان تھا۔ تمام کاروبار حکومت اس کے سپرد تھا۔ اور بادشاہ خود عیاشی میں مدہوش۔ خسرو خان نے بادشاہ کا کلی اعتماد حاصل کر رکھا تھا۔ لیکن دِل سے بادشاہ کا وفادار نہ تھا۔ اور موقعے کی تلاش میں تھا۔ آخر ایک دن موقع پا کر اس نے اپنے بھائی بندوں کے ساتھ مل کر قطب الدین مبارک شاہ کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن گیا۔

خسرو جیسے کمین کا اِس منصب پر فائز ہو جانا تاریخ میں ایک حادثہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے برسرِ اقتدار آ کر بظاہر مسلمان رہتے ہوئے اسلام کی بیخ کنی شروع کر دی۔ اپنے ہندو عزیزوں کو بڑے بڑے عہدے عطا کئے۔ اسلامی قوانین منسوخ کر دیئے۔ مسجدیں مسمار ہو گئیں اور مندروں کی تعمیر شروع ہو گئی۔ خلجی خاندان کے تمام برسر آوردہ افراد کو قتل کر دیا گیا۔ اس نے سب سے بُری حرکت یہ کی کہ مخنث ہونے کے باوجود علاء الدین خلجی کی تیسری بیوی دیول دیوی سے شادی کر لی جس کے حسن کا شہرہ عام تھا۔ اِن سب باتوں کے باعث عوام میں اس کے خلاف نفرت کے جذبات شدید ہو گئے۔ بالآخر لاہور کے قابل اور بہادر حاکم غازی ملک تغلق نے اِس بدفطرت سے نجات حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ غازی ملک تغلق کا ایک بیٹا خسرو خان کے ماتحت دہلی میں تھا۔ وہ بھی کسی طرح سے وہاں سے نکل آیا۔ اب اس نے خسرو کے خلاف کاروائی میں حصہ لینے کے لئے آس پاس کے صوبہ داروں کو دعوت دی جو کچھ نے قبول کی اور کچھ نے مسترد۔ تیاری مکمل کرنے کے بعد ملک تغلق نے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ خسرو بھی مقابلے کے لئے نکلا۔ مگر شکست کھا کر بھاگا اور ایک باغ سے گرفتار ہو کر قتل ہوا۔

غازی ملک تغلق دوسرے دِن شہر میں داخل ہوا اور اس نے امراء کے سامنے

اعلان کیا کہ اگر سلطان علاء الدّین خلجی کے خاندان میں سے کوئی موجود ہو تو اس کو تخت نشین کر دیں لیکن سُلطان کے خاندان کے تمام شہزادے جنگِ اقتدار کی نذر ہو چکے تھے۔ اِس لئے امراء کے اصرار پر غازی ملک تغلق نے غیاث الدّین تغلق کے نام سے تخت کو زینت بخشی اور اِس طرح دہلی کے تیسرے حکمران خاندان کی ابتداء ہوئی۔

تغلق خاندان

غیاث الدین تغلق، (۱۳۲۱ء تا ۱۳۲۵ء)

غیاث الدین تغلق کا باپ ترکی الاصل اور ماں ہندوستان کے جاٹ قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ معمولی حیثیت سے زندگی کی ابتداء کی اور اپنی شجاعت، تدبر اور دیانت کی وجہ سے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوا۔ ۱۳۰۵ء میں سلطان علاء الدین خلجی نے تغلق کو دیپالپور کا حاکم مقرر کیا اور سرحدوں کی حفاظت بھی اس کے ذمے کی۔ اِس ذمہ داری کو اس نے کماحقہٗ نبھایا اور منگولوں کے کئی حملوں کو ناکام بنایا۔ منگولوں کے خلاف کامیابیوں کی وجہ سے اسے امراء کی صف میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔ اِس کے اسی شاندار پس منظر کے سبب سے اسے بادشاہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔

مسند اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے غیاث الدین تغلق نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو عہدے دیئے۔ داخلی امن قائم کرنے کے لئے بادشاہ نے افسروں کو اعتماد میں لیا۔ اب تک مستعمل آمرانہ روش چھوڑ کر اس نے ملکی مسائل پر امراء سے مشورے لینا بھی شروع کر دیا۔ ہر شعبہ حکومت میں اصلاحات نافذ کیں۔ انتظامیہ مفلوج ہو چکی تھی اس کی از سرِ نو تنظیم کی۔ زرعی اصلاحات نافذ کیں پہلے کے جن زرعی قوانین سے لوگوں کی حق تلفی ہوئی تھی ان کو منسوخ کیا۔ حکومت کو زراعت کے شعبے سے جو آمدنی ہوتی تھی اس کے بارے میں غیاث الدین تغلق نے حکام کو کہا کہ مالیہ کی شرح میں اضافہ کرنے سے حکومت کی آمدنی نہیں بڑھے گی بلکہ زیادہ رقبہ پر کاشت کاری سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو گا۔ اس کے حکم سے تمام غیر آباد زمینوں کو آباد کیا گیا۔ اِس سے کسانوں کی حالت بھی بہتر ہو گئی اور حکومت کو بھی خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ کسانوں کی سہولت کے لئے اور بھی کئی قانون بنائے گئے۔ فوجی اصلاحات سے فوج کی کارکردگی بہت بہتر ہو گئی۔ سلطان نے معذور

لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے بھی کئی اقدامات کئے۔ شراب نوشی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ہندو رعایا کو اپنا حامی بنانے کے لئے اس نے ان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کیا۔ ان اقدامات سے داخلی عمل قائم ہو گیا۔

خارجی معاملات میں وہ اپنی سرحدوں کو وسیع کرنے کی حکمتِ عملی پر گامزن ہوا۔ ۱۳۲۱ء میں اس نے اپنے بیٹے جونا خان کو ورنگل فتح کرنے کے لئے بھیجا۔ مگر بعض وجوہات کی بنا پر یہ مہم ناکام ہو گئی۔ ۱۳۲۳ء میں دوسری مہم روانہ کی گئی۔ اس مرتبہ بیدر کا قلعہ فتح کرنے کے بعد ورنگل کا محاصرہ کر لیا گیا۔ بالآخر فتح شاہی لشکر کے حصے آئی۔ اور ورنگل کا نام سلطان پور رکھ دیا گیا۔ بنگال میں ان دنوں جنگِ اقتدار جاری تھی۔ سلطان بذاتِ خود بنگال گیا اور بیشتر بنگال کو اپنی سلطنت میں شامل کر دیا۔ اس کامیاب مہم سے سلطان کی واپسی پر شہزادہ جونا خان جو دہلی میں قائم مقام تھا، نے شہر سے باہر بادشاہ کا شایانِ شان استقبال کرنے کا فیصلہ کیا۔

شہر سے باہر لکڑی کا ایک عارضی محل تعمیر کیا گیا۔ جب بادشاہ اس میں فروکش تھا تو اچانک اس کی چھت گر گئی جس سے بادشاہ اور چھوٹے شہزادے محمود خان کے علاوہ چند امراء بھی دب کر مر گئے۔

سلطان غیاث الدین تغلق ایک پکا مسلمان تھا۔ ایک قابل جرنیل ہونے کے علاوہ مملکت کے انتظامی امور کا بھی ماہر تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں اور عوام کی نفسیات کو سمجھتا تھا۔ سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ہر قسم کا اختیار حاصل ہونے کے بعد بھی اس کے دماغ میں فرعونیت نہ آئی۔ جب وہ برسرِ اقتدار آیا تو حکومت کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ اس نے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کیا۔ اس کے حسنِ انتظام کی وجہ سے تاج کی عظمت لوٹ آئی۔ داخلی اور خارجی طور پر تمام خطرات دُور کر دیئے۔ اور اس کے جانشین کو ورثہ میں ایک مضبوط اور مستحکم سلطنت ملی۔

سلطان محمد تغلق، (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء)

سلطان غیاث الدین تغلق کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا سلطان محمد تغلق کے نام سے سریر آرائے تخت ہوا۔ سلاطین دہلی میں سے محمد تغلق ایک منفرد مقام کا مالک ہے۔ اِس جیسا عالم فاضل اور مدبر کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔ اس نے جس قدر رفاہ عامہ کے کام کئے وہ کوئی دوسرا نہیں کر سکا۔ اس کا ذہن جدیدیت کی طرف مائل تھا۔ وہ حکومت کے ہر شعبے میں نئے نئے تجربات کرنا چاہتا تھا۔ مثلاً اس نے تانبے کے سکے جاری کئے اور دارالحکومت کو ایک زیادہ موزوں جگہ منتقل کیا۔ مورخین اس کے بارے میں مختلف آراء رکھتے ہیں۔ بعض اِس کے اِن اقدامات کی حمایت کرتے ہیں اور بعض اِس کے برعکس اِس کو سنکی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ اس نے جتنے اقدامات کئے ان کا نتیجہ مثبت نہ نکلا۔

اِس کے عہد حکومت کا پہلا اہم واقعہ پنجاب پر ترما شیرین خان کا حملہ ہے۔ ترما شیرین چغتائی قبیلے کا سردار اور تاتاریوں کا نامور جرنیل تھا۔ وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ ملتان اور برصغیر کے شمالی اضلاع کو روندتا ہوا دہلی تک جا پہنچا۔ ابھی سلطان محمد تغلق کی حکومت مستحکم نہ ہوئی تھی۔ سلطان نے اپنے آپ کو کمزور سمجھتے ہوئے تاتاریوں کو ایک بڑی رقم دے کر واپس بھیجا۔ عوام و خواص نے سلطان کے اس اقدام کو پسند نہ کیا۔ واپسی پر منگول، گجرات اور سندھ کو اجاڑنے کے علاوہ کئی ہزار افراد کو بھی پکڑ کر لے گئے۔

۱۳۳۷ء میں بادشاہ نے چین کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے ایک لاکھ شہسواروں کا لشکر جرار اپنے بھتیجے خسرو خان کی قیادت میں اس مقصد کے لئے بھیجا۔ اپنے ذرائع مواصلات کو محفوظ رکھنے کے لئے ہمالیہ کے سلسلہ کوہ میں چھوٹے چھوٹے قلعے تعمیر کئے۔ جب یہ لشکر چین میں داخل ہوا تو اسے ایک بہت بڑی فوج کا سامنا کرنا پڑا۔ موسم برسات نے ان کی مشکلات میں اضافہ کر دیا۔ پسپائی بھی کسی منصوبہ بندی کے بغیر ہوئی۔ اور یہ لشکر انتہائی تباہ حالی میں واپس پہنچا۔

۱۳۴۱ء میں ایک طاقتور افغان سردار شاہو نے پنجاب میں لوٹ مار شروع کر دی۔ ملتان کے حاکم بزاد خان نے اس کے مقابلے میں شکست کھائی اور مارا گیا۔ افغانوں نے سارے صوبے کا امن تہ و بالا کر دیا۔ بادشاہ نے یہ سن کر ایک فوج کے ساتھ پنجاب کا قصد کیا مگر افغان اس کے پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہو گئے۔ تو سلطان بھی راستے سے واپس آ گیا۔

۱۳۴۱ء ہی میں گھگڑ سردار ملک حیدر خان نے پنجاب پر حملہ کر دیا۔ لاہور کے حاکم تاتار خان نے جنگ میں اس سے شکست کھائی اور خود بھی کام آیا۔ سلطان نے اس واقعے کے بعد ملک جہان کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی جس نے گھگڑوں کو شکست دے کر بھگا دیا اور اپنا ملک خالی کرا لیا۔

۱۳۴۲ء کے دو واقعات بہت اہم ہیں۔ پہلا واقعہ عباسی خلیفہ کے منشور سے متعلق ہے۔ جس سے سلطان کو حکومت کرنے کا ایک شرعی جواز مل گیا۔ خلیفہ کے ایلچی کا تاریخی استقبال کیا گیا۔ بادشاہ خود برہنہ پا اس کے خیر مقدم کو گیا۔

دوسرا واقعہ ابنِ بطوطہ کی سفارت پر چین روانگی سے متعلق ہے۔ چین کے بادشاہ نے ہمسایہ ملک ہندوستان کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے لئے سلطان کو تحائف بھیجے۔ جواباً سلطان نے ابنِ بطوطہ کو سفیر بنا کر بھیجا۔ ابنِ بطوطہ نے یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

سلطان محمد شاہ تغلق کے زمانے میں کئی بغاوتیں ہوئیں۔ ابتدائے عہد میں ہی گرشاسب نے بغاوت کی۔ ابھی اس کی بغاوت فرو کی ہی تھی کہ ملتان کے حاکم بہرام ایبہ نے ۱۳۲۸ء میں بغاوت کر دی۔ سلطان خود ملتان گیا اور کامیاب لوٹا۔ ۱۳۳۵ء میں معبر میں بغاوت ہوئی۔ سلطان لشکر لے کر گیا لیکن راستے میں فوج میں وباء پھوٹ پڑی جس کی وجہ سے بادشاہ کو واپس آنا پڑا اسی دوران میں لاہور کے حاکم امیر حلاجو نے کھوکھروں کے تعاون سے بغاوت کر دی۔ سلطان کے جرنیل خواجہ جہان نے فوراً اس کی سرکوبی کی۔ ۱۳۳۵ء کے اواخر میں دولت آباد کے حاکم ہوشلگ نے خود مختاری کا اعلان کر دیا لیکن بعد

میں نائب ہو گیا۔ اور سلطان نے اسے معاف کر دیا۔ ۱۳۳۶ء میں تمام دکن بغاوت کی لپیٹ میں آ گیا۔ دو ہندو بھائیوں ہری ہرا اور بکا نے دریائے بھدرا کے کنارے وجیا نگر کو مرکز بنا کر ایک ریاست کی بنیاد رکھی۔ بعد میں اِس ریاست نے بہت ترقی کی اور تقریباً تمام دکن اِس کے زیرِنگیں آ گیا۔ ۱۳۳۷ء میں بنگال میں بغاوت ہوئی۔ سلطان دیگر مصروفیات کی وجہ سے بنگال کی طرف فوری طور پر توجہ نہ دے سکا۔ عین الملک جو سلطان کے معتمد ترین امراء میں سے تھا اور اودھ کا حاکم تھا، نے ۱۳۴۱ء میں زبردست بغاوت کی مگر پھر پشیمان ہوا اور بقیہ زندگی سلطان کا وفادار ہی رہا۔

۱۳۴۴ء میں ورنگل بھی مرکزی اطاعت سے روگرداں ہوا۔ سلطان نے اس پر بھی قابو پا لیا۔ ۱۳۴۷ء میں دولت آباد کے امیران صدہ نے سلطان کی اطاعت سے انحراف کر کے اسمٰعیل پاشا کو بادشاہ بنا لیا۔ لیکن وہ فوراً ہی اقتدار سے الگ ہو گیا۔ اور اس کی جگہ حسن خان نے زمام حکومت سنبھالی۔

سلطان محمد تغلق کے درباری امراء بہت طاقتور ہو گئے۔ ان کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے سلطان نے ایک مقبول عوام شخص عزیز کو حاکم بنایا۔ اس نے ان کے خلاف کافی سخت اقدامات کئے۔ ان میں سے نوّے امراء کو قتل بھی کر دیا گیا۔ ان خبروں نے گجرات اور دیوگڑھی کے باغی عناصر کے لئے مہمیز کا کام کیا۔ گجرات میں باغیوں کے سرغنہ تغی خان نے صدر مقام انہلواڑہ پر قبضہ کر کے شاہی اثاثے لوٹ لئے۔ ۱۳۴۵ء میں سلطان اس کی سرکوبی کے لئے گیا۔ حاکم دیوگڑھی نے تمام باغیوں کو اس کے حکم سے گرفتار کر کے بھیج دیا۔ راستے میں یہ لوگ محافظوں کو قتل کر کے واپس دیوگڑھی پہنچ گئے اور وہاں تمام لوگ بادشاہ کے خلاف ہو گئے۔ سلطان دیوگڑھی پہنچا۔ اسی دوران میں سعدت میں تغی خان نے بغاوت برپا کر دی۔ سلطان نے اِس مہم کو یہیں چھوڑا اور تغی کو جا کر عبرت ناک شکست دی۔ تغی خان سندھ کی طرف بھاگ نکلا۔ سلطان اِس کے تعاقب میں سندھ کی طرف روانہ ہوا مگر ٹھٹھہ کے قریب راستے ہی میں اچانک فوت ہو گیا۔

سُلطان فیروز تغلق، (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء)

سلطان محمد تغلق نے اپنی لاہور کی حاکمیت کے زمانے میں اپنے چھوٹے بھائی رجب کی شادی پنجاب کے ایک بھٹی راجپوت خاندان میں کر دی۔ فیروز اس کے اسی بھائی کا بیٹا تھا۔ کمسنی میں ہی شفقتِ پدری سے محروم ہو کر سلطان تغلق کے سایۂ عاطفت میں آیا۔ سلطان نے اس کی پرورش و تربیت بہت اہتمام سے کی۔ سلطان اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ کئی اہم عہدوں پر فائز رہنے کے بعد سلطان کی وفات پر وصیّت کے مطابق فیروز تغلق نے عنانِ حکومت سنبھالی۔

دہلی میں امیر الامراء خواجہ جہان احمد ایاز نے ایک چھ سالہ بچے کو مرحوم سلطان کا فرزند ظاہر کر کے تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن فیروز کے دہلی کے قریب پہنچنے پر خواجہ جہان نے محسوس کیا کہ اس کی طاقت سلطان فیروز سے کم ہے۔ اسی لئے اس نے فیروز شاہ کے حق میں دستبردار ہو کر معذرت خواہی کی۔ فیروز شاہ نے اس کی معذرت قبول کر کے ساماز کا علاقہ عطا کیا۔ لیکن سلطان کے اشارے سے ساماز کے حاکم شیر خان نے اسے راستے میں ہی قتل کرا دیا۔ اور اِس طرح فیروز کے راستے سے ایک بہت بڑا مخالف ہٹ گیا۔

اپنے عہد حکومت کے ابتدائی حصے میں بادشاہ نے کئی تعمیراتی کام کیے۔ خاص کر زراعت کی ترقی کے لئے کئی نہریں کھدوائیں۔ ۱۳۵۳ء میں دریائے سرسوتی کے کنارے ایک عالی شان محل بنوایا۔ ۱۳۵۴ء میں دہلی سے ملحق ایک نیا شہر بسایا جس کا نام ''فیروز آباد'' رکھا۔ اِسی سال ۱۲ جولائی ۱۳۵۴ء کو دیپال پور میں ایک نہر کا افتتاح کیا۔ حصار میں ایک بہت بڑا قلعہ تعمیر کرایا، جس کا نام ''حصار فیروزہ'' رکھا۔ اپنے بسائے شہر کو سیراب کرنے کے لئے دریائے سرسوتی سے ایک نہر نکلوائی۔

۱۳۵۸ء میں منگولوں نے پنجاب پر حملہ کیا۔ سلطان نے اپنے ایک امیر کابل خان کو اِن کو سرکوبی کے لئے بھیجا۔ تاتاری دیپال پور تک بڑھ آئے۔ مگر شاہی افواج کی آمد کی اطلاع سن کر واپس چلے گئے۔ فیروز خان کے زمانے میں پنجاب میں کوئی اہم واقعہ

رونما نہ ہوا۔ اِس کے زمانے میں نصیر الملک لاہور کا حاکم تھا۔ بادشاہ صرف ایک بار پنجاب آیا اور راجاؤں سے خراج وصول کر کے واپس دہلی چلا گیا۔

فیروز شاہ اڑتیس سال حکومت کرنے کے بعد نوّے برس کی عمر میں ۲۳ اکتوبر ۱۳۸۸ء کو انتقال کر گیا۔ اس کے عہد میں رفاہ عامہ کے بہت سے کام ہوئے۔ مدارس، شفاخانے، مساجد، پل، تالاب، سرائیں، نہریں، حمام اور سڑکیں وغیرہ تعمیر کرانے میں تاریخ اِس کا ثانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔

فیروز کے جانشین

فیروز تغلق کے بعد اس کا پوتا غیاث الدّین تخت دہلی پر جلوہ فگن ہوا۔ لیکن ناتجربہ کاری کے باعث فروری ۱۳۸۹ء کو اپنے وزیر کے ہمراہ قتل کر دیا گیا۔ غیاث الدّین کے بعد فیروز کا ایک اور پوتا ابوبکر تخت نشین ہوا۔ لیکن نومبر ۱۳۸۹ء میں فیروز شاہ کے بیٹے محمد تغلق نے اس کو جنگِ اقتدار میں شکست دی۔ اور خود ناصر الدّین محمد شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ اِس نے صرف چار سال حکومت کی تھی کہ اچانک ۲۰ جنوری ۱۳۹۴ء کو فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں بھی صرف پینتالیس روزہ شاہی کے بعد انتقال کر گیا۔ اس کے بعد فیروز شاہ کا دوسرا بیٹا محمود، ناصر الدین محمود کے نام سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ مرکز کی کمزوری کی وجہ سے دوآبہ اور گجرات کے علاقے مرکز کی اطاعت سے روگردان ہو گئے۔ دہلی کے امراء نے فیروز شاہ کے پوتے نصرت خان کی بادشاہت کا اعلان کر کے سیاسی بحران میں اضافہ کر دیا۔ اسی اندرونی انتشار سے فائدہ اٹھا کر امیر تیمور نے ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ ۱۳۹۸ء میں محمود تغلق کے ساتھ ہی تغلق خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

امیر تیمور کا حملہ

امیر تیمور ترکوں کے ایک قبیلے برلاس کے سردار امیر طرغئی کا بیٹا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد پینتیس برس کی عمر میں قبیلے کا سربراہ بنا۔ فوجی وانتظامی صلاحیتیں اور سیاسی شعور اِس کو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ طبیعت مہم جُو تھی۔ اس نے سب سے پہلے آس پاس کے قبیلوں کو زیرِ نگیں کیا اور پھر اپنی قوت کو بڑھانے کے لئے عراق اور افغانستان پر قبضہ کیا۔ مؤرخین نے امیر تیمور کے ہند پر حملے کے کئی اسباب بیان کئے ہیں۔ اہم وجہ یہاں کی دولت تھی۔

سلطنت دہلی کے داخلی انتشار نے تیمور کو وہ موقع فراہم کیا۔ جس کا اسے انتظار تا۔ مورخین کے خیال میں دربار دہلی کے بعض مقتدر امراء تیمور کو دربار کے تمام حالات سے آگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ہراول کے طور پر اس نے اپنے پوتے پیر محمد کو ہندوستان روانہ کیا اور خود جملہ انتظامات مکمل کرنے کے بعد اپریل ۱۳۹۸ء میں سمرقند سے روانہ ہوا۔ ۱۳ ستمبر ۱۳۹۸ء کو اِس نے دریائے سندھ عبور کیا۔ اس علاقے کے حاکم شہاب الدّین مبارک نے مزاحمت کی مگر شکست کھا کر فرار ہوتے وقت اپنے خاندان کے ساتھ دریائے جہلم میں غرق ہو گیا۔ تیمور نے ۱۳ اکتوبر کو دریائے جہلم اور راوی کوان کے سنگم کے مقام سے پار کیا اور تلمبا جا پہنچا۔ اگرچہ یہاں کے لوگوں نے مطلوبہ رقم ادا کردی تھی مگر اس نے قتل عام بھی کیا اور لوٹ مار بھی کی۔ پاکپتن کے لوگوں کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ دیپال پور کے عوام کو تیموری سپاہیوں کو قتل کرنے کی کڑی سزا ملی۔ بھٹنیر کا راجہ تیمور کی راہ میں حائل ہوا مگر بعد میں شکست کھائی۔ خراج کی ادائیگی میں شہریوں نے رکاوٹ پیدا کی جس پر تیموری جبیں شکن آلود ہو گئی۔ باشندے قتل ہوئے اور شہر نذرِ آتش۔

امیر تیمور سرسہ اور فتح آباد میں تباہی مچاتا ہوا آگے بڑھا۔ ۲۲ نومبر ۱۳۹۸ء کو

تمام فوج کیتھل سے پانی پت کی طرف بڑھی۔ ۷ دسمبر کو فوج کے ہراول دستے دہلی کے مضافات میں پہنچ گئے۔ دو روز بعد امیر تیمور بھی باقی فوج کو لے کر پہنچ گیا۔ اگلے روز لونی کے قلعے کو فتح کر کے مقامی لوگوں کو قتل کر دیا۔ دہلی کی فوج نے دریا کے اس کنارے پر ایک ابتدائی حملہ کیا مگر شکست کھائی اور شہر میں محصور ہو گئے۔ امیر تیمور نے راستے سے تقریباً ایک لاکھ قیدی پکڑے تھے۔ جو ابھی تک اس کے ساتھ تھے۔ اس نے ان سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے ان سب کو قتل کرا دیا۔

تیمور نے منجموں کے منع کرنے کے باوجود ۱۵ دسمبر ۱۳۹۸ء کو دریائے جمنا عبور کیا۔ سلطان دہلی نصیر الدین محمود اور اس کے وزیر اقبال ملّو نے شہر سے باہر آ کر راستہ روکا۔ تیمور نے جنگی تیاریاں مکمل کر کے ۱۷ دسمبر کو جنگ چھیڑ دی۔ دونوں فوجیں بہت جانفشانی سے لڑیں مگر فتح تیمور کو حاصل ہوئی۔ شہر پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اور محمود گجرات کی طرف اور اقبال ملّو بلند شہر کی طرف فرار ہو گئے۔ شہر کے اکابرین نے حاضر ہو کر شہریوں کے لئے امان چاہی جو عطا کی گئی۔ مگر ایک مقام پر شہریوں اور فوجوں کا جھگڑا ہو گیا جس کی بنا پر قتل عام کا حکم ہوا۔ کئی دن تک شہر میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جاتی رہی۔ فوجیوں نے جی بھر کر لوٹ مار کی۔ تقریباً تمام شہری لونڈی غلام بنا لئے گئے۔ معمار تو خاص طور پر سمرقند لے جانے کے لئے پکڑ لئے گئے تاکہ وہاں وہ ایسی ہی خوبصورت عمارتیں بنا سکیں جیسی انہوں نے دہلی میں بنا رکھی تھیں۔ وہ دہلی جو اب وجہ عبرت تھی۔

دہلی میں اپنے پندرہ روزہ خونی قیام کے بعد تیمور نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ میرٹھ کے لوگوں نے مزاحمت کی جس کا نتیجہ قتلِ عام اور آتش زدگی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تمام عمارتیں زمین بوس کر دی گئیں۔ یہاں سے وہ دریائے گنگا کی جانب بڑھا۔ وہاں بہت سے ہندو زائرین کشتیوں سمیت غرق کر دیئے گئے۔ دریا کو پار کر کے مبارک شاہ کی فوج کو شکست دی۔ ہردوار میں دو ہندو فوجوں سے فتح حاصل کرتا اور قتل غارت گری کرتا کانگڑے جا پہنچا۔ وہاں سے جموں گیا۔ وہاں کے راجہ نے مسلمان ہو کر اطاعت کا اعلان کر دیا۔ کشمیر سے بھی ایسا ہی پیغام ملا۔

امیر تیمور نے جموں میں ایک عام دربار منعقد کیا۔ جس میں اس نے سید خضر خان کو ملتان، لاہور اور دیپال پور میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود بے انداز مال غنیمت اور قیدیوں کے ساتھ واپس سمرقند چلا گیا۔ تیمور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح واپس چلا گیا۔ لیکن اِس مختصری مدت میں اس نے اپنے پیچھے تباہی اور بربادی کے ایسے نشانات چھوڑے جو طویل مدّت تک عبرت کے نشان بنے رہے۔ اس اکیلے نے اتنی تاخت و تاراج کی جتنی تمام حملہ آور بھی نہ کرسکے۔ اور تیموری حملے کے اثرات عرصے تک محو نہ ہوسکے۔

تیمور کا حملہ تغلق کے زوال پذیر اقتدار کے لئے آخری دھکا ثابت ہوا۔ اب اس کے دائرۂ اختیار میں صرف دہلی اور اس کے مضافات تھے۔ تیمور کے واپس جانے کے بعد کئی ماہ تک دہلی میں اقتدار اعلیٰ کا مظہر کوئی نہ تھا۔ بعد میں نصرت شاہ نے حکومت سنبھالی۔ دوآبہ گنگا جمنا میں اقبال ملّو حکمران تھا۔ اس نے نصرت شاہ کو دہلی سے بھگا کر محمد شاہ کو قنوج سے واپس بلالیا لیکن اختیارات ملّو اقبال کے ہاتھ ہی میں رہے۔ اس صورتِ حال سے تنگ آکر محمد شاہ تغلق قنوج میں ہی سکونت پذیر ہوگیا۔

۱۴۰۸ء میں اقبال ملّو نے پنجاب پر حملہ کیا لیکن پنجاب کے حاکم سید خضر سے شکست کھا کر قتل ہوا۔ اِس کے قتل کے بعد محمود تغلق واپس دہلی آگیا۔ اور دولتِ خان لودھی کے تعاون سے اپنی حکومت قائم کرلی۔ وہ سلطنت کا انتظام دولت خان لودھی کے سپرد کر کے خود غافل ہوگیا۔ سید خضر خان نے دہلی پر حملہ کیا لیکن شہر کے محاصرے کے دوران اس کے لشکر میں وباء پھوٹ پڑی جس کی وجہ سے اسے واپس جانا پڑا۔ ۱۴۱۳ء میں محمود شاہ تغلق فوت ہوگیا تو امراء نے دولت خان لودھی کو اپنا بادشاہ بنالیا۔ جو کم وبیش دو سال حکمران رہا۔ سیّد خضر نے دوسری بار دہلی پر چڑھائی کی۔ شہر کے دو ماہ کے محاصرے کے بعد اس نے ۲۸ مئی ۱۴۱۴ء کو اسے فتح کیا۔ اِس کے ساتھ ہی سلطنت دہلی تغلق خاندان کے ہاتھ سے نکل کر سیّد خضر کے ہاتھ آئی جس نے خاندان سادات کی بنیاد رکھی۔

سیّد خاندان

فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں ملتان کا حاکم ملک مردان دولت تھا جس کی وفات کے بعد ملک شیخ اور اس کے بعد ملک مردان دولت کا متبنیٰ سید سلیمان علی الترتیب ملتان کے حاکم ہوئے۔ سیّد سلیمان کا جانشین اِس کا بیٹا سید خضر خان ہوا۔ جب تیمور برصغیر میں آیا تو سید خضر خان نے اس کے لئے کئی سہولتیں مہیا کیں جس کے صلے میں امیر تیمور نے اسے ملتان اور لاہور وغیرہ کے علاقے میں اپنا نائب مقرر کر دیا۔ یہی نیابت، سلطنتِ دہلی پر اس کے استحقاق کا جواز بن گئی۔

سیّد خضر خان، (۱۴۱۴ء تا ۱۴۲۱ء)

سید خضر نے تخت دہلی پر فائز ہونے کے بعد اپنے آپ کو بادشاہ نہ کہلوایا بلکہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو امیر تیمور کا نائب ہی گردانتا رہا۔ سکّے اور خطبے میں بھی امیر تیمور کا نام استعمال ہوتا تھا اور دہلی سے اس کی خدمت میں تحائف بھیجے جاتے تھے۔ سید خضر نے امیر تیمور کی وفات کے بعد بھی خودمختاری اختیار نہ کی اور اب وہ اپنے آپ کو امیر تیمور کے بیٹے شاہ رخ کا نائب کہتا تھا۔ اور اس کا نام خطبے اور سکے میں رائج ہوا۔ سید خضر، شاہ رخ کی خدمت میں بھی تحائف بھیجتا تھا۔

خضر خان کے اس طرزِ عمل کی مختلف توجیہات کی جاتی ہیں۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ واقعہ وہ دل سے امیر تیمور اور اس کے گھرانے کا مخلص تھا۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ امیر تیمور کا نام لوگوں کے دلوں میں خوف و دہشت پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ کیونکہ امیر تیمور کا نام برصغیر میں وحشت اور بربریت کی علامت بن چکا تھا۔ ا سکے مظالم کی تلخ یادیں ابھی تک لوگوں کے اذہان میں موجود تھیں اور خضر خان جب امیر تیمور کا نام لیتا تو عوام کے دلوں میں کپکپی چھوٹ جاتی۔ اور اگر کسی کے ذہن میں بغاوت کی

چنگاری ہوتی بھی تو فوراً ہی سرد ہو جاتی۔

سید خضر خان میں قائدانہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس نے بہت سے علاقوں کو جو مرکز سے الگ ہو گئے تھے دوبارہ حکومت میں شامل کیا۔ اس کا ذاتی کردار نہائیت اعلیٰ درجے کا تھا۔ وہ ایک پاکباز اور شریف النفس انسان تھا۔ وہ اپنے دور میں سخاوت، شجاعت، حلم، علم، حیا اور تقوے میں ممتاز ترین تھا۔ جبر و تشدد سے ہمیشہ اجتناب کرتا۔ اس کے بارے میں مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ لفظ ''سیّد'' اپنے تمام تر معنوی پس منظر کے ساتھ اس کی شخصیت پر منطبق ہوتا ہے۔

گوالیار اٹاوہ کی مہموں میں مصروف تھا کہ اچانک بیمار ہو گیا۔ اسے فوراً دہلی پہنچایا گیا۔ جہاں مئی ۱۴۲۱ء میں اس نے وفات پائی۔ عوام نے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے تین دن تک اس کا سوگ منایا۔

سُلطان مُبارک شاہ، (۱۴۲۱ء تا ۱۴۳۴ء)

سید خضر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سید مبارک تخت نشین ہوا۔ سید مبارک بھی اپنے باپ کی طرح صاحبِ تدبر اور اصول جہانبانی سے واقف تھا۔ مگر اس قدر انتشار میں مبتلا حکومت کو چلانا اس کے لئے بہت مشکل تھا۔ چنانچہ مرکز کی کمزوری کی وجہ سے کئی بغاوتیں ہوئیں۔ جسرت کھوکھر نے پنجاب میں بہت اودھم مچایا۔ وہ اپنی پہاڑی کمین گاہوں سے نکلتا، لوٹ مار کرتا اور جب شاہی لشکر اس کے تعاقب میں آتا تو پھر واپس پہاڑوں میں چلا جاتا۔ ۱۴۲۳ء میں سلطان مبارک شاہ نے ہندو ریاستوں کٹیسر، اٹاوہ، کمپیلا وغیرہ پر لشکر کشی کر کے انہیں اپنا باج گزار بنایا۔ بھانہ کے گورنر محمد خان کی بغاوت کو کُچلا۔

جونپور کے حاکم ابراہیم شرقی نے دہلی پر قبضہ کرنے کے لئے فوج کشی کی مگر کالی ندی کے مقام پر شاہی فوجوں نے اسے شکست دی اور وہ واپس فرار ہو گیا۔ میوات کے سردار قدر میواتی کی ابراہیم شرقی کے ساتھ تعاون کرنے کی وجہ سے سرزنش کی گئی۔ مگر وہ

بھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۴۲۹ء میں ایک ترک امیر فولاد نے بغاوت کر دی اور بھٹنڈہ پر قبضہ کر لیا۔ اس نے پنجاب کے باغی کھوکھروں اور کابل کے نو مسلم حاکم شیخ علی کو ساتھ ملا لیا۔ مگر شاہی لشکر نے ان سب کو شکست دی۔

سلطان مبارک شاہ شکی مزاج انسان تھا۔ اپنے کسی امیر پر اعتبار نہ کرتا تھا۔ جب ایک امیر کوئی کارنمایاں سرانجام دیتا تو اسے معزول کر کے دوسرے کو ترقی دے دیتا۔ اس کے اس طرزِ عمل نے تقریباً تمام امراء کو اس سے بدظن کر دیا اور یوں سلطنت عدم استحکام کا شکار ہو گئی۔ انہی معزول شدگان میں سے ایک امیر سرور الملک نے سازش کر کے ۱۹ فروری ۱۴۳۴ء کو سید مبارک شاہ کو قتل کر دیا۔ مبارک شاہ کے دور کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ''تاریخ مبارک شاہی'' کی تدوین ہے جس میں یحییٰ بن احمد سرہندی نے بڑی تحقیق و جستجو کے بعد شہاب الدین غوری سے لے کر سلطان مبارک شاہ تک واقعات درج کیے ہیں۔

سیّد محمد شاہ، (۱۴۳۴ء تا ۱۴۴۵ء)

سلطان مبارک شاہ کے بعد اس کا بیٹا سید محمد شاہ اس تباہ حال سلطنت کا وارث بنا۔ مبارک شاہ کے قاتل سرور الملک نے وزیر اعظم کی حیثیت سے تمام اختیارات سنبھال لئے۔ اور اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو حکومت پر مسلط کر دیا۔ امراء کا ایک گروہ اس کے خلاف ہو گیا۔ اندرونِ خانہ بادشاہ کی ہمدردیاں بھی اسی گروہ کے ساتھ تھیں۔ اس کش مکش کے نتیجے میں سرور الملک مارا گیا اور اس کا گروہ ختم ہو گیا۔ وزارت کمال الدین کے حصے آئی۔

کمال الدین نے اصلاح احوال کی بہت کوشش کی مگر داخلی اور خارجی عناصر کی وجہ سے حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ ابراہیم شرقی اس تمام عرصے میں اپنی طاقت بڑھاتا رہا۔ مالوہ کے حکمران محمود خلجی نے دہلی تک کا علاقہ روند ڈالا مگر اسے اپنے علاقے پر گجرات کے حکمران احمد شاہ کے حملے کی وجہ سے واپس جانا پڑا۔ پنجاب کے حاکم بہلول لودھی نے

بھی اس موقع پر بادشاہ کی مدد کی۔ اس وجہ سے بادشاہ کی نظروں میں اس کا مقام بہت بڑھ گیا۔ بعد میں بہلول لودھی کے دل میں خود بادشاہ بننے کی آرزو پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس نے جسرت کھوکھر کے تعاون سے دہلی پر قبضہ کیا۔ اس بار تو اس کو ناکامی ہوئی مگر اس کے اس اقدام نے سیّد خاندان کے زوال کو یقینی بنا دیا۔ بعد میں بھی وہ موقع کی تلاش میں رہا۔ دہلی کے آس پاس کے تمام زمیندار بھی باغی ہو گئے۔ اور انہوں نے محصولات کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ اسی عالم حسرت و یاس میں سید محمد شاہ ۱۴۴۵ء میں فوت ہو گیا۔

عالم شاہ، (۱۴۴۵ء تا ۱۴۵۱ء)

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا علاء الدّین شاہ عالم کے نام سے تخت نشین ہوا۔ وہ اپنے باپ سے بھی زیادہ ناکام ثابت ہوا۔ مزاج کا یہ عالم تھا کہ ۱۴۴۷ء میں بدایوں گیا۔ یہ جگہ اسے پسند آ گئی۔ اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ دہلی میں امراء نے بہلول لودھی کو حکومت سنبھالنے کی دعوت دی۔ اس نے ۱۹ اپریل ۱۴۵۱ء کو تخت پر قبضہ کر لیا۔ بہلول نے شاہ عالم کو لکھا کہ میں تو صرف انتظامِ حکومت درست کرنے کیلئے آیا ہوں اور آپ ہی کو بادشاہ تسلیم کرتا ہوں۔ اس لئے دارالسلطنت میں واپس آ جائیں۔ شاہ عالم نے جواب میں کہا کہ میں بدایوں کے سوا تمام سلطنت تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ چنانچہ وہ بدایوں میں ایک پرسکون گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے کے بعد ۱۴۷۸ء میں فوت ہوا۔

عالم شاہ خاندانِ سادات کا آخری بادشاہ تھا۔ اس کے بعد سلطنت خاندان لودھی کو منتقل ہوئی۔

لودھی خاندان

۱۴۵۱ء تا ۱۵۲۶ء

لودھی سلاطین افغانوں کے ایک تجارتی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اِس قبیلے کے افراد ہندوستان اور ایران کے درمیان تجارت کرتے تھے۔ بہلول لودھی کا دادا ملک ابراہیم بھی یہی کاروبار کرتا تھا۔ مگر اس نے فیروز تغلق کے زمانے میں تجارت ترک کر کے ملتان کے حاکم مردان دولت کی ملازمت کر لی۔ ملک ابراہیم کے پانچ بیٹے تھے۔ جن میں سب سے بڑے ملک سلطان نے محمد شاہ اور اقبال ملّو کے خلاف جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ حتیٰ کہ اسی نے وزیرِ اعظم اقبال ملّو کا سر قلم کر کے سید خضر خان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کے اس کارنامے پر خوش ہو کر سید خضر خان نے اس کو سرہند کا حاکم مقرر کر دیا۔ اور اس کے دیگر بھائیوں کو بھی اچھے اچھے عہدے دیئے۔ اس کے ایک بھائی ملک کالے کو بھی جاگیر عطا ہوئی۔ ملک کالے کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام بہلول رکھا گیا۔ بہلول کی پیدائش اس کی ماں کی وفات کا سبب بنی۔ بچپن ہی میں باپ بھی داغِ مفارقت دے گیا۔ تو اس کی پرورش اس کے نانا اسلام خان والیِ سرہند نے کی۔ بعد ازاں اس نے بہلول کو اپنی فرزندی میں بھی لے لیا۔ اسلام خان کی وفات کے بعد سرہند میں اس کا جانشین بھی وہی بنا اور ترقی کرتے کرتے تختِ دہلی پر قابض ہو گیا۔

بہلول لودھی نہایت ابتر حالات میں برسرِ اقتدار آیا۔ شاہی وقار ختم اور سلطنت دہلی کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ تقریباً تمام صوبے خود مختاری کا اعلان کر چکے تھے۔ سلطنتِ دہلی کی حدود صرف چالیس میل رہ گئی تھی۔

۱۴۵۱ء میں بہلول لودھی انتظام سلطنت کے سلسلہ میں دہلی سے روانہ ہوا اور پنجاب آیا۔ ملتان میں اس نے انتظامیہ اور فوج کو نئے سرے سے منظم کیا۔

لیکن اگلے سال حاکم ملتان نے بغاوت کر دی۔ سلطان اس کی سرزنش کے لئے خود آیا اور بغاوت فرو کر دی۔ اور پنجاب میں امن و امان بحال ہو گیا۔

بہلول نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے وزیر اعظم حمید خان کو برطرف کر دیا۔ ملتان کے لنگا قبیلے نے بغاوت کر دی۔ سلطان ان کی طرف جانا ہی چاہتا تھا کہ جونپور کے بادشاہ نے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ دہلی پر چڑھائی کر دی۔ بہلول نے اس کو شکست دی۔ بعد میں والیِ جونپور کے ساتھ کئی معاہدے ہوئے اور کئی بار جنگیں ہوئیں۔ آخر کار حسین شاہ والیِ جونپور کی جمعیت بالکل تباہ ہو گئی اور جونپور پر سلطان بہلول لودھی کا قبضہ ہو گیا۔ وہاں اس نے پہلے مبارک خان لوہان کو اور بعد میں اپنے بڑے لڑکے کو حاکم مقرر کیا۔ بعد ازاں گوالیار کے راجہ کو اپنا مطیع کیا۔ گوالیار سے واپسی پر جلالی کے نزدیک جولائی ۱۴۸۹ء میں وفات پائی۔

جب بہلول نے اقتدار سنبھالا تو انتظامِ مملکت مفلوج ہو چکا تھا لیکن ان حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت اس میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ چنانچہ اس کی وفات کے وقت حالات نہایت پرسکون اور انتظام اعلیٰ پیمانے کا تھا۔ اس نے تمام علاقوں کو اپنا باجگزار بنایا۔ وہ ایک باعظمت تاجدار تھا۔ اس کے باوجود نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اپنے امراء کے ساتھ اس کا سلوک مثالی تھا۔ وہ ان کے ساتھ ہمیشہ برابر کی سطح پر بات کرتا۔ دوستوں کی محفل میں تخت پر بیٹھ کر اپنا امتیاز نہ جتاتا بلکہ سب کے ساتھ فرش پر بیٹھتا۔ سادہ غذا اور سادہ لباس استعمال کرتا۔

سکندر لودھی، (۱۴۸۹ء تا ۱۵۱۷ء)

بہلول کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نظام خان سلطان سکندر لودھی کے نام سے سلطنت دہلی کا وارث بنا۔ وہ ایک نہایت عالم فاضل بادشاہ تھا۔ اس کے عہد کا اہم علمی کارنامہ فرہنگِ سکندری کی تدوین ہے۔

گوالیار اور بندھیل کھنڈ کے باغی راجاؤں کی سرکوبی اور جونپور کی جنگ میں

اس کا خاص وقت صرف ہوا۔ اس کے عہد میں پنجاب میں کوئی اہم واقعہ رونما نہیں ہوا۔ تقریباً ۲۸ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۵۱۷ء میں آگرہ میں فوت ہوا۔

سکندر لودھی اس خاندان میں سب سے باعظمت حکمران تھا۔ اس کے عہد میں مملکت کی سرحدیں بہت وسیع ہوئیں۔ تمام ماتحت اس سے ڈرتے تھے۔ بدعنوان افسروں کو سخت سزائیں دیتا تھا۔ عوام کی فلاح و بہبود کا بہت خیال رکھتا تھا۔ ناداروں میں اشیائے خورد و نوش خود تقسیم کرتا تھا۔ اور اعیانِ حکومت کو بھی سخاوت کی تلقین کرتا تھا۔ اس نے ہندو رعایا کی بہتری کے لئے بھی کام کیا۔

سکندر لودھی کے عہد کا تعمیراتی کارنامہ شہر آگرہ کی صورت میں آج دنیا کے سامنے موجود ہے۔ اس وقت کے خاص سیاسی حالات کے پیشِ نظر اس نے آگرہ کو اپنی حکومت کا مرکز بنایا۔

ابراہیم لودھی، (۱۵۱۷ء تا ۱۵۲۶ء)

سکندر لودھی کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم لودھی تخت نشین ہوا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے بھائی جلال خان کو قید کیا اور بعد میں موت کے گھاٹ اتار کر اپنی راہ ہموار کی۔ اس کے اس ظالمانہ فعل کی وجہ سے کئی امراء اس کے خلاف ہو گئے۔ اِس طرح سلطنت میں انتشار کی ابتدا ہوئی۔

بہار کا حاکم خود مختار ہو گیا۔ بادشاہ کی فوج نے کئی مقامات پر اس سے شکست کھائی۔ اِس طرح پنجاب کا گورنر دولت خان لودھی مرکز کی اطاعت سے منحرف ہو گیا۔ ابراہیم لودھی کے چچا علاء الدّین نے دولت خان کی مدد سے چالیس ہزار کے لشکر کے ساتھ دہلی پر دھاوا بول دیا مگر آخر کار اسے شکست ہوئی۔ اور شہزادہ علاء الدّین پنجاب کی جانب پسپا ہو گیا۔

ابراہیم لودھی کی طاقت میں بھی خاصی کمی ہو گئی۔ سلطنت کے انتشار اور مرکز کی کمزور حالت کی خبر دولت خان لودھی نے کابل میں مغل حکمران بابر کو پہنچا دی۔ اور اسے

ترغیب دی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان پر قبضہ کرلو۔ اور اس ملک پر تمہارا حق بھی ہے۔ کیونکہ تمہارا پردادا اسے فتح کر چکا ہے۔

بابر جدید فن حرب سے آشنا اور جدید اسلحہ سے لیس ایک لشکرِ جرار کے ساتھ ہندوستان آیا۔ پانی پت کے تاریخی میدان میں ابراہیم لودھی اور بابر کی فوجوں کا آمنا سامنا ہوا اور ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء کو جنگ چھڑ گئی جس میں قسمت نے بابر کے حق میں فیصلہ کیا اور سکندر لودھی اور اس کا لشکر میدانِ جنگ میں کام آیا۔ اور ساتھ ہی ہندوستان کے حکمران خاندانوں میں سب سے باعظمت خاندان کی ابتداء ہوئی جس کے زمانے میں مسلم تہذیب وتمدّن عروج پر پہنچا۔

مُغلیہ خاندان

۱۵۲۶ء تا ۱۵۴۰ء

پس منظر

برصغیر کے سب سے ممتاز مسلم حکمران خاندان، خاندانِ مغلیہ کے بانی ظہیر الدین محمد بابر نے اپنے خاندانی پس منظر کو اپنی مشہور تصنیف ''تزک بابری'' میں اِس طرح بیان کیا ہے:

''میری عمر بارہ برس کی تھی کہ پندرہ رمضان ۸۹۹ھ بمطابق ۱۴۸۳ء کو فرغانہ کا بادشاہ ہوا۔ میں عمر شیخ کا بیٹا ہوں۔ یہ سلطان ابوسعید مرزا کے چوتھے بیٹے تھے۔ سلطان ابوسعید مرزا، میرزا سلطان محمد کے بیٹے تھے۔ سلطان محمد مرزا، سلطان میراں شاہ مرزا کے فرزند تھے۔ اور میراں شاہ، حضرت امیر تیمور کے منجھلے بیٹے تھے۔

میرے والد عمر شیخ مرزا حنفی مذہب اور خوش اعتقاد آدمی تھے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ بیشتر وقت قرآن شریف کی تلاوت کرتے تھے۔ وہ سخی بھی بہت تھے۔ شیریں کلام اور بہادر آدمی تھے۔ ان کے قبضے میں یہ ملک تھے۔

سلطان ابوسعید مرزا نے فرغانہ کا علاقہ دیا تھا۔ تاش قند، سہرام اور ایتبہ ان کے بڑے بھائی سلطان احمد مرزا نے دئے تھے۔

ان کی اولاد میں تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں سب سے بڑا بیٹا میں ظہیر الدین بابر ہوں۔ میری ماں قتلغ نگار

خانم تھیں۔ مجھ سے دو برس چھوٹا، دوسرا بیٹا جہانگیر مرزا تھا۔ اس کی ماں قوم مغل کے گروہوں کے سرداروں میں سے تھی۔ اس کا نام فاطمہ سلطان تھا۔ تیسرا بیٹا ناصر مرزا تھا۔ اس کی ماں اندجان کی تھی۔ اس کا نام رمیہ تھا۔ ناصر مرزا مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ سب بیٹیوں میں سے بڑی خانزادہ بیگم میری سگی بہن تھی۔ مجھ سے چار برس بڑی۔

میری ماں قتلغ نگارہ خانم یونس خان کی دوسری بیٹی تھی۔

یونس خان چغتائی خان کو نسل سے تھا۔ جو چنگیز کان کا دوسرا بیٹا تھا۔

اگرچہ بابر مادری نسبت سے منگول تھا مگر اسے اپنے آپ کو منگول یا مغل کہلوانے سے چڑ تھی۔ وہ ان دو لفظوں کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اور ہمیشہ اپنے آپ کو چغتائی ترک کہتا تھا۔ لیکن یہ تاریخ کی ایک عدیم النظیر ستم ظریفی ہے کہ جس لفظ سے بابر کو نفرت تھی اسی لفظ کو تاریخ نے اس کے نام کا جزو لاینفک بنا دیا۔ اس کی وجہ مورخین یہ بیان کرتے ہیں کہ اہلِ ہند ایک طویل عرصے تک شمال مغربی جانب سے ہونے والے منگول حملوں کی آفت میں مبتلا رہے۔ اس لئے ان کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ شمال مغربی سمت سے حملہ آور ہونے والے صرف منگول (یا مغل) ہی ہوتے ہیں۔ اِس تصور کی بنا پر ہندی عوام نے بابر اور اس کے خاندان کو مغل قرار دیا اور تاریخ نے بھی انہیں اسی لفظ کے ساتھ محفوظ کیا۔

ظہیرالدّین بابر، (۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۰ء)

مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیرالدین بابر وسط ایشیاء کی دو عظیم قوموں کی روایات کا امین تھا۔ باپ کی طرف سے وہ عظیم فاتح امیر تیمور کا ورثہ دار تھا۔ اور ماں کی طرف سے وہ قہر مجسم چنگیز خان کا وارث تھا۔ بابر کی پیشانی کی ''چمک'' سے تیموری عظمت وجلال اور ''دشکن'' سے چنگیزی غضب و جبروت عیاں تھا۔ اس کا دل ان دو عظیم فاتحین کی خونی

خصوصیات کا سنگم تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں اس کی ذات میں ترکوں والا استقلال اور منگولوں والی ہیبت تھی۔ وہاں وہ ایرانیوں کے اثر کی وجہ سے بہترین ادبی ذوق کا بھی مالک تھا۔ اگر پانی پت اور کھنواہہ کے میدانوں میں تیموری اور چنگیزی روایات کا مظہر ہے تو ''تزکِ بابری'' اس کے ایرانی تہذیب و ثقافت کے آئینہ دار ہونے کا ثبوت ہے۔

بابر ۱۴ فروری ۱۴۸۳ کو فرغانہ کے صدر مقام اندیجان میں پیدا ہوا۔ اِس کا اصل نام ظہیر الدین محمد تھا۔ لیکن دوستوں نے اسے ''بابر'' کے نام سے مشہور کر دیا۔ ترکی میں لفظ بابر کے معنی شیر کے ہیں۔ بابر چونکہ فرغانہ کے شاہی گھرانے کا ایک بہت ہی اہم فرد تھا اس لے اُس کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ کم عمری ہی میں وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ فنون سپہ گری سے بھی آراستہ ہو چکا تھا۔ بابر ابھی صرف ساڑھے گیارہ سال کا تھا کہ اس کے والد عمر شیخ کا انتقال ہو گیا۔ اور انتظام سلطنت کی بھاری ذمہ داری اس کے نازک کندھوں پر آ پڑی۔ بابر فطرتاً سخت کوش، انتھک اور مہم جو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مدبر سیاستدان بھی تھا۔ اس لئے اس نے اپنے آپ کو ان ذمہ داریوں کا اہل ثابت کیا۔

بابر کے اقتدار سنبھالتے ہی آس پاس کے تمام حکمران اس کی عمر کی ناپختگی اور حالت کی خستگی سے فائدہ اٹھا کر اس کے ملک پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھنے لگے۔ ان حکمرانوں میں سے خاص کر بابر کے چچا اور ماموں نے تو فرغانہ پر حملہ بھی کیا مگر قسمت بابر کے ساتھ تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ اپنے جدّ امجد امیر تیمور کے مرکز سمرقند پر اپنی دوسری کوشش مین کامیاب ہو گیا۔ مگر اس کا یہ قبضہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ کیونکہ اسے سمرقند آئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ فرغانہ میں اس کے بھائی نے بغاوت کر دی۔ جسے فرد کرنے کے لئے وہ سمرقند سے روانہ ہوا۔ تو سمرقند میں اس کے عم زاد بھائی نے خود مختار حیثیت اختیار کر لی۔ جس کی وجہ سے بابر اب ایک بے ملک کا بادشاہ تھا۔ اِس عالم حسرت و یاس میں بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور بالآخر ایک سال کے بعد دوبارہ فرغانہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر سمرقند پر قابض ہوا لیکن یہاں سے دوبارہ پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اور تین سال تک کس مپرسی کے عالم میں آوارۂ وطن رہا بعد میں اس نے کابل میں اپنے پاؤں

جمالئے۔ اور قندھار کو بھی فتح کر لیا جو بعد میں اِس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ کابل میں اس نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا اور یہیں اس کے دل میں برصغیر پاک و ہند کی فتح کی آرزو پیدا ہوئی۔ اس کے بعد اس نے ایران کے بادشاہ شاہ اسمٰعیل صفوی کی مدد سے سمرقند پر بھی قبضہ کر لیا مگر کئی وجوہات کی بنا پر وہاں ناکامی کے بعد اس نے اپنی مکمل توجہ برصغیر کی طرف مبذول کر دی۔

کابل میں اپنی حیثیت مستحکم کرنے کے بعد بابر نے برصغیر میں اپنی بادشاہت قائم کرنے کی غرض سے کوششیں شروع کیں۔ ۱۵۰۵ء میں اس نے برصغیر کے شمالی علاقوں پر پہلا حملہ کیا۔ وہ پشاور اور کوہاٹ کے راستے ہوتا ہوا دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ ڈیرہ غازیخان تک آ گیا۔ اس کا یہ حملہ محض مطالعاتی تھا۔ ۱۵۱۹ء میں اس نے دوبارہ برصغیر کا قصد کیا اس نے دریائے سندھ عبور کر کے پنجاب کے اہم مقام بھیرہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اس نے تاخت و تاراج کی بجائے وہاں کے باشندوں سے چار لاکھ شاہ رخی سکوں کا مطالبہ کیا۔ یہیں سے بابر نے ابراہیم لودھی کے دربار میں اپنا ایلچی بھیج کر اسے پنجاب کے علاقے سے دستبردار ہونے کو کہا۔ کیونکہ امیر تیمور کا وارث ہونے کی حیثیت سے وہ پنجاب پر اپنا حق فائق سمجھتا تھا۔ لیکن بابر کو اس کا جواب نہ مل سکا۔ کیونکہ لاہور کے حکمران دولت خان لودھی نے اس کے سفیر کو دہلی نہ جانے دیا۔ اور اسے لاہور ہی میں روک دیا۔ بابر نے حسن بیگ اٹکا کو مفتوحہ علاقوں میں اپنا نائب مقرر کیا ہے جسے اس کی کابل واپسی کے بعد پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اور خود گکھڑوں کی سرکوبی کے لئے آگے بڑھ گیا۔ بابر کے ایک جرنیل دوست بیگ نے گکھڑوں کو شکست دے کر ان کے قلعے بیر بالہ پر قبضہ کر لیا۔ بابر نے عقب سے بڑھ کر گکھڑوں کو نقصان پہنچایا۔ ان کی بہت بڑی تعداد ماری گئی اور بقیہ پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ اس مفتوحہ علاقے پر بابر، محمد علی کو اپنا نائب مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ اسی سال بابر دوبارہ برصغیر پر حملہ آور ہوا۔ لیکن ابھی اس نے یوسف زئی قبیلے کی ہی سرزنش کی تھی کہ بدخشاں پر کاشغر کے بادشاہ کے حملے کی خبر آئی تو وہ اپنے ایک عزیز کو چار ہزار سواروں کے ساتھ پشاور میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

۱۵۲۰ء میں بابر نے پھر ہندوستان پر حملہ کیا اور افغانوں کو روندتا اور بھیرہ اور باجوڑ پر قبضہ کرتا سیالکوٹ تک آ پہنچا۔ سیالکوٹ کے لوگوں نے مزاحمت نہ کر کے اپنے آپ کو پامالی سے بچالیا۔ مگر سید پور کے لوگوں نے خود اپنی بدقسمتی کو آواز دی۔ اور بابری افواج کو روکا جس کی انہیں کڑی سزا بھگتنی پڑی۔ اسی اثناء میں بابر کو کابل پر قندھاری حملے کی اطلاع ملی۔ وہ فوراً کابل پہنچا اور نہ صرف اپنا ملک دشمن کے قبضے سے آزاد کرالیا بلکہ آگے بڑھ کے قندھار کو بھی فتح کر لیا۔ جہاں اس نے شہزادہ کامران کو حاکم مقرر کیا۔ قندھار پر قبضے کے بعد بابر کی طاقت بہت مضبوط ہوگئی۔

لاہور میں تاج دہلی کے نمائندے دولت خان لودھی جو مرکز کی اطاعت سے گریزاں تھا نے بابر کو پنجاب پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی۔ جس کے جواب پر بابر نے ۱۵۲۴ء میں برصغیر پر حملہ کیا۔ لیکن قبل اس کے کہ بابر لاہور پہنچتا دہلی کے بادشاہ ابراہیم لودھی کو اس سازش کا علم ہو گیا اور اس نے فوج بھیج کر دولت خان کو لاہور سے بھگا دیا۔ دہلی کی اسی فاتح فوج نے لاہور سے چند میل کے فاصلے پر بابر کو بھی روکا مگر میدان بابر کے ہاتھ رہا۔ بابر فاتحانہ انداز سے شہر لاہور میں داخل ہوا۔ یہاں اس کی فوج نے قتل عام کے علاوہ خوب لوٹ مار بھی کی۔ لاہور میں چار روز قیام کے بعد بابر دیپال پور کی جانب بڑھا۔ جہاں کے باشندے مقابلے کے بعد سرنگوں ہوئے اور تاخت و تاراج کے مرحلے سے گزرے۔ لاہور کا سابق حکمران دولت خان لودھی بھی وہیں بابر سے آکر ملا۔ بابر نے اسے جالندھر کی امارت عطا کی اور اس کے لڑکے اور بھائی کو بھی علاقہ دیا۔ اور خود ہندوستان کی مکمل فتح کے انتظامات کے لئے واپس کابل چلا گیا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد دولت خان لودھی نے اپنے بیٹے اور بھائی کو بے دخل کر کے سیالکوٹ کی مغل چھاؤنی پر بھی قبضہ کیا تاکہ سارا پنجاب اس کے زیر نگیں آسکے۔ ان اطلاعات کے بعد بابر نے اپنے انتظامات کو جلد از جلد آخری شکل دی اور برصغیر کی جانب کوچ کیا۔

لاہور پہنچنے کے بعد بابر نے پنجاب میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لئے کئی انتظامی قدم اٹھائے۔ اس نے لاہور میں میر عبدالعزیز، سیالکوٹ میں خسرو گوکلتاش،

دیپال پور میں بابا خوشکا اور کلانور میں محمد علی تا جک کو حاکم مقرر کیا۔ سلطان دہلی کا بھائی علاء الدین جو اپنے بھائی سے بدظن ہو کر بابر کے پاس آگیا تھا کو ان سب پر فضیلت حاصل تھی۔ ان انتظامات کے بعد بابر مزید تیاری کے لئے پھر کابل چلا گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں دولت خان کے تعاون سے علاء الدین نے چالیس ہزار فوج کے ساتھ دہلی کا محاصرہ کر لیا مگر ناکامی ہوئی۔

اس شکست کی خبر سننے کے بعد بابر نے بذاتِ خود ہندوستان کا قصد کیا۔ راستے میں اس کا بیٹا ہمایوں جو بدخشان کا گورنر تھا اور غزنی کا حاکم خواجہ کلاں بھی اس سے آملے۔ بابر نے ۱۵ ستمبر ۱۸۲۵ء کو دس ہزار شاہ سواروں کے ساتھ دریائے سندھ عبور کیا اور دہلی کا رُخ کیا۔ بابر کی آمد کی اطلاع پا کر دہلی کا بادشاہ ابراہیم لودھی ایک لاکھ فوج اور ایک ہزار جنگی ہاتھیوں کے ہمراہ اس کو روکنے کے لئے آگے بڑھا۔ پانی پت کے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔

پانی پت کی پہلی جنگ تاریخ میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:

۱۔ باوجود کئی کوششوں کے بابر اپنی آبائی ریاستوں، فرغانہ اور سمرقند پر قبضہ برقرار نہ رکھ سکا۔ اس لئے اس نے اپنی تمام تر کوششیں برصغیر کی فتح کے لئے وقف کر دیں۔

۲۔ برصغیر کی دولت بابر جیسے مہم جو لوگوں کے لئے بڑی جاذبیت رکھتی تھی۔

۳۔ امیر تیمور کا وارث ہونے کی حیثیت سے بابر پنجاب پر اپنی ملکیت کا دعویدار تھا۔

۴۔ بابر نے ابتداء میں برصغیر پر جو حملے کئے تھے ان کا حوصلہ افزاء نتیجہ سامنے آیا تھا۔

۵۔ برصغیر کے مرکز دہلی کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ طوائف الملوکی کا دَور دورہ تھا۔ سیاسی عدم استحکام کے سبب ہر قسم کے بحران موجود تھے۔

۶۔ مرکز کے رویے کی وجہ سے تقریباً تمام صوبے خود مختار اور سارے امراء باغی ہو

چکے تھے۔اور تبدیلی کے خواہاں تھے۔

۷۔ بابر کو دولت خان لودھی اور رانا سانگا نے برصغیر پر حملے کے دوران ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا تھا۔جن میں سے دولت خان لودھی نے تو وعدہ نبھایا لیکن رانا سانگا نے عہد شکنی میں ہی اپنا مفاد سمجھا۔

ان سازگار حالات میں بابر نے ہندوستان پر فوج کشی کی اور پانی پت کے میدان میں یہ فیصلہ کن معرکہ ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء میں لڑا گیا۔بابر کی فوج ابراہیم لودھی کی فوج سے تعداد میں بہت کم تھی۔لودھی کی فوج کا سب سے بڑا سہارا ایک ہزار جنگی ہاتھیوں کی قوت تھی۔بابر نے اس کمی کو اپنی فوج کی استعداد اور صلاحیت کے علاوہ اپنی ماہرانہ قیادت سے پورا کیا۔حالات کے مطابق بابر نے دفاعی حکمتِ عملی اختیار کی۔اگرچہ ابراہیم لودھی کی فوج نے ابتداء میں ہاتھیوں کی مدد سے بڑے شدید حملے کئے مگر بابر نے فوج کو اپنے طویل جنگی تجربے کی روشنی میں اس خوبی سے لڑایا کہ صرف آدھے دن میں ابراہیم لودھی کا لشکر شکست کھا کر بھاگ اٹھا۔ابراہیم لودھی اپنے سولہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ جنگ میں کام آیا۔بابر کی اس فتح کی سب سے بڑی وجہ اس کا توپ خانہ تھا۔ہندوستانیوں نے پہلی بار اس مہلک اور موثر ہتھیار کی کامیاب کارکردگی دیکھی تھی۔اس جنگ کے نتیجے کے طور پر لودھی خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور تاجِ دہلی فرقِ مغول پر کج ہوا۔

پانی پت کی جنگ میں فتح حاصل ہونے کے فوراً بعد بابر نے مرزا محمد سلطان کو دہلی پر اور شہزادہ ہمایوں کو آگرہ پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔۲۲ اپریل کو بابر دہلی میں داخل ہوا۔جہاں اس نے سب سے پہلے حضرت نظام الدّین اولیاءؒ کے مزار پر حاضری دی۔اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔دہلی سے بابر آگرہ گیا۔آگرہ میں شہزادہ ہمایوں نے اس کا شایانِ شان استقبال کیا اور آگرہ کا تمام خزانہ جس میں مشہورِ عالم ''کوہ نور'' ہیرا بھی شامل تھا بابر کو پیش کیا۔آگرہ میں بابر نے دربار کیا اور شاہی خاندان کے تمام افراد اور فوج کے افسروں کو قابلِ قدر انعامات دیئے۔مقاماتِ مقدسہ کی طرف نذرانے روانہ کئے گئے۔کابل کے تمام باشندوں کو بھی انعام کے طور پر ایک ایک اشرفی دی گئی۔بابر کی اس

دادودہش سے مقامی باشندوں پر اچھا تاثر قائم ہو گیا۔

میواڑ کے حکمران رانا سنگرام عرف رانا سانگا نے جب بابر کو ہندوستان میں قدم جماتے دیکھا تو اس نے بابر پر حملہ کر دیا۔ ۱۶ مارچ ۱۵۲۷ء کو آگرہ سے سینتیس میل دُور فتح پور سیکری کے نواح میں کنواہہ کے مقام پر بابر اور رانا سانگا کے درمیان جنگ لڑی گئی۔ جس میں بابر کا لشکر تقریباً دس گنا کم تھا۔ بابر نے یہاں پھر دفاعی جنگ لڑی۔ راجپوت جان توڑ کر لڑے مگر مغلوں کے خطرناک ہتھیار یعنی توپ کا ان کے پاس کوئی توڑ نہ تھا۔ بابر کی گولہ باری نے شروع میں ہی راجپوتوں کی صفیں درہم برہم کر دیں۔ اور وہ اپنی بہت سی نفری مروا کر پسپا ہو گئے۔ رانا سانگا شدید زخمی ہوا۔

ان فتوحات کے بعد بابر کی پوزیشن مستحکم ہو گئی اور اس نے مزید فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر راجپوتانہ فتح کیا۔ محمد لودھی نے ایک لاکھ آدمیوں کے ساتھ بنارس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسے شکست دی۔ بنگال اور اودھ اپنی سلطنت میں شامل کیے۔ اور بہت ہی کم عرصے میں سلطنت دہلی کی پہلی سرحدیں بحال کر دیں۔

ساری زندگی سخت کوشی میں گزارنے کے بعد جب بابر کے آرام کے دن آئے تو یہ دن بہت ہی مختصر ثابت ہوئے۔ تخت دہلی پر جلوہ افروز ہونے کے بعد بابر صرف چار سال زندہ رہ کر ۲۶ دسمبر ۱۵۲۰ کو آگرہ میں فوت ہوا۔ پہلے اسے امانت کے طور پر آگرہ میں دفن کیا گیا اور بعد میں اس کی وصیت کے مطابق اس کا تابوت کابل میں بابر کے پسندیدہ باغ میں سپردِ خاک ہوا۔

بابر میں وہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں جو کسی بھی اعلیٰ درجے کے قائد میں ہونی چاہئیں۔ وہ ایک پرعزم انسان، پکا مسلمان، مہربان باپ، شفیق آقا، دلنواز دوست، بے نظیر ادیب، شعلہ نوا خطیب، بہادر سپاہی، قابل سپہ سالار اور بابصیرت سیاستدان تھا۔ اس کی ساری زندگی شدائد میں گزری۔ مگر اس کی فطری زندہ دلی اور بزلہ سنجی ہمیشہ قائم رہی۔ اس نے تمام تکالیف کو خندہ پیشانی اور صبر و استقلال سے برداشت کیا۔ اور آج تاریخ میں وہ ایک عظیم فاتح اور کامیاب حکمران کی حیثیت سے باعظمت

مقام کا حامل ہے۔

بابر کو باغات تعمیر کرانے کا خاص شغف تھا۔ کابل میں اس کا تعمیر کردہ باغ اپنی مثال آپ ہے۔ اس باغ کا حوض ایک ہی پتھر سے بنا ہوا ہے۔ اور فن کا نادر شاہکار ہے۔ اس حوض پر بابر کا یہ شعر کندہ ہے:

نوروز و نوبہار و مے دلبری خوش است

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسی حوض کے کنارے بابر اپنے خاص دوستوں کے لئے شعر و شراب و شاہد و شہناز و رقص و رنگ کی محفلوں کا اہتمام کرتا تھا۔ صلح آشتی کا دور ہو یا جنگ و جدال کا اس کے ان معمولات میں فرق نہ آتا۔ شراب کا رسیا تھا مگر جنگِ کنواہہ کے موقع پر تائب ہوا اور پھر اسے منہ نہ لگایا۔

نصیرالدّین ہمایوں، (۱۵۳۰ء تا ۱۵۴۰ء) و (۱۵۵۵ء تا ۱۵۵۶ء)

نصیرالدین ہمایوں کی ولادت ۶ مارچ ۱۵۰۸ء کو کابل میں ہوئی۔ اس کی والدہ کا نام ماہم خانم تھا۔ شاہی اہتمام کے ساتھ تعلیم و تربیت کی منازل طے کیں۔ کم عمری میں ہی علوم متداولہ میں مہارت حاصل کر لی۔ علم فلکیات اس کا محبوب موضوع تھا۔ فن سپہ گری بھی سیکھا۔ شروع سے ہی بابر کے ساتھ رہنے کی وجہ سے فوجی مسائل اور رموز جہانبانی میں وسیع تجربے کا مالک بن گیا۔ صرف گیارہ سال کی عمر میں اس نے اپنے آپ کو بدخشاں کی گورنری کا اہل ثابت کیا۔ ہندوستان میں بھی اس نے کئی مہمات سر کیں۔

ہمایوں ۳۰ دسمبر ۱۵۳۰ء کو تخت نشین ہوا۔ اس کو آغاز میں ہی کئی طرح کی مشکلات سے پالا پڑا۔ اگرچہ بابر نے ایک بڑا علاقہ فتح کر لیا تھا مگر اسے ان علاقوں کے انتظامی معاملات بہتر بنانے کا موقع نہ ملا۔ مرکز بھی ابھی تک منظم نہ ہوا تھا۔ بابر نے اگرچہ اپنے تمام دشمنوں کو فیصلہ کن شکستیں دیں تھیں مگر مخالف قوتیں ابھی بھی موجود تھیں اور نت نئے فتنے جگا رہی تھیں۔ بابر کی بے جا سخاوت کی وجہ سے خزانہ خالی تھی۔ افغان،

جن سے ابھی حال ہی میں مغلوں نے اقتدار چھینا تھا، دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ سب سے بڑھ کر ہمایوں کے بھائی اس کے لئے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ مگر اس نے باپ کی وصیّت کے مطابق ہمیشہ ان سے نیک سلوک ہی کیا۔ اس نے بھائیوں کو ان کی مرضی کے علاقے عطا کئے۔ کامران کو کابل اور قندھار۔ ہندال کو الور اور عسکری کو سنبھل کا حاکم بنایا۔ مگر وہ ہمیشہ اس کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں ہی میں مصروف رہے۔ اس کے علاوہ ہمایوں نے اپنے نرم رویّے کی وجہ سے باغی عناصر کو ڈھیل دے کر انہیں کھل کھیلنے کا موقع خود فراہم کیا۔

مرزا کامران نے ہمایوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر پنجاب پر قبضہ کرلیا۔ لیکن ہمایوں نے بجائے اسے سرزنش کرنے کے اس کے اس ناجائز قبضے کو شاہی فرمان توثیق بھیج کر سند جواز عطا کر دی۔ اس سے کامران کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ اس کے بعد ہمایوں نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ بندھیل کھنڈ کے ہندو راجاؤں پر فوج کشی کی اور انہیں باجگوار بنایا۔ مالوہ اور گجرات پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد اس نے چتوڑ، مانڈو اور چمپانیر کے معرکے سر کئے۔ شیر خان پٹھان سے کئی لڑائیاں ہوئیں۔ جس نے بنگال اور بہار میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر رکھا تھا۔ ابھی ہمایوں شیر خان کے خلاف کاروائیوں میں مصروف تھا کہ اس کے بھائی شہزادہ کامران نے دہلی پر قبضے کی غرض سے چڑھائی کر دی مگر دہلی کے منصب دار فخر الدّین علی نے دہلی کا کامیاب دفاع کیا۔ اور کامران کو واپس لاہور جانا پڑا۔

ہندوستان میں نوزائیدہ مغل سلطنت کا سب سے بڑا حریف شیر خان سوری ثابت ہوا۔ جو ایک قابل منتظم، مصلحت کیش سیاستدان اور آزمودہ کار جرنیل تھا۔ شیر خان کی معاندانہ سرگرمیون کی تحقیق کے لئے ہمایوں نے ۱۵۳۷ء میں اپنے ایک افسر کو بھیجا مگر وہ بھی اس سے مل گیا اور اس طرح بادشاہ کو دھوکا دیا گیا۔ شیر خان نے اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کے لئے بنگال پر قبضہ کرلیا۔ اب ہمایوں نے اس کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور لشکر کشی کر کے چنار پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد اس نے بنگال میں شیر خان کا تعاقب

کیا اور سارا بنگال رہتاس سمیت ہمایوں کے تصرف میں آ گیا۔ ان پے در پے فتوحات کے بعد ہمایوں کسل پسند ہو گیا۔ اور کافی عرصہ تک ''گور'' کے موسم کی دلفریبیوں سے حظ اٹھاتا رہا۔ اور عیش و طرب کی محفلوں میں محو رہا۔ لیکن شیر خان اس تمام عرصے میں جنگی تیاریوں میں مصروف رہا اور بالآخر ۲۶ جون ۱۵۳۹ء کو ہمایوں نے چوسہ کی لڑائی میں شکست کھا کر راہِ فرار اختیار کی۔ دریائے گنگا عبور کرتے وقت 'نظام سقہ' نے ہمایوں کو ڈوبنے سے بچایا۔ جس کو بعد میں اس کارنمایاں کے صلے میں ہمایوں نے ''ایک دن کی بادشاہی'' عطا کی۔ شیر خان نے تعاقب جاری رکھا اور اپریل ۱۵۴۰ء میں قنوج کی جنگ میں ہمایوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور سلطنتِ دہلی پر شیر خان نے قبضہ کر لیا۔ ہمایوں لاہور کی طرف پسپا ہو گیا اور بعد ازاں ٹھٹھہ اور بھکر وغیرہ کی طرف سے ہوتا اور سندھ کے صحرائی موسم کی سختیاں برداشت کرتا ایران چلا گیا۔ اسی پسپائی کے دوران 'امرکوٹ' کے مقام پر ۱۱۵ کتوبر ۱۵۴۲ء کو شہنشاہ جلال الدّین اکبر کی ولادت ہوئی۔ مگر اپنی کسمپرسی کے باعث ہمایوں کسی خاص تقریب کا اہتمام نہ کر سکا۔

ایران کے بادشاہ، شاہ طہماسپ صفوی نے ہمایوں کو کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کے لئے لشکر مہیا کیا۔ ادھر ہندوستان میں بھی شیر خان سوری کے جانشین نہایت نااہل ثابت ہوئے۔ ہمایوں نے قندھار اور کابل فتح کرنے کے بعد برصغیر کا رخ کیا۔ اس نے پشاور، لاہور، کلانور، دیپال پور، ہریانہ، اور جالندھر فتح کرنے کے بعد ۱۵ مئی ۱۵۵۵ء کو ماچھیواڑہ کے مقام پر افغان لشکر کو شکست دے کر دہلی کی جانب پیش قدمی کی۔ سکندر خان سوری نے اسّی ہزار فوج کے ساتھ راستہ روکا۔ جس کے نتیجے میں ۲۲ جون ۱۵۵۵ء کو سرہند کے مقام پر فیصلہ کن معرکے میں میدان ہمایوں کے ہاتھ رہا۔ اور وہ پندرہ سال جلاوطنی اور مصائب و آلام کی زندگی گزارنے کے بعد ۲۳ جولائی ۱۵۵۵ء کو دوبارہ تختِ دہلی پر جلوہ افروز ہوا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے وہ تمام علاقے فتح کر لئے جو پہلے کبھی اس کے زیرِ نگیں تھے۔ مگر بادشاہت کا یہ دور بہت مختصر ثابت ہوا اور ۲۴ جنوری ۱۵۵۶ء کو ہمایوں اپنے کتب خانے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے گرا اور فوت ہو گیا۔

ہمایوں رحمدل، فیاض، عالی ظرف اور بہادر انسان تھا۔ البتہ اس میں قوتِ فیصلہ کی کمی تھی جس کے سبب اسے زندگی کی تلخیوں اور زمانے کے حوادث کا سامنا کرنا پڑا۔ دہلی میں دفن ہوا۔ اس کی قبر پر ایک عالی شان مقبرہ بنایا گیا جس کے گنبد کی خاصیت یہ ہے کہ وہ زلزلے سے متاثر نہیں ہوتا۔

سُوری خاندان

(۱۵۴۰ء تا ۱۵۵۵ء)

شیر شاہ سوری، (۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء)

شیر شاہ کا اصلی نام فرید خان تھا۔ وہ افغانوں کے ایک قبیلہ سور سے تعلق رکھتا تھا۔ جو پشاور کے قریب دریائے گومل کے کنارے آباد ہے۔ فرید خان کا دادا گھوڑوں کی تجارت میں خسارہ اٹھا کر ملازمت کی غرض سے ابراہیم لودھی کے عہد میں ہندوستان آیا۔ یہاں آ کر ابراہیم سوری اور اس کے بیٹے حسن سوری نے ہوشیار پور (پنجاب) کے ایک امیر مہابت خان کی ملازمت کر لی۔ اسی ملازمت کے دوران میں حسن سوری کی افغان زوجہ کے ہاں فرید خان تولد ہوا۔ سال ولادت مختلف فیہ ہے۔ فرید خان کی سوتیلی ماں اس کے ساتھ بہت زیادتی کرتی۔ جس سے اس کا باپ بھی بوجوہ صرف نظر کر لیتا۔ فرید خان والدین کے اس سلوک سے تنگ آ کر گھر سے نکل بھاگا اور جونپور چلا گیا۔ اس زمانے میں جونپور کا شمار ہندوستان کے چند اہم علمی مرکزوں میں ہوتا تھا۔ یہاں فرید خان نے بہت محنت سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ اس کی ذہانت اور ذکاوت سے اس کا نام بہت جلد جونپور میں مشہور ہو گیا۔

جونپور کا حکمران جمال خان بھی فرید خان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اور اس نے حسن سوری کو بلا کر کہا کہ اسے اپنے اس نابغۂ روزگار فرزند کی قدر کرنی چاہیے۔ چنانچہ حسن سوری نے اپنی جاگیر کے تمام انتظامی امور فرید خان کے سپرد کر دیئے۔ اس مرحلے پر فرید خان نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس کی زرعی اصلاحات کی وجہ سے پیداوار میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ جس سے ریاست کی آمدنی اور کسانوں کے معیار زندگی پر واضح اور حوصلہ افزاء تبدیلی رونما ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے حسنِ انتظام کا بھی

ہر طرف چرچا ہونے لگا۔ اِسی وجہ سے فرید خان پھر ایک بار سوتیلی ماں کے حسد کا شکار ہوا اور گھر چھوڑ کر آگرہ چلا گیا۔ جہا اس نے دولت خان کی سرکار میں ملازمت حاصل کر لی۔ اور باپ کی وفات کے بعد ابراہیم لودھی سے باپ کی جاگیر اپنے نام منتقل کرالی۔ اور مستقلاً سہرام میں آگیا۔ مگر یہاں بھی اس کے سوتیلے بھائیوں نے اسے چین نہ لینے دیا۔ جن کے مقابلے میں اپنی حیثیت مستحکم بنانے کے لئے فرید خان نے بہار کے حاکم بہار خان لوہانی جس نے اب سلطان محمد شاہ کے نام سے خودمختار حیثیت اختیار کر لی تھی، کی نوکری کر لی۔ یہاں بھی اس نے اپنی ذہنی اور جسمانی استعداد سے مالک کو بہت متاثر کیا۔ ایک دن شیر کے شکار کے دوران اس نے شیر کو تلوار کے ایک ہی وار سے مار ڈالا تو مالک نے خوش ہو کر اسے فرید خان سے شیر خان بنا دیا۔ مگر بعد میں سلطان محمد شاہ اس سے بدظن ہو گیا اور اس کی جاگیر بھی اس سے چھین کر اس کے بھائیوں کو دے دی۔

اس صورتِ حال میں شیر خان نے مانک پور کے مغل گورنر جنید برلاس کے توسط سے بابر کے دربار میں رسائی حاصل کر لی۔ یہاں اس نے چندیری کی مہم میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ جس کے صلے میں بابر نے اس کی ریاست اسے واپس دلوادی۔ مگر بابر کے دربار میں بھی اس کا دل نہ لگا۔ اور ۱۵۲۸ء میں واپس سہرام اپنی جاگیر میں چلا گیا۔ اور دوبارہ محمد شاہ کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ جس نے اسے اپنے ولی عہد شہزادہ جلال خان کا اتالیق مقرر کر دیا۔ ۱۵۲۸ء میں محمد شاہ کی وفات کے بعد جلال خان سریر آرائے تخت ہوا۔ مگر نوعمری کی وجہ سے کاروبارِ حکومت اس کی ماں دادو بی بی اور شیر خان کے ہاتھوں ہی میں رہا۔ اور بعد ازاں جلال خان کی والدہ کی وفات کے بعد انتظامِ حکومت کلیتہً شیر خان کی ذات میں ہی مرتکز ہو گیا۔ ۱۵۳۰ء میں شیر خان نے قلعہ چنار کے مرحوم حکمران تاج خان کی بیوہ لاڈ ملکہ سے شادی کر لی۔ جس کی وجہ سے وہ اس مضبوط قلعے کے علاوہ اس میں موجود بے انداز دولت کا بھی مالک بن گیا۔ اب وہ تمام افغان سرداروں میں سب سے نمایاں شخصیت کا مالک تھا۔

دوراہہ کی جنگ میں ہمایوں نے افغانوں کو شکست دے کر چنار کی طرف پیش

قدمی کی۔ شیر خان نے قلعے سے دستبرداری سے انکار کر دیا۔ جس پر ہمایوں نے قلعے کا محاصرہ کر لیا لیکن شیر خان نے تدبر و فراست سے کام لے کر تصادم کو ٹال دیا۔ اور ہمایوں واپس چلا گیا۔ بعد ازاں ہمایوں، محمد شاہ کے خلاف کاروائیوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے پانچ سال تک شیر خان کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ اور اس عرصے میں شیر خان کو اطمینان کے ساتھ اپنی طاقت بڑھانے کا موقع ملا اور وہ ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن گیا۔

اسی دوران ۱۵۳۳ء میں شیر خان نے اپنے پرانے حریف اور بنگال کے خود مختار حاکم محمود شاہ پر حملہ کیا۔ اور ۱۵۳۴ء میں سوراج گڑھ کی لڑائی میں اس نے محمود شاہ کو فیصلہ کن شکست دی جس سے پورا بنگال اس کے زیرِ نگیں آ گیا۔ ۱۵۳۵ء میں اس نے پھر بنگال پر فوج کشی کی اور بنگال کے صدر مقام گور تک جا پہنچا۔ محمود شاہ نے تاوان ادا کر کے مصالحت کر لی۔ لیکن شیر خان ۱۵۳۷ء میں پھر تاوان کی عدم ادائیگی کے بہانے بنگال پر چڑھ دوڑا۔ محمود شاہ نے ہمایوں کو مدد کے لئے بلایا اور شیر خاں نے اپنے بیٹے جلال خان اور اپنے معتمد امیر خواص خان کو بھیج کر گور کا محاصرہ مزید سخت کر دیا۔ اور گور کے آس پاس کا علاقہ فتح کرنے کے بعد برصغیر کے ناقابلِ تسخیر اور دشوار گزار قلعے رہتاس کو مسخر کر کے شیر خان نے اپنی فوجی حیثیت بہت مضبوط کر لی۔ اور تمام مالِ غنیمت یہاں محفوظ کر لیا۔ اسی اثناء میں ہمایوں چنار کا محاصرہ کر چکا تھا۔ اور یہاں ہمایوں نے چھ ماہ کا طویل عرصہ صرف کرنے کے بعد فتح حاصل کی۔ بعد ازاں شیر خان نے ہمایوں کی شرائط پر صلح کر لی۔ اِس معاہدے کی رو سے بنگال پر شیر خان کی عملداری ہو گئی۔ اور اس نے سالانہ خراج ادا کرنا بھی منظور کر لیا۔ مگر ہمایوں اس معاہدے کو نہ نبھا سکا۔ اس نے بنگال کو مکمل طور پر فتح کرنے کی غرض سے پیش قدمی کی اور صدر مقام گور پر قابض ہو گیا اور بجائے اپنی فتح کو مستحکم کرنے کے عیش پرستی میں مصروف ہو گیا۔ ہمایوں کا یہ عالم دیکھ کر شیر خان نے بہار اور آگرہ کے درمیانی علاقے کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ اور ہمایوں کے ذرائع مواصلات پر قابض ہو کر خود جنگی برتری حاصل کر لی۔ اِس صورت حال کا علم ہونے پر ہمایوں تیزی سے شیر خان کی سرکوبی کے لئے واپس آگرہ کی طرف آیا۔ ۲۶ جون ۱۵۳۹ء

کو چوسہ کے مقام پر شیر خان نے اسے شکست دی اور ہمایوں بمشکل تمام جان بچا کر آگرہ پہنچا۔

اس فتح سے شیر خان کے حوصلے بہت بلند ہو گئے اور اس نے بنگال پر پھر سے قبضہ کر کے دسمبر ۱۵۳۹ء کو شیر شاہ کے لقب سے "سوری خاندان" کی داغ بیل ڈالی۔ اور اپنے نام کے سکے جاری کیے اور خطبے میں بھی اس کا نام پڑھا جانے لگا۔ بعد ازاں وہ ہمایوں کے تعاقب میں آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ ۱۷ مئی ۱۵۴۰ء کو قنوج کے مقام پر شیر شاہ اور ہمایوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ میں فتح شیر شاہ کے حصے آئی اور ہمایوں کو پنجاب کی جانب پسپا ہونا پڑا۔ یہاں اس نے بھائیوں کو متحد کر کے شیر شاہ کا مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنایا مگر بھائیوں نے کسی قسم کا تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ شیر شاہ نے پنجاب میں بھی ہمایوں کا پیچھا کیا تو ہمایوں سندھ کے راستے ایران چلا گیا۔ شیر شاہ نے خوشاب کو اپنا مستقر بنا کر ہمایوں کے پیچھے دو مہمیں روانہ کیں اور اپنے معتمد ترین جرنیل خواص خان کو لاہور کا حاکم مقرر کیا۔ جس نے مرزا کامران کو کابل کی طرف بھگا دیا۔ خوشاب میں کئی بلوچ سرداروں نے حاضر ہو کر اس کی سیادت کا اقرار کیا۔

گکھڑوں نے پنجاب کے امن کو تباہ کر رکھا تھا۔ شیر شاہ نے بذاتِ خود ان کے خلاف کاروائی کی مگر ان کا مکمل استیصال نہ ہو سکا۔ اِس فتنے سے نمٹنے کے لئے شیر شاہ نے جہلم کے پاس بہار کے مشہور قلعہ رہتاس کے نمونے پر ایک قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ بعد میں یہ قلعہ راجہ ٹوڈرمل کی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اور یہاں شیر شاہ نے پچاس ہزار فوج کے ساتھ ہیبت خان نیازی کو مقرر کیا۔ اور گکھڑوں کے خلاف شروع کی گئی مہم اس کے سپرد کر کے شیر شاہ فوراً واپس آگرہ چلا گیا۔ اور وہاں سے بنگال کے حاکم خضر خان کی بغاوت فرو کرنے کی غرض سے بنگال گیا اور ۱۵۴۱ء میں سات ماہ کے بعد کامران لوٹا۔

اب شیر شاہ سوری نے اپنے سلطنت کو وسعت دینے کے لئے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۵۴۲ء میں اس نے مالوہ فتح کر کے وہاں اپنے ایک معتمد ساتھی شجاعت خان کو حاکم مقرر کیا۔ ۱۵۴۲ء کو راجہ پورن کو اس کے مظالم کی پاداش میں قتل کر کے قلعہ رائے

سین پر قبضہ کرلیا ۱۵۴۲ء میں لاہور کے حاکم ہیبت خان نیازی نے بادشاہ کے حکم پر پاکپتن کے باغی سردار فتح خان جاٹ کی گوشمالی کی جو ذرائع مواصلات کے لئے خطرہ بنا ہوا تھا۔ اور بعد میں ملتان کے حکمران بخشو لنگا کو تاج دہلی کا اطاعت گزار بنایا۔ اور فتح جنگ خان ملتان کا حاکم مقرر ہوا۔ شیر شاہ نے ان خدمات کے صلے میں ہیبت خان کو بہت سے انعامات سے نوازا۔ اور ان علاقوں میں انتظامی اصلاحات کے لئے احکامات جاری کیے۔

اب شیر خان کی سلطنت کی حدود سندھ تک وسیع ہو گئیں۔ سندھ پر اس نے اسماعیل خان کو حاکم مقرر کیا۔ ۱۵۴۳ء میں شیر شاہ نے مارواڑ پر حملہ کیا۔ کیونکہ وہاں کے حکمران راجہ مالدیو نے اپنی طاقت میں بہت اضافہ کرلیا تھا۔ شیر شاہ کے لئے یہ مہم ایک بہت بڑی آزمائش ثابت ہوئی۔ مگر وہ یہاں بھی سرخرو ہوا۔ اس کے بعد شیر شاہ ناگور، اجمیر اور میواڑ وغیرہ فتح کرنے کے بعد واپس آگرہ آ گیا۔

راجپوتانہ کی فتح کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے شیر شاہ نے کالنجر پر فوج کشی کی کیونکہ شیر شاہ کالنجر کے راجہ کرت سنگھ کی کئی حرکتوں سے ناراض تھا۔ کالنجر کا قلعہ بہت مضبوط تھا۔ جس کے باعث تقریباً سات ماہ تک اس کا محاصرہ جاری رہا۔ آخر تنگ آ کر شیر شاہ نے حکم دیا کہ گولہ باری کر کے قلعے کی دیواروں کو منہدم کر دیا جائے۔ اور خود توپ خانے کے پاس کھڑے ہو کر گولہ باری شروع کرا دی۔ اس دوران میں میگزین نے کسی وجہ سے آگ پکڑ لی جو یکایک ہر طرف پھیل گئی۔ کئی افراد کے ساتھ شیر شاہ بھی بُری طرح جھلس گیا۔ مگر اس عالم میں بھی اپنی فوجوں کو قلعہ فتح کرنے کی ترغیب دیتا رہا۔ بالآخر جونہی اسے قلعہ فتح ہونے کی خوشخبری سنائی گئی اس نے جان ہار دی۔ یہ واقعہ ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء کو پیش آیا۔

شیر شاہ نے اپنی زندگی کا آغاز انتہائی نامساعد حالات میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے کیا اور ترقی کرتے کرتے ایک باعظمت سلطنت کے مطلق العنان فرمانروا کے منصب پر فائز ہوا۔ اس کی ساری زندگی عملی جدوجہد کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ وہ ایک

مصلحت بین، دور اندیش، طالع آزما، بخت آور اور مضبوط قوتِ ارادی کا مالک شخص تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے مقصد کی صداقت پر یقینِ کامل رکھتے ہوئے اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ اور آخر کار اپنی خداداد قابلیت اور صلاحیت سے اپنا مقام حاصل کر لیا۔ اس نے صرف پانچ سال حکومت کی مگر اس نے اس مختصر عرصے میں ٹھوس اہمیت کے حامل اتنے کام کیئے کہ اس کا نام اکبر کے پیش رو کی حیثیت سے تاریخ میں ابدالاباد تک محفوظ رہے گا۔

شیر شاہ ایک قابل جرنیل ہونے کے ساتھ اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا بھی مالک تھا۔ اس نے علاء الدّین خلجی کے انتظامی ڈھانچے کو مناسب ترمیمات کے ساتھ نافذ کیا۔ اس کے انتظام کی بنیاد عدل و انصاف، سماجی بہبود اور مذہبی رواداری پر تھی۔ اس نے اپنے عہد میں کئی انتظامی اصلاحات نافذ کیں اور سلطنت کو ۴۷ صوبوں میں تقسیم کیا۔ تمام زمین کی پیمائش کرائی اور کل پیداوار کا ۱/۴ حصہ لگان مقرر کیا۔ پولیس اور جاسوسی کے نظام کو موثر بنایا۔

شیر شاہ چونکہ بہت بڑا ماہر معاشیات تھا اس لیئے اس نے تجارت کی ترقی کے لئے کئی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اس کے عہد کے سکّے خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے سکوں کی چھوٹی اکائیاں بھی جاری کیں۔ اِس مختصر مدّتِ حکومت میں اس کے تعمیری کارناموں نے اُسے تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا حامل بنا دیا۔ یعنی انتظامی ضروریات کے تحت اس نے چار سڑکیں تعمیر کرائیں۔ پہلی سڑک سنار گاؤں سے لے کر اٹک تک دو ہزار میل طویل ہے۔ دوسری آگرہ سے برہان پور، تیسری آگرہ سے جودھپور اور چوتھی لاہور سے ملتان تک۔ ان سڑکوں کے ذریعے تمام اہم شہروں کو آپس میں ملا دیا گیا۔ اس سے انتظامِ سلطنت بہتر ہو گیا اور فوج کو نقل و حرکت میں آسانی ہو گئی۔ شیر شاہ کی بنائی ہوئی عمارتوں میں جہلم کے قریب رہتاس گڑھ کا قلعہ بہت مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نے سرام میں اپنا مقبرہ خود ہی بنوایا تھا جو فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔

عوام کی جان و مال کی حفاظت کے لئے شیر شاہ نے اتنا بہترین بندوبست کیا کہ اس کے عہد میں چوری ڈاکے کی واردات شاذ و نادر ہی ہوتی تھی۔ اس کی کڑی سزاؤں

کے خوف سے کسی کو ان حرکتوں کی جرأت نہ ہوتی۔ غرض اس کا مختصر عہد ہر لحاظ سے مثالی ہے۔ لیکن یہ اس کی بدقسمتی ہے کہ ایک تو اقتدار اسے حیاتِ مستعار کے بالکل آخری ایام میں ملا۔ دوسرے اس کے جانشینوں میں سے کوئی بھی اِس کے پائے کا نہ تھا۔

اِس کے بارے میں یہ بات بالکل صحیح کہی جاتی ہے کہ اگر اس کا عرصۂ حکومت کچھ ہی طویل ہوتا اور اِس کے جانشینوں میں کوئی ایک فرد ہی واقعی بادشاہت کا اہل ہوتا تو عظیم مغل سلطنت کبھی منصۂ شہود پر نہ آسکتی۔

اسلام شاہ، (۱۵۴۵ء تا ۱۵۵۳ء)

شیر شاہ کی وفات کے تین دن بعد ۲۵ مئی ۱۵۴۵ء کو اس کا چھوٹا بیٹا جلال خان، اسلام شاہ کے لقب سے کالنجر میں تخت نشین ہوا۔ اسلام شاہ ایک بہادر سپاہی، قابل جرنیل اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ تمام مہموں میں اپنے والد کے ہمرکاب رہنے کی وجہ سے فوج میں بہت مقبول تھا۔ اس نے برسرِ اقتدار آتے ہی کالنجر کے مغلوب حکمران راجہ کرت سنگھ اور اس کے ستر سرداروں کو قتل کرادیا۔ اور مزید مقبولیت حاصل کرنے کے لئے اس نے فوج میں ایک مہینے کی تنخواہ بطور انعام تقسیم کی اور کئی افسروں اور سپاہیوں کو ترقیاں بھی دیں۔ شیر شاہ کی نافذ کردہ اصلاحات کو تندھی سے عملی جامہ پہنایا۔ اس کے انتظام کی وجہ سے سلطنت کی صورتِ حال مزید بہتر ہوگئی۔ لیکن اسلام شاہ کے مزاج میں درشتگی اور کرختگی بہت زیادہ تھی۔ اس بنا پر اس کے حسن انتظام کی وجہ سے حکومت کی بنیادیں جتنی مضبوط ہوتی تھیں، اس کے سخت رویے کے باعث ان میں کہیں زیادہ ضعف واقع ہوجاتا تھا۔ دربار کے کئی اہم امراء اس کے اِس ظالمانہ طرزِ عمل کا نشانہ بنے۔ اس کے ان اقدامات کی وجہ سے اکثر مقتدر امراء اس کے خلاف ہوگئے جس کی وجہ سے کئی بغاوتیں ہوئیں۔ لاہور کے گورنر ہیبت خان نیازی نے خواص خان اور کئی دوسرے معتوب امراء کو ساتھ ملا کر خودمختاری اختیار کرلی۔ اور بادشاہ کے طلب کرنے کے باوجود دہلی سے گریز کیا۔ بادشاہ کا بڑا بھائی عادل شاہ بھی اِس کے ساتھ تھا۔ اسلام شاہ اِس بغاوت کو فرد

کرنے کے لئے دہلی سے لاہور کے جانب روانہ ہوا۔ انبالہ کے قریب دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ لیکن باغی امراء میں اس مسئلے پر اختلاف پید ہو گیا کہ "مستقبل کا بادشاہ کون ہو گا" خواص خان کے دل میں ابھی تک شاہی گھرانے کا احترام باقی تھا۔ اس لئے وہ کہتا تھا کہ فتح حاصل ہونے کی صورت میں عادل شاہ کو بادشاہ بنایا جائے۔ لیکن ہیبت خان کا موقف یہ تھا کہ "بادشاہت کسی گھرانے کی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ ہر اہل شخص کو اس منصب پر فائز ہونے کا حق حاصل ہے۔" اس اصول کو منوا کر وہ بذاتِ خود بادشاہت کا متمنی تھا۔ اِس اختلاف کے بعد خواص خان نے ہیبت خان سے علیحدگی اختیار کر لی اور ہیبت خان کی طاقت بہت کم ہو گئی۔

بہر حال اس نے مقابلہ کیا لیکن زبردست شکست کھائی۔ اسلام شاہ نے رہتاس (جہلم) تک نیازیوں کا تعاقب کیا اور بعد میں سرہند کے راستے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے باپ کے قدیم ترین مصاحب اور سوری خاندان کے سب سے بڑے خیر خواہ خواص خان کو بھی دھوکے سے قتل کرا دیا۔

۱۵۴۷ء میں ہیبت خان کی قیادت میں نیازیوں نے پھر اپنی جمعیت مجتمع کر لی۔ اسلام شاہ نے پھر پنجاب آکر ڈنگوٹ (Dungot) کے مقام پر انہیں شکست دی۔ اور ہیبت خان کی ماں اور بیٹوں کو قید کر لیا۔ جن کے ساتھ دو سال تک انتہائی غیر انسانی سلوک روا رکھنے کے بعد انہیں قتل کرا دیا۔ لیکن نیازی اِس کے بعد بھی گکھڑوں کے ساتھ مل کر ہنگامہ کرتے رہے۔ اور بعد ازاں کشمیر چلے گئے۔ جہاں انہوں نے کشمیر کے حکمران اور چک قبائل کے درمیان ہونے والی کش مکش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کش مکش میں چک قبیلے کی فتح ہوئی۔ جنہوں نے فوراً ہی نیازیوں پر حملہ کر دیا۔ نیازی جان توڑ کر لڑے مگر بالآخر تمام کے تمام میدانِ جنگ میں کام آئے۔

۱۵۴۸ء میں مرزا کامران نے ہمایوں کے مقابلے میں پسپائی اختیار کی اور پنجاب کی طرف بھاگ آیا۔ اور یہاں آکر اس نے گکھڑوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا۔ ہمایوں بھی اِس کے تعاقب میں آیا۔ جب ہمایوں کے دریائے سندھ عبور کرنے کی اطلاع اسلام

شاہ کو ملی تو وہ معمولی جمیعت لے کر انتہائی سرعت کے ساتھ لاہور میں وارد ہوا۔ مگر ہمایوں اس سے پہلے ہی واپسی اختیار کر چکا تھا۔ اس لئے اسلام شاہ بھی واپس دہلی چلا گیا، اور وہاں سے گوالیار۔

اسلام شاہ اس کے بعد بھی ایک بار لاہور آیا۔ اس موقع پر اس نے ایک شخص شیخ علائی جس نے مہدویت کا دعویٰ کر رکھا تھا کو سخت اذیتیں دینے کے بعد ہلاک کروادیا۔ یہاں سے واپس گوالیار گیا اور وہیں ۱۵۵۳ء میں فوت ہو گیا۔

محمد عادل شاہ

اسلام شاہ کی سخت گیر پالیسی کی وجہ سے بہت سے امراء اس سے بدظن ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اس سے اس کی طاقت بہت کم ہو گئی۔ اور کئی صوبے باغی ہو گئے۔ اور مملکت میں انتشار پھیل گیا۔ اِس عالم میں امرائے دربار نے اِس کے کمسن بیٹے شہزادہ فیروز کو تخت پر بٹھا دیا۔ مگر صرف تین ہی دن بعد شیر شاہ کے بھتیجے اور شہزادہ فیروز کے ماموں مبارز خان نے اس کمسن بادشاہ کو اس کی ماں کے سامنے قتل کر کے خود تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور محمد عادل شاہ نے سوری لقب اختیار کیا۔

عادِل شاہ ایک بالکل اَن پڑھ اور اخلاقی لحاظ سے انتہائی پست شخص تھا۔ اِس کے عہد میں شرفاء کی عزّت محفوظ نہ تھی۔ بدمعاشوں اور اوباشوں کو کھل کھیلنے کی کھلی اجازت تھی۔ اس نے ایک معمولی قسم کے آدمی ہیمو بقال کو اپنا وزیر اعظم مقرر کر کے دربار کے تمام مقتدر امراء کو اپنے خلاف کر لیا۔ حالات کو قابو میں رکھنے کے لئے اس نے اپنے مخالفوں پر سختی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے بہنوئی ابراہیم خان سوری کو بھی خفیہ طور پر گرفتار کرنا چاہا۔ مگر اس کی بہن نے اسے مطلع کر کے بھگا دیا۔ اس پر بادشاہ نے عیسیٰ خان نیازی کو اسے گرفتار کرنے کے لئے بھیجا۔ لیکن ابراہیم کے ساتھ ایک جھڑپ میں عیسیٰ خان شکست کھا کر پسپا ہو گیا۔ اور ابراہیم چنار کی طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنی طاقت میں بہت اضافہ کیا اور بعد میں اس نے بادشاہ کی مرکز سے عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر دہلی

پر چڑھائی کر دی۔ اس موقعہ پر عادِل شاہ نے اپنی طاقت کو ناکافی سمجھتے ہوئے ایک معاہدے کے تحت ابراہیم کو دہلی اور مغربی علاقوں کا بلاشرکتِ غیرے حکمران تسلیم کرتے ہوئے خود مشرقی علاقوں پر قناعت کر لی۔

ابھی ابراہیم شاہ سوری کو تخت نشین ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ تخت کا ایک اور دعویدار میدان میں آ گیا۔ یہ شیر شاہ کا بھتیجا سکندر خان سوری تھا۔ اس نے پنجاب کو اپنا مرکز بنا کر تخت پر قبضہ کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے اس علاقے کے تمام سرکردہ امراء کو اپنا حامی بنا لیا۔ جن میں مشہور نیازی سردار ہیبت خان بھی تھا۔ کافی طاقت جمع کرنے کے بعد اس نے پنجاب میں سکندر شاہ سوری کے لقب سے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اور بارہ ہزار شہسواروں کا لشکر لے کر دہلی اور آگرہ فتح کرنے کی غرض سے روانہ ہوا۔ اور دہلی سے بیس میل ادھر کڑہ کے مقام پر ڈیرے ڈال دیئے۔ بادشاہِ دہلی ابراہیم شاہ سوری انتہائی کروفر اور شان و شوکت سے ستر ہزار فوج کے ساتھ مزاحمت کے لئے دہلی سے نکلا۔ لیکن میدان جنگ میں اس کی یہ سج دھج کسی کام نہ آئی اور وہ زبردست شکست کھا کر سنبل کی طرف بھاگ گیا۔ اور یوں سکندر شاہ سوری دہلی اور آگرہ کا بھی بادشاہ بن گیا۔ لیکن سکندر شاہ بھی زیادہ عرصہ بادشاہت سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ کیونکہ ہمایوں نے سوری خاندان کے انتشار سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا۔ سکندر شاہ اس کو روکنے کے لئے پنجاب کی طرف بڑھا۔ جہاں سرہند کے مقام پر ہمایوں کی فوج سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اس وقت ہمایوں کی فوج کا سپہ سالار نوعمر شہزادہ اکبر تھا۔ جس کے ساتھ اس کا قابل اتالیق بیرم خان بھی تھا۔ سکندر خان کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اور وہ سوالک کے پہاڑوں میں چھپ گیا۔ جہاں سے بعد ازاں وہ بنگال چلا گیا۔ اور وہیں اس دنیائے بے ثبات سے نجات پائی۔ اس کی وفات کی تاریخ کتب تاریخ میں محفوظ نہیں ہے۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی سوری خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور تختِ دہلی دوبارہ مغل خاندان کے تصرف میں آ گیا۔

جلال الدین اکبر

(۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۰ء)

برصغیر کے مسلمان حکمرانوں میں اکبر کا عہد زریں کہلاتا ہے اور اکبر سب سے باعظمت حکمران تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر اس عظیم المرتبت حکمران کی زندگی کا ابتدائی حصہ انتہائی کس مپرسی کے عالم میں بسر ہوا۔ اس کی پیدائش اس زمانے میں ہوئی جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر سندھ کے ریگستانوں میں بھٹک رہا تھا اور چاہتا تھا کہ یہاں کے کچھ راجاؤں کو ساتھ ملا کر اپنی سلطنت کی بازیابی کی کوشش کرے لیکن اس برے وقت میں کوئی بھی اس کے کام نہ آیا۔

شہنشاہ اکبر کی ولادت اسی عالم حسرت و یاس میں ۱۱۵ کتوبر ۱۵۴۲ء کو امرکوٹ (سندھ) میں ہوئی۔ ہمایوں کچھ عرصہ سندھ میں اپنے پاؤں جمانے کی بے سود کوشش کرنے کے بعد ایران کی طرف پسپا ہو گیا۔ اسی پسپائی کے دوران میں ہمایوں کے بھائی مرزا عسکری نے کوئٹہ کے قریب ہمایوں پر حملہ کر دیا۔ لیکن ہمایوں اپنی فوجی طاقت کے اضمحلال کو محسوس کرتے ہوئے اپنی زوجہ حمیدہ بانو کو ساتھ لے کر اور کمسن شہزادے کو پیچھے چھوڑ کر تیزی سے ایران کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ ادھر عسکری اکبر کو ساتھ لے کر قندھار چلا گیا۔ جہاں اس کی بیوی نے مستقبل کے اس عظیم فرمانروا کی پرورش کی۔ کچھ عرصے کے بعد جب ہمایوں کے دن پھرے اور اس نے ایرانی افواج کی مدد سے فتوحات شروع کیں۔ تو کابل کی فتح کے بعد ہمایوں، اکبر اور حمیدہ بانو کو دوبارہ ملا۔ اس وقت اکبر کی عمر تین سال تھی۔ اکبر کی تربیت کے لئے کئی ماماِئیں مقرر ہوئیں۔ ان میں ماہم انگہ کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

تیموری گھرانے کی روایت کے مطابق جب اکبر چار سال، چار ماہ اور چار دن

کا ہوا تو اس کی رسم بسم اللہ کی ادائیگی کے لئے ایک بہت بڑی تقریب کا بندوبست کیا گیا۔ مگر عین وقت پر اکبر کہیں جا کر چھپ گیا اور باوجود تلاش بسیار کے نہ مل سکا۔ پھر بھی اس کی تعلیم کے لئے بلند پایہ اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ لیکن اکبر کو نہ پڑھنا تھا اور نہ ہی پڑھا۔ وہ ہر وقت کھیل کود میں مصروف رہتا۔ اسی وجہ سے اس نے فنونِ سپہ گری میں مہارت حاصل کر لی۔ اکبر اگرچہ پڑھا لکھا بھی نہ تھا لیکن قدرت نے اسے قابلِ رشک قوتِ یادداشت سے نوازا تھا۔ اپنی فطری صلاحیتوں کی بنا پر وہ ایک کامیاب حکمران بنا۔

ہمایوں نے اپنی زندگی ہی میں کئی اہم ذمہداریاں اکبر کو سپرد کیں۔ سب سے پہلے ۱۵۵۱ء میں اکبر کو غزنی کا گورنر بنایا گیا۔ اس وقت اس کا اتالیق منعم خان تھا۔ اکبر تین سال تک اس منصب پر فائز رہا۔ بعد ازاں ۲۲ جنوری ۱۵۵۵ء کو اکبر نے اپنے نئے اتالیق بیرم خان کے ساتھ سکندر شاہ سوری کو سرہند کے مقام پر شکست دے کر ولی عہد کا اعزاز حاصل کر لیا۔ اور جب ہمایوں نے دہلی اور آگرہ فتح کر لیا تو اکبر کو اپنے معتمد ترین ساتھی بیرم خان ترکمان کے ساتھ پنجاب کا گورنر مقرر کر کے بھیجا۔

اکبر اور بیرم مشرقی پنجاب میں سکندر سوری کے خلاف کاروائی میں مصروف تھے کہ انہیں کلانور کے مقام پر ہمایوں کی وفات کی اطلاع ملی۔ بیرم خان نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے فوراً اکبر کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اور خود وزیر اعظم کی حیثیت سے تمام اختیارات سنبھال لئے۔ اکبر ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء کو تخت نشین ہوا۔

اکبر نے انتہائی نامساعد حالات میں مسندِ اقتدار سنبھالی۔ ہمایوں کو دہلی فتح کرنے کے بعد اس کی انتظامی حالت بہتر بنانے کا موقع نہ ملا تھا۔ اس لئے مرکز کی ابتری کی وجہ سے شدید قسم کے سیاسی اور انتظامی بحران پیدا ہو گئے تھے۔ اس پر آفت سماوی کے طور پر خشک سالی مستزاد۔ اس قحط میں ہزاروں جانیں تلف ہوئیں اور بالآخر طاعون کی زبردست وباء پھوٹ پڑنے سے بستیوں کی بستیاں اجڑ گئیں۔ جب لوگوں کو کھانے کو کچھ نہ ملتا تو وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے اپنے مردہ عزیزوں کی لاشیں تک کھانے پر مجبور ہو جاتے۔ لیکن اس قدر حوصلہ شکن حالات میں بھی بیرم خان کی حوصلہ افزا رہنمائی میں

ناتجربہ کار اکبر نے حوصلہ نہ ہارا اور حالات کی خلاف ڈٹ گیا۔ نتیجۃً حالات کو ہی اس کے حق میں سازگار ہونا پڑا۔

مغلیہ سلطنت کی اس دگرگوں حالت کو دیکھ کر مخالف عناصر نے سر اٹھانا شروع کیا۔ ان میں اپنے بھی تھے اور بیگانے بھی۔ سب سے پہلے ہمایوں کے ایک قریبی ساتھی، شاہ ابوالمعالی جو پنجاب کا گورنر تھا، نے بغاوت کی۔ اکبر کے لشکر نے بغاوت فرو کی اور اُس گرفتار کرلیا مگر یہ فرار ہوگیا۔ اِس کے بعد شیر شاہ کے ایک جرنیل حاجی خان نے نارنول کے قلعے پر قبضہ کرلیا۔ لیکن اکبر نے تردی بیگ خان کو بھیج کر اسے شکست دی۔ سکندر شاہ ہزیمت اٹھا کر پھر پہاڑوں میں روپوش ہوگیا۔ اِس زمانے میں بادشاہ نے اپنی پھوپھی گلبدن بیگم کے شوہر خضر خان کو لاہور کا گورنر مقرر کیا۔

ابتدائی دنوں میں سلطنتِ دہلی کے خلاف سب سے بڑی یورش عادل شاہ عادلی کی طرف سے ہوئی جس نے بنگال اور مشرقی صوبوں میں اپنی بادشاہت قائم کر رکھی تھی۔ اس کے ہندو وزیر ہیمو بقال کو مغلوں سے سخت نفرت تھی۔ اور وہ انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ کر ہندوستان پر ''ہندو حکومت'' قائم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ اس موقعے کو غنیمت سمجھتے ہوئے گوالیار کے راستے آگرہ پر حملہ آور ہوا۔ آگرہ کا مغل گورنر سکندر خان ازبک مقابلے کی تاب نہ لاکر دہلی کی طرف بھاگ آیا۔ ہیمو نے آگے بڑھ کر دہلی پر، وہاں کے حاکم تردی بیگ کو شکست دے کر، قبضہ کرلیا۔ اور یہ شکست خوردہ جرنیل سرہند میں اکبر کے پاس پہنچے۔

دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد ہیمو اپنے اصل روپ میں ظاہر ہوا۔ جس سے ثابت ہوا ہے کہ اسے اپنے آقا عادل شاہ سے کوئی سروکار نہ تھا، بلکہ وہ تو محض اپنی قیادت میں ایک ہندو ریاست قائم کرنے کے منصوبے پر عمل کر رہا تھا۔ دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد، عادل شاہ کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے اس نے راجہ بکرماجیت کے نام سے تمام اختیارات خود سنبھال لئے۔ اس نے مالِ غنیمت کی فیاضانہ تقسیم سے اکثر افغان امراء کو اپنا حامی بنالیا۔ اور ایک بہت بڑی فوج بھرتی کرلی۔ اور اکبر کو برصغیر سے نکال کر باہر کرنے

کے لئے دہلی سے پیش قدمی کی۔

اکبر اس وقت سرہند میں تھا۔ اس نے اس خطرناک صورتِ حال پر غور کرنے کے لئے تمام جرنیلوں کی مجلسِ مشاورت طلب کر کے ان کی رائے دریافت کی۔ چونکہ اس سے قبل آگرہ اور دہلی کے بھگوڑے جرنیل راجہ بکرماجیت کی عظیم فوجی طاقت اور اپنی کمزور حالت کے افسانوں سے ساری فوج میں مایوسی اور بددلی کی فضا پیدا کر چکے تھے۔ لہٰذا اس اجلاس میں سب لوگوں نے یہی کہا کہ اس مرحلے پر ایسے طاقتور دشمن کا مقابلہ کرنا خودکشی کے مترادف ہے اس لئے ہندوستان چھوڑ کر کابل چلا جائے اور وہاں اپنی فوجی طاقت دوبارہ منظم کر کے ہندوستان پر حملہ کیا جائے۔ صرف بیرم خان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور اس نے پرعزم لب و لہجے میں ہندوستان ہی میں رہ کر حالات کا مقابلہ کرنے کا اعلان کیا۔ اور اکبر نے بھی اس کی تائید کی۔ بیرم خان نے فوراً مایوسی پھیلانے والے امراء کو سزائیں دیں اور اس گروہ کے سرغنہ تردی بیگ خان سابق حاکم دہلی کو برسرِ عام پھانسی دے کر فوج میں اپنی دہشت بٹھادی۔ اور اب پوری فوج میں کسی کو اس کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ رہی۔

بیرم خان نے ہیمو بقال کا مقابلہ کرنے کے لئے ابتدائی انتظامات مکمل کرنے کے بعد علی قلی شیبانی کو ایک ہراول دستہ دے کر روانہ کیا۔ ادھر دہلی سے ہیمو کا لشکر بھی روانہ ہو چکا تھا۔ شاہی ہراول نے ہیمو کے ہراول پر کامیاب حملہ کر کے اس کا بہترین توپخانہ چھین لیا۔ جس سے اس کی فوجی طاقت میں ناقابلِ تلافی کمی واقع ہوگئی۔ اس پہلی کامیابی نے اکبر کے لشکر کے حوصلے بہت بلند کر دیئے۔ اسی اثناء میں اکبر بھی سرہند سے چل پڑا۔ بالآخر ۵ نومبر ۱۵۵۶ء کو پانی پت کے تاریخی میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔

ہیمو بقال کا لشکر ایک لاکھ آزمودہ کار راجپوت اور افغان سپاہیوں اور تقریباً دو ہزار سے زائد جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھا۔ جبکہ مغلوں کی کل کائنات پچیس ہزار سوار تھے اور یا پھر بیرم خان کا عزم صمیم۔ ہیمو نے ایک بڑے ہاتھی پر سوار ہو کر قلب لشکر کی قیادت خود

سنبھالی۔ بائیں جانب اپنے بھائی رامیہ اور دائیں جانب شادی خان ککر کو مقرر کیا۔ ادھر بیرم خان نے میمنہ پر سکندر خان ازبک میسرہ پر عبداللہ خان ازبک اور قلب پر علی قلی خان شیبانی کو متعین کیا۔

آغاز جنگ میں کثرتِ تعداد کی وجہ سے ہیمو مغلوں پر چھا گیا۔ مغلوں کے گھوڑے، ہاتھیوں کی وجہ سے بدکنے لگے۔ تو مغلوں نے گھوڑوں سے اتر کر مقابلہ شروع کر دیا۔ بیرم خان نے ہر جگہ پہنچ کر فوج کی ہمت بندھائی تو مغلوں کے حملوں میں مزید شدت آ گئی۔ اور انہیں برتری حاصل ہونے لگی۔

اِس دو بدو معرکے میں ایک تیر ہیمو کی آنکھ میں پیغامِ شکست بن کر لگا جس سے ہیمو ہودے میں سنبھل نہ سکا۔ اور گر گیا۔ اِس کے گرتے ہی اس کی فوج کے قدم اکھڑ گئے اور میدان مغلوں کے ہاتھ رہا۔ انہیں بہت سامانِ غنیمت ملا۔ جس میں پندرہ سو جنگی ہاتھی بھی تھے۔

ہیمو بقال فرار ہوتے ہوئے گرفتار ہوا۔ اور اسے اکبر کے حضور میں پیش کیا گیا۔ جہاں اسے بعض روائتوں کے مطابق خود شہنشاہ نے اِس دنیا سے رخصت کیا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ عظیم مغل سلطنت کی ابتداء بھی پانی پت سے ہوئی اور اِس کی نشاۃ ثانیہ کا دور بھی پانی پت ہی سے شروع ہوا۔ اکبر اِس فیصلہ کن فتح کے دوسرے دن فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوا۔ جہاں کے باشندوں نے اس کا والہانہ خیر مقدم کیا۔ دہلی میں اکبر نے فتح کی خوشی میں عالی شان دربار منعقد کیا اور تمام سرکردہ امراء کو انعامات اور خلعتوں سے نوازا۔

اِسی اثناء میں سکندر سوری نے پنجاب کے حاکم خضر خان کو شکست دے کر اِس علاقہ کو مغلوں سے چھیننے کی کوشش کی۔ یہ اطلاع ملتے ہی اکبر نے آ کر سکندر کو کلانور کے مقام پر شکست دی اور وہ بھاگ کر مانکوٹ کے مضبوط قلعے میں محصور ہو گیا۔ اکبر کے ایک جرنیل معظم خان نے چھ ماہ کے طویل محاصرے کے بعد مانکوٹ فتح کیا۔ سکندر سوری نے سابقہ گناہوں کی معافی مانگی اور اپنے بیٹے عبدالرحمٰن خان کو یرغمال کے طور پر پیش کیا۔ اکبر

نے اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے اس کو بنگال جانے کی اجازت دے دی۔ انہی دنوں کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ جب اکبر کلانور میں قیام پذیر تھا تو شاہی گھرانے کی مستورات کابل سے اس کے پاس پہنچیں۔ جن میں اس کی والدہ بھی تھی۔ بادشاہ کے سوتیلے بھائی محمد حکیم مرزا، اس کی والدہ اور دیگر عزیزوں کو کابل ہی میں رہنے کی اجازت دی گئی۔ جہاں کی گورنری اسے پہلے ہی دی جا چکی تھی۔ اکبر کلانور سے اپنے اتالیق بیرم خان کے ہمراہ ۵ اپریل ۱۵۵۸ء میں لاہور آیا۔ اسی دور کا ایک دوسرا اہم واقعہ اکبر کی پھوپھی زاد بہن سلیمہ سلطانہ بیگم سے بیرم خان کی شادی کا ہے۔ بادشاہ بذاتِ خود شادی کی تمام تقریبات میں شریک رہا۔

اب بیرم خان نے اپنی مخصوص حکمت عملی پر عمل کرنا شروع کیا۔ یعنی فتوحات کا سلسلہ ہر وقت جاری رہے۔ اس میں کئی فائدے مضمر تھے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ مملکت کی حدود وسیع سے وسیع تر ہو جاتی ہیں۔ دوسرے مرکز سیاسی اور مالی لحاظ سے مستحکم ہوتا ہے۔ تیسرے آس پاس کی مخالف ریاستوں پر رعب جم جاتا ہے۔ چوتھے باغی عناصر دبکے رہتے ہیں۔ اور پانچویں فوج ہمہ وقت مستعد رہتی ہے اور اس کی جنگی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن فراغت کی صورت میں فوج آرام طلب اور کاہل الوجود ہو جاتی ہے اکبر بھی اِس پالیسی پر مسلسل چالیس برس تک عمل پیرا رہا جس کے نتیجے میں اس نے پچاس سال تک برصغیر پر کامیاب حکمرانی کی اور رعایا بھی خوشحال ہو گئی۔

شاہ ابوالمعالی جو قبل ازیں شاہی فوج کی حراست سے فرار ہو گیا تھا، نے کمال گکھڑ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔ انہوں نے کشمیر فتح کرنے کی کوشش کی لیکن سخت ہزیمت اٹھائی۔ اس کے بعد شاہ ابوالمعالی نے دیپالپور آ کر بہادر خان سیستانی کو ساتھ ملایا اور بغاوت برپا کر دی۔ لیکن پھر شکست کھا کر گجرات کی طرف بھاگا۔ اِس مرتبہ خان زمان نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا۔

اکبر کے عہدِ سلطنت کے ابتدائی حصے کا سب سے اہم واقعہ بیرم خان کا زاول ہے۔ وہ ۱۵۵۶ء سے ۱۵۶۰ء تک وکیل سلطنت کے عہدے پر فائز رہا۔ بیرم خان رموز

مملکت کا ماہر اور اعلیٰ پائے کا جرنیل تھا۔ اس نے ہمایوں اور اکبر کا اُس وقت میں بھرپور ساتھ دیا جب تمام زمانہ ان کا نام ونشان مٹانے کے درپے تھا۔ اور اس نے اپنی فطری صلاحیتوں سے ان باپ بیٹے کی اس وقت مخلصانہ خدمت کی جب وہ امواج حوادث کی زد پر تھے۔ وہ مغلیہ خاندان کا بہت بڑا خیر خواہ تھا۔ پانی پت کی دوسری جنگ کے موقعہ پر تمام امراء ہندوستان چھوڑ دینے کا مشورہ دے رہے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر اس مرحلے پر مغل ہندوستان سے پسپا ہو جاتے تو ہیمو بقال جو بہترین فوجی اور انتظامی استعداد کا مالک تھا، ہندوستان میں اپنی ایسی مستحکم حکومت قائم کرتا کہ پھر مغل ہندوستان کو کبھی بھی حاصل نہ کر سکتے۔ اِس نازک صورت میں جب تمام امراء ہیمو کی فوجی طاقت سے خوفزدہ ہو چکے تھے تھے، صرف بیرم خان ثابت قدم رہا اور اس کے اِس تاریخی فیصلے نے ''رام جیہ'' کے قیام کے منصوبے کو پانی پت کی خاک میں ملا دیا۔

اکبر چونکہ ابھی بہت کم عمر تھا اس لئے اپنا زیادہ وقت کھیل کود میں ہی گزارتا۔ جب کہ امور سلطنت کی تمام تر انجام دہی بیرم خان کے ذمے تھی۔ اور وہ اپنی اِس ذمے داری کو نہایت احسن طریقے سے پورا کر رہا تھا۔

اکبر کی عدم دلچسپی کی وجہ سے تمام اختیار اسی کی ذات میں مرتکز ہو چکے تھے۔ بیرم خان سلطنت کے ہر مخالف کو سختی سے کچل دیتا۔ وہ تو یہ سب کچھ ''اکبر کی سلطنت'' کے استحکام کے لئے کر رہا تھا، مگر دربار میں اس کا ایک مخالف گروہ پیدا ہو گیا جب کہ حرم کی تمام سربرآوردہ خواتین بھی اِس کے خلاف تھیں۔ اِن میں اکبر کی والدہ بھی شامل تھی۔ اور اس کی دائی کا ہم انگہ سب سے پیش پیش تھی۔ اور وہ ہر وقت اکبر کو بیرم خان کے خلاف بھڑکاتی رہتیں۔ وہ اسے کہتیں کہ ''بیرم خان نے آپ کو کٹھ پتلی بنا رکھا ہے اور آپ کے تمام اختیارات وہ خود استعمال کرتا ہے'' اب اکبر نے بھی ان کی باتوں پر توجہ دینی شروع کر دی۔

بالآخر ۱۵۶۰ء میں اکبر نے اپنی والدہ کے بار بار کہنے سے مجبور ہو کر بیرم خان کو معزول کر دیا۔ اور تمام اختیارات خود سنبھال لئے۔ بیرم خان نے حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرنا چاہی جس کی اسے بوجوہ اجازت نہ دی گئی۔ تو اس نے حج کے لئے اجازت چاہی

تو اسے مل گئی۔ ماہم انگہ اور اکبر کے دوسرے حواریوں نے سوچا کہ کہیں پنجاب میں جا کر بیرم خان بغاوت نہ کرے۔ لہذا اِس خطرے کے سدِ باب کے لئے بیرم خان کے ایک پرانے مخالف پیر محمد کو لشکر دے کر اس کے پیچھے روانہ کیا گیا۔ پیر محمد نے بار ہا جارہانہ طرز عمل کا مظاہرہ کیا مگر بیرم خان تصادم سے گریز کرتا رہا۔ لیکن آخرکار بیرم خان کے صبر کا پیانہ چھلک گیا اور وہ آمادۂ بغاوت ہو گیا۔ مگر چونکہ سامنے ''اکبر کی فوج'' تھی اس لئے انتہائی بددلی سے لڑا جس کی وجہ سے اُسے شکست ہوئی اور اُسے گرفتار کر کے اکبر کے حضور میں پیش کیا گیا۔ اکبر نے پیشی پر اس سے بالکل پہلے جیسا سلوک کیا اور اس کی اِس خطا کو معاف کر دیا۔ اسے دربار میں شاہی مشیر کا عہدہ پیش کیا گیا تو اس نے اس عہدے کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کر دی، پھر اسے اکبر نے چندیری کا حاکم بننے کے لئے کہا۔ اس پر بھی اس نے انکار ہی کیا۔ اور جواب دیا کہ وہ آخری عمر سیاسی ہنگامہ آرائی سے دور جوار حرم میں بسر کرنا چاہتا ہے۔ اکبر نے اجازت دے دی اور وافر زادِ راہ بھی عطا کیا۔ مگر بیرم خان کی زندگی کی یہ آخری خواہش پوری نہ ہو سکی اور راستے میں گجرات کے قریب پٹن کے مقام پر اسے اس کے ایک قدیم مخالف مبارک خان لوہانی نے موقع پا کر قتل کر دیا۔ کیونکہ اس کے باپ کو بیرم خان نے ایک جنگ میں ہلاک کیا تھا۔ اکبر کو اس واقعہ کا سن کر بہت رنج ہوا۔ اس نے بیرم خان کی بیوہ سے خود شادی کر لی اور اس کے چار سالہ بیٹے عبدالرحیم کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ اسے اعلیٰ تعلیم و تربیت دلائی۔ یہ بچہ بہت ذہین تھا۔ اس نے بڑے ہو کر خان خاناں کے نام سے شہرت پائی۔ اکبر اس پر بہت اعتماد کرتا تھا۔

بیرم خان کے بعد تمام اختیارات اکبر کی دائی ماہم انگہ نے سنبھال لئے جبکہ بظاہر منعم خان وزیراعظم تھا۔ ماہم انگہ نے اپنے بیٹے اور دیگر عزیزوں کی مدد سے نظامِ حکومت چلانے کی بہت کوشش کی مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ اس کا یہ اقتدار دو برس رہا۔ ان کے بعد اکبر نے ماہم انگہ کے بیٹے ادہم خان کو ایک سنگین گستاخی پر موت کے گھاٹ اتار دیا تو ان کی ماں بھی ان کے غم میں کچھ عرصے بعد فوت ہو گئی۔ اکبر نے اب تمام اختیارات

خود سنبھال لئے اور اپنی ماں کو بھی حکومت کے کاموں میں مداخلت کرنے سے منع کر دیا۔ یوں ۱۵۶۱ء میں اکبر نے واقعی ایک خود مختار اور مطلق العنان حکمران کی حیثیت اختیار کر لی۔

۱۵۶۰ء میں پنجاب کے گورنر محمد کان اٹکہ نے دربار میں حاضری دی اور اکبر کی خدمت میں تحائف پیش کیے۔ ۱۵۶۱ء میں راجہ پورن مل نے اپنی بیٹی کی شادی اکبر سے کر دی اور اکبر نے اسے اور اس کے بیٹے بھگوان داس کو اپنی ملازمت میں بھی لے لیا۔ اکبر نے یہ شادی سراسر سیاسی مصالح کی بنا پر کی۔ دراصل یہیں سے اس کی راجپوت پالیسی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ سربرآوردہ راجپوت گھرانوں میں شادیاں کر کے ان کے ساتھ سیاسی تعلقات استوار کیے جائیں۔ اکبر اپنی اس حکمت عملی میں سو فیصد کامیاب رہا اور اس سے استحکام سلطنت میں بہت مدد ملی۔ ۱۵۶۱ء میں احمد گکھڑ نے پنجاب میں فساد برپا کر دیا، لیکن بعد میں اس نے شکست کھائی۔ ۱۵۶۳ء میں اکبر پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اکبر کو خاصا زخم آیا۔ ملزم گرفتار کر لیا گیا لیکن اکبر نے اس کے ساتھیوں کا پتہ چلائے بغیر فوراً اس کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ ۱۵۶۶ء میں بادشاہ کا سوتیلا بھائی محمد حکیم مرزا جو کابل کا حاکم تھا، بدخشاں کے حکمران سلیمان مرزا سے شکست کھا کر پنجاب میں آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے لاہور پر قبضہ کرنے اور پنجاب میں اپنی حکومت قائم کرنے کا ارادہ کیا لیکن لاہور میں متعین مغل امراء قطب خان اور پیر محمد خان نے شدید مزاحمت کی۔ اکبر کو جونہی حکیم مرزا کی یورش کا حال معلوم ہوا وہ فوراً پنجاب کی جانب روانہ ہوا۔ اکبر کی آمد کی خبر سن کر محمد حکیم مرزا واپس کابل چلا گیا اور پنجاب میں امن بحال ہو گیا۔ ۱۵۶۹ء کا سب سے قابل ذکر واقعہ شہزادہ سلیم کی پیدائش ہے۔ جو ۲ ستمبر کو وقوع پذیر ہوا۔ اکبر کو بہت دعاؤں کے بعد یہ فرزند نصیب ہوا تھا۔ اس نے اس موقع پر بہت خوشی منائی اور اظہار تشکر کے طور پر پاپیادہ حضرت معین الدین اجمیریؒ کے مزار پر حاضری دی۔ ۱۵۷۰ء میں اکبر نے راجہ کلیان مل کی لڑکی سے شادی کی اور ناگور سے پاکپتن آیا۔ جہاں اس نے حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے مزار پر حاضری دی۔ یہاں سے وہ دیپالپور گیا جہاں کے گورنر مرزا عزیز کوکہ نے اس کا شایانِ شان استقبال کیا اور بہت سے قابل قدر تحائف پیش کیے۔

اکبر نے ۱۵۷۵ء میں خان جہان کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ جو ۱۵۷۹ء تک اس عہدے پر رہا۔ اور پھر راجہ مان سنگھ کو یہ منصب عطا کیا گیا۔ ۱۵۷۹ء میں مرزا محمد حکیم نے شاہی افواج کی بنگال میں مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر پنجاب پر قبضہ کرنے کے لئے کابل سے پیش قدمی کی لیکن جونہی اس کے ہراول کے سردار شادمان کوکہ نے دریائے سندھ کو عبور کیا، راجہ مان سنگھ نے اس کو زبردست شکست دی اور پھر لاہور واپس آ گیا۔ محمد حکیم مرزا نے بھی تیزی سے بڑھ کر لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ مان سنگھ نے سید خان اور راجہ بھگوان داس کی معیت میں پوری قوت سے لاہور کا دفاع کیا اور بادشاہ کو بھی کمک کی درخواست بھیج دی۔ بادشاہ فوراً کمک کے ساتھ بذاتِ خود بسرعت تمام آگرہ سے روانہ ہوا۔ اکبر کی آمد کی خبر سن کر محمد حکیم مرزا اس بار بھی کابل کی طرف پسپا ہو گیا۔ لیکن بادشاہ نے اس کے تعاقب کا فیصلہ کیا۔ شاہی لشکر دریائے سندھ عبور کرنے کے لئے آگے بڑھا۔

اکبر نے شہزادہ سلیم کو فوج کے بڑے حصے کی قیادت سپرد کی اور شہزادہ مراد کو ہراول دستے کا سردار بنا کر کابل کی جانب روانہ کیا۔ جس کا ۶ مارچ ۱۵۷۹ء کو محمد حکیم مرزا کے ساتھ تصادم ہوا۔ راجہ مان سنگھ اور ترک خان اتکہ نے کامیاب گولہ باری کر کے محمد حکیم مرزا کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اکبر کو اس فتح کی خبر سرخانبد کے مقام پر ملی اور وہاں سے روانہ ہو کر بغیر کسی مزاحمت کے ۱۱ مارچ کو کابل میں داخل ہوا۔ محمد حکیم مرزا غربند کی طرف بھاگ گیا۔ جہاں سے اس نے معافی کی درخواست بھیجی۔ اکبر نے نہ صرف اسے معاف کر دیا بلکہ اسے دوبارہ کابل کا حاکم بھی بنا دیا۔ اور خود واپسی کا سفر اختیار کیا۔ واپسی پر اس نے اٹک میں ایک قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ وہ ۱۱۱ اکتوبر ۱۵۷۹ء کو لاہور پہنچا اور راجہ بھگوان داس کو یہاں کا حاکم مقرر کر کے آگرے چلا گیا۔

۱۵۸۳ء میں شہزادہ سلیم کی شادی راجہ بھگوان داس کی بیٹی سے ہوئی۔ ۱۵۸۴ء میں کابل کے گورنر محمد حکیم مرزا کے فوت ہو جانے کی وجہ سے بادشاہ نے راجہ مان سنگھ کو وہاں کا حاکم مقرر کیا۔ ایک غیر مسلم کو مسلم اکثریت کے صوبے میں حاکم بنانا اکبر کا ایک جرأت مندانہ اقدام تھا۔ جس کا مثبت نتیجہ سامنے آیا۔ اکبر اس سال پھر لاہور میں وارد ہوا

اور محمد حکیم مرزا کے پسماندگان کو لانے کے لئے ایک بدرقہ روانہ کیا۔ اپنے لاہور کے قیام کے دوران اس نے سوات اور کشمیر کو فتح کرنے کی غرض سے ایک مہم روانہ کی۔ راجہ مان سنگھ کی قیادت میں ایک لشکر روشنائی افغانوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ یہ افغان ایک شخص ''پیر روشنائی'' کو اپنا پیشوا مانتے تھے۔ جس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے جلالہ نے اس کی گدی سنبھال لی اور کچھ عرصہ تو شاہی دربار میں رہا۔ لیکن پھر اپنے علاقے میں بھاگ گیا۔ جہاں اس نے طاقت جمع کر کے بغاوت برپا کر دی۔ اس کی ان سرگرمیوں کی وجہ سے ہند اور کابل کے درمیان سلسلہ مواصلات میں تعطل واقع ہو گیا۔

سوات اور باجوڑ کی طرف ایک فوج زین خان کوکہ کی سرکردگی میں روانہ کی گئی۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی امراء کو فوجی دستے دے کر اس کی معاونت کے لئے ساتھ بھیجا۔ ان میں سید خان گکھڑ، شیخ فیضی، ملا شیری وغیرہ شامل تھے۔ حکیم ابوالفتح (ملا دو پیازہ) اور راجہ بیربل کو اسی سمت میں جانے کی ہدایت کی لیکن اِس مہم میں ایک تو شاہی فوج وحدتِ فکر سے محروم تھی اور دوسرے افغان بھی جان توڑ کر لڑے۔ اس لئے شاہی فوج کو ناکامی ہوئی۔ آٹھ ہزار سپاہی قتل ہوئے جن میں بہت سے امراء بھی تھے۔ مقتولین کی فہرست میں راجہ بیربل بھی تھا۔ راجہ بیربل، اکبر کا بہت ہی قابل اور معتمد افسر تھا۔ اکبر کو اس کی موت کا بہت رنج ہوا۔ زین خان کوکہ اور حکیم ابوالفتح جان بچا کر بادشاہ کی خدمت میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ راجہ بیربل کی لاش تک نہ لا سکنے پر بادشاہ ان سے بہت ناراض ہوا۔ راجا مان سنگھ کی قیادت میں جو مہم روشنائی افغانوں کے خلاف بھیجی گئی تھی وہ بہت کامیاب رہی۔ راجہ مان سنگھ نے ان قبائلیوں کو درۂ خیبر کے پاس عبرتناک شکست دی۔ اِن واقعات کے بعد اکبر اٹک سے لاہور پہنچا۔ اس نے راجہ مان سنگھ کو کابل کا گورنر بنا کر بھیجا۔ کشمیر کی طرف شاہ رخ مرزا، راجہ بھگوان داس اور شاہ قلی خان محرم کی قیادت میں جو لشکر گیا تھا اسے بھی کسی حد تک کامیابی ہوئی لیکن شدید برفباری کی وجہ سے اس فوج کو بہت پریشانی اٹھانی پڑی۔ لیکن پھر بھی وہاں اکبر کے نام کا سکہ چلنے لگا۔ اور زعفران کی تجارت بھی شاہی نگرانی میں آ گئی۔ اکبر نے محمد قاسم خان کی سرکردگی میں کمک روانہ کی جس

کی وجہ سے سارا علاقہ فتح ہو گیا۔

۱۵۸۶ء میں روشنائی افغانوں کے سردار ملک جلالہ نے پھر پنجاب کی پرامن فضا کو تہہ و بالا کر دیا۔ اس نے راجہ مان سنگھ کو بھی شکست دے کر بنگش کے علاقے کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس پر بادشاہ نے عبدالمطلب خان، محمد قلی بیگ اور حمزہ بیگ ترکمان کو کمک دے کر روانہ کیا۔ انہوں نے ملک جلالہ کو ایک زبردست شکست دی اور وہ شدید نقصان اٹھا کر فرار ہو گیا۔ اسی سال شہزادہ سلیم کے بیٹا پیدا ہوا جس کا نام سلطان خسرو رکھا گیا۔ اکبر نے اس موقعہ پر بہت خوشی منائی۔ ۱۵۸۹ء میں راجہ مان سنگھ کو کابل سے بلا کر وہاں زین خان کوکہ کو حاکم مقرر کیا گیا۔ اور مان سنگھ کو لاہور کا۔ اسی اثناء میں سید یوسف خان مشہدی کو قاسم کی جگہ کشمیر کا گورنر بنایا گیا۔

اب اکبر نے اپنے نئے مفتوحہ علاقے کشمیر کی سیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ ۲۷ فروری ۱۵۸۹ء کو لاہور سے بھمبر کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں سے کشمیر کے صدر مقام سری نگر پہنچا اور تین ہفتے وہاں رہ کر انتظام وغیرہ درست کیا۔ اور بعد ازاں وہاں سے کابل گیا۔ راستے میں حکیم ابوالفتح گیلانی کا انتقال ہو گیا۔ جسے حسن ابدال میں دفن کیا گیا۔ اٹک میں اس نے شہباز خان کمبوہ کی قیادت میں یوسفی افغانوں کی سرکوبی کے لئے ایک مہم بھیجی۔ جو کامیاب رہی۔ کابل میں بادشاہ کا قیام دو ماہ تک رہا۔ یہیں اسے اپنے قابل ترین ساتھیوں راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بھگوان داس کی لاہور میں وفات کا علم ہوا۔ بادشاہ اپنے ان دو لائق وزراء کی موت کا سن کر بہت دل گرفتہ ہوا۔ اور اس اطلاع کے فوراً بعد ۱۹ نومبر ۱۵۸۹ء کو بادشاہ کابل سے لاہور کے لئے روانہ ہوا۔ کابل پر ملک عبداللہ خان ازبک کے حملے کے پیش نظر اکبر نے لاہور میں کئی سال قیام کیا۔

۱۵۹۰ء میں کشمیر کا گورنر یوسف خان مشہدی اپنے چھوٹے بھائی ملک یادگار کو قائم مقام کر کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس کی غیر حاضری میں ملک یادگار کی نیت میں خود مختاری کا فتور آ گیا۔ چنانچہ اس نے خود مختاری کا اعلان کر کے اپنے نام کا خطبہ بھی پڑھوایا۔ اس پر اسے کئی اعلیٰ عہدے داروں نے ملامت کی۔ ان میں سے قاضی علی، حسین بیگ اور

شیخ عمر بدخشانی نے اس کی اس حرکت کو میدانِ جنگ میں چیلنج بھی کیا۔ لیکن ان وفاداروں کو شکست ہوئی۔ قاضی علی لڑائی میں کام آیا۔ اور دوسرے بھاگ گئے۔ ان واقعات کی اطلاع کے بعد اکبر نے شیخ فرید بخشی کو اس بغاوت کے فرو کرنے کے لئے بھیجا۔ جس نے یادگار کو شکست دی اور اسے قتل کر کے اس کا سر دربار میں روانہ کیا۔ اس طرح کشمیر ایک بار پھر اکبر کے حلقۂ اقتدار میں شامل ہو گیا۔ اکبر دوبارہ کشمیر گیا اور چالیس دن تک وہاں رہ کر انتظام مستحکم کیا اور سید یوسف مشہدی کو وہاں کا حاکم مقرر کیا۔ وہاں سے وہ رہتاس آیا۔ جہاں اسے سندھ اور ٹھٹھہ کے سرداران قبائل آ کر ملے۔

۱۵۹۱ء میں اکبر نے سندھ فتح کرنے کے لئے خان خانان، مرزا خان اور کئی دوسرے امراء کے ماتحت ایک لشکر لاہور سے بھیجا۔ اکبر اس زمانے میں لاہور ہی میں مقیم تھا۔ اس لشکر میں سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ ایک سو جنگی ہاتھی اور بھاری توپ خانہ بھی تھا۔ لیکن سندھ کو سلطنت دہلی میں شامل کرنے کی یہ کوشش ناکام رہی۔ بادشاہ نے ایک اور مہم بھیجی، جس نے اس علاقے کو فتح کر کے ممالکِ محروسہ کا حصہ بنا دیا۔ اور وہاں کے سابق حاکم کو اکبر نے اپنے دربار میں ایک اعلیٰ منصب عطا کیا۔

۱۵۹۳ء میں روشنائی افغانوں کے سردار ملک جلالہ نے وادی کشمیر کے امن کو درہم برہم کر دیا۔ جعفر خان جو آصف خان کے نام سے مشہور تھا، نے اس بغاوت کو فرو کیا اور ملک جلالہ اور اس کے بھائی کو گرفتار کر کے شاہی حضوری میں روانہ کر دیا۔

اب تک ہم نے ان واقعات کا تفصیل سے ذکر کیا جو عہدِ اکبری میں پنجاب اور اس کے ملحقہ علاقوں میں ظہور پذیر ہوتے رہے۔ اب ہم اس عہد کے چند اور پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے:

اکبر نے برسرِ اقتدار آتے ہی غیر مسلموں کو اپنا حامی بنانے کے لئے کئی اقدامات کئے۔ جنگی قیدیوں کے غلام بنانے کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ ہندوؤں سے ایک خاص ''یاترہ'' ٹیکس لیا جاتا تھا اسے معاف کر دیا۔ مسلمان حکومتیں غیر مسلموں سے جزیہ لیتی ہیں۔ اکبر نے اس کو بھی ختم کر دیا۔ ان اصلاحات کے بعد اکبر اپنی غیر مسلم رعایا

میں بہت مقبول ہو گیا۔

اکبر کی تخت نشینی کے وقت سارا ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ اکبر نے ان سب کو ایک ایک کر کے فتح کیا۔ ۱۵۶۱ء میں مالوہ فتح ہوا۔ اسی سال جونپور اور چنار بھی سرنگوں ہوئے۔ ۱۵۶۲ء میں ریاست جے پور کے راجہ پورن نے نہ صرف اطاعت قبول کی بلکہ اپنی بیٹی اکبر کی زوجیت میں اور اپنا بیٹا بھگوان داس اکبر کی ملازمت میں بھی دے دیا۔ اسی سال مرتھا کا قلعہ معمولی محاصرے کے بعد فتح ہوا۔ ۱۵۶۴ء میں گونڈوانہ مسخر ہوا۔ جہاں سے بہت سا مالِ غنیمت بھی ملا۔ ۱۵۶۸ء میں ہندوستان کی تقریباً سب سے مضبوط ریاست چتوڑ ایک طویل محاصرے اور شدید جنگ کے بعد تسخیر کر لی گئی۔ اگلے سال رنتھبور پر بھی قبضہ ہو گیا۔ اسی سال کالنجر بھی تاج دہلی کے زیرِ نگیں آ گیا۔ ۱۵۷۰ء تک تمام راجستھان اکبر کی عملداری میں آ چکا تھا۔ ۱۵۷۳ء میں برصغیر کے ایک بہت ہی اہم اور زرخیز ترین صوبے پر مغل اقتدار کا پرچم لہرانے لگا۔ ۱۵۷۴ء میں بنگال اور بہار کے خلاف مہم شروع کی گئی۔ جو ۱۵۷۶ء میں مکمل کامیابی سے ہمکنار ہوئی اس کے بعد اکبر نے کابل، کشمیر اور سندھ وغیرہ فتح کیے جن کا مفصل حال قبل ازیں آ چکا ہے۔ ۱۵۹۲ء میں اڑیسہ بھی اکبر کی وسیع سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اب اکبر نے دکن کی غیر منظم مگر مالدار ریاستوں کی تسخیر کی طرف توجہ دی۔ اس سلسلے میں شاہی لشکر اور مقامی فوجوں کے درمیان کئی معرکے ہوئے اور بالآخر ۶ جنوری ۱۶۰۱ء کو اسیر گڑھ کا مشہور قلعہ فتح ہو جانے کے بعد دکن کی مہم تقریباً مکمل ہو گئی۔ اور یوں اکبر کی سلطنت کی حدود مشرق میں بنگال سے لے کر مغرب میں بلوچستان تک اور شمال میں کابل سے لے کر جنوب میں راس کماری تک پھیل گئیں۔ یہ ایک بہت وسیع سلطنت تھی جس کا انتظام اکبر نے اپنے قابلِ مشیروں کی مدد سے کماحقہ کیا اور جہانگیر کو ورثے میں ایک مستحکم سلطنت ملی۔

اکبر کے دورِ حکومت میں کئی بغاوتیں بھی ہوئیں۔ بعض مشہور بغاوتوں کا حال ہم یہاں بیان کرتے ہیں:

۱۵۶۱ء میں ازبک سرداروں نے اکبر کی بعض پالیسیوں

کو ناپسند کرتے ہوئے علم بغاوت بلند کر دیا۔ آخر تین سال کی مسلسل جھڑپوں کے بعد اس بغاوت کا خاتمہ ہوا۔ بادشاہ کے سوتیلے بھائی محمد حکیم مرزا کی بغاوت کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ان میں سب سے اہم اور خطرناک بغاوت شہزادہ سلیم کی تھی۔ جس سے اکبر کو بہت محبت تھی۔ اور جو اس کی تمناؤں کا مرکز تھا۔ اکبر اسے پیار سے شیخو بابا کہا کرتا تھا۔ اکبر نے اسے اعلیٰ درجے کی تعلیم دلائی۔ چونکہ جہانگیر کا بچپن اپنے باپ، دادا اور پردادا کے ایامِ طفولیت کے برعکس نہایت پرامن حالات اور عیش وعشرت کی فضا میں گزرا تھا اس لئے وہ شروع سے خودسر اور تساہل کیش اور عیش کوش تھا۔ اس پر اکبر کے حد سے بڑھے ہوئے لاڈ پیار نے اسے حد سے زیادہ بگاڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ باپ کے مقابل آ گیا۔ اس کے اس رویّے کی وجہ سے اکبر کے آخری ایام سخت پریشانی میں گزرے۔ شہزادہ سلیم کی بغاوت تقریباً پانچ سال جاری رہی۔ اس دوران میں ایک دفعہ سلیم کی ماں نے باپ بیٹے میں صلح بھی کرائی۔ مگر سلیم بعد میں پھر باغی ہو گیا۔ اس سے قبل اکبر کا منجھلا بیٹا مراد کثرتِ مے نوشی سے مر چکا تھا۔ سلیم کی اس بغاوت کے دوران اکبر کا تیسرا بیٹا دانیال بھی شراب کے زیادہ استعمال کی وجہ سے اپریل ۱۶۰۴ء میں مر گیا۔ ستمبر ۱۶۰۴ء میں اکبر کی والدہ مریم مکانی بھی فوت ہو گئی۔ قبل ازیں جب اکبر نے اپنے قابلِ اعتماد وزیر شیخ ابوالفضل کو سلیم کے معاملے میں مشورے کے لئے دکن سے طلب کیا تھا تو سلیم نے اس نابغۂ روزگار شخصیت کو کرائے کے ایک قاتل کے ذریعے ہلاک کروا دیا تھا۔ جس کا اکبر کو بہت رنج تھا۔ ان پے درپے حادثات کی وجہ سے اکبر کی صحت پر بہت برا اثر پڑا اور وہ اکثر صاحب فراش رہنے لگا۔

بالآخر اکبر اور سلیم کی صلح ہو گئی۔ اسی دوران دربار کا ایک طبقہ سلیم کے بیٹے خسرو کے حق میں ہو گیا۔ اور اسے بادشاہ بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ لیکن اکبر نے اپنے آخری وقت میں خود سلیم کو بادشاہ نامزد کر کے خانہ جنگی کا دروازہ بند کر دیا۔

اب اکبر کی بیماری میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ اور آخر کار وہ ۲۵ اور ۲۶ اکتوبر ۱۶۰۵ء کی درمیانی رات کو پیچش کی شدت کی وجہ سے فوت ہو گیا۔ اس نے انچاس برس تک برصغیر پر بڑے جاہ وجلال اور تزک و احتشام سے حکومت کی۔

اب آخر میں ہم اکبر کے "دینِ الٰہی" کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال کریں گے۔ دینِ الٰہی تاریخ کا ایک مستقل موضوع ہے۔ جس پر تمام مورخین نے بہت کچھ کارفرمائی کی ہے۔ اکبر شروع میں تو ایک پکا مسلمان تھا۔ اس کے عقائد اور ایک عام مسلمان کے عقائد میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ مسجدوں میں جاروب کشی کرتا اور اذانیں دیتا۔ لیکن بعد میں بعض خوشامدی درباریوں کی حد سے بڑھی ہوئی چاپلوسیوں کی وجہ سے اس کے دماغ میں فتور آ گیا۔ اور اِس نے اپنے آپ کو خُدا کا خلیفہ کہنا شروع کر دیا۔ اِس کا یہ نیا دین اسلام، ہندومت، بدھ مت، عیسائیت، یہودیت، مجوسیّت وغیرہ تمام مذاہب کا ایک ملغوبہ تھا۔ اکبر نے ان تمام مذاہب کے چیدہ چیدہ عقائد کو ملا کر اپنے دین کی بنیاد رکھی۔ جن میں بعض عقائدِ اسلام کے سراسر خلاف بھی تھے۔

تمام مذاہب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے اکبر نے برصغیر میں نووارد پرتگیز اور انگریز پادریوں کو دربار میں بلایا۔ اِسی زمانے میں اکبر نے اپنا صدر مقام لاہور کو بنا رکھا تھا۔ یہاں وہ ۱۵۸۲ء سے ۱۵۹۸ء تک مقیم رہا۔ اور عیسائی مشنریوں کے کئی وفد اس دور میں اکبر کے پاس لاہور آئے۔ یہیں اس نے ایران سے زرتشتی مذہب کے ایک عالم کو بھی بلایا۔

یہ نیا دین رائج کرنے کی دو وجوہات بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی تو یہ کہ اکبر بذاتِ خود ایک کورا ان پڑھ تھا۔ جس مذہب کا عالم آ کر اس سے اپنے مذہب کی تعلیمات

بیان کرتا تو اکبر، جو خود تنقیدی شعور سے محروم محض تھا۔ فوراً اس کی باتوں کو مبنی برحق مان لیتا اور اگر اس کے بعد کوئی دوسرا آ کر پہلے کی تکذیب کرتا تو اکبر کہتا "ہاں واقعی وہ غلط کہتا تھا اور تم صحیح کہتے ہو" یوں اس کا ذہن مختلف نظریات کی آماج گاہ بن گیا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اکبر اپنی ہندو رعایا کو محض اپنے مسلمان ہونے کی بنا پر ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ابتداء ہی سے ہندوؤں کے ساتھ روادارانہ پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نئے دین میں بھی اس نے کوئی ایسا عقیدہ شامل نہیں کیا جس سے ہندومت پر زد پڑتی ہو۔ یعنی اس نے اپنے پیروؤں کو گوشت کھانے کی ممانعت کر دی اور انہیں ماتھے پر تلک لگانے کی ہدایت کی۔ پوری مملکت میں گائے ذبح کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ نئے مندر جانے کی اجازت اور پرانے مندروں کی تعمیر و ترقی کیلئے امداد دی۔ اکبر خود بھی مندروں میں جاتا اور پوجا پاٹ میں شریک ہوتا۔ غرض اکبر کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے مذہب اسلام شاہی سرپرستی سے محروم ہو گیا۔ اور تبلیغ کا سلسلہ رک گیا۔ لیکن اس پر بھی اکبر کے مریدوں کی تعداد بہت کم رہی۔ کیونکہ اکبر نے اپنے مذہب کے ابلاغ عام کے لئے کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہ کیا اور نہ کسی کو جبراً اپنے دین میں شامل کرنے کی سعی کی۔ چنانچہ یہ دین جو اکبر کی زندگی ہی میں بہت محدود تھا، جہانگیر کے برسرِ اقتدار آنے پر بالکل ہی محدود ہو گیا۔ دوسرے اس دین کا سب سے بڑا شارح شیخ ابوالفضل اکبر کی زندگی ہی میں مر گیا تھا۔ تیسرے اِس دین کی تردید میں حضرت مجدد الف ثانی نے پرزور تحریک چلائی اور یوں یہ دین تھوڑی ہی مدت کے بعد بالکل ختم ہو گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اکبر اپنے آخری وقت تک انہی ملحدانہ خیالات پر قائم رہا۔ لیکن جہانگیر اور بعض دوسرے مورخین یہ کہتے ہیں کہ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ان خیالات سے توبہ کر لی تھی اور اس کا خاتمہ اسلام پر ہوا۔

نُورالدین جہانگیر

(۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء)

جہانگیر ۱۵۶۹ء میں پیدا ہوا۔ اس سے پہلے اکبر کے ہاں کئی بچے ہوئے مگر کوئی زندہ نہ رہا۔ جہانگیر کی پیدائش سے پہلے اکبر نے اجمیر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر حاضری دی۔ اور وہاں خدا کے حضور میں اپنی اولاد کے لئے عمر کی زاری کی۔ اس نے منت مانی کہ اگر خدا مجھے زندہ فرزند سے نوازے تو میں پاپیادہ آ کر خواجہ اجمیر کی آستاں بوسی کا شرف حاصل کروں گا۔ فتح پور سیکری میں ایک بزرگ شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا اور ان سے دُعا کے لئے درخواست کی۔ شیخ سلیم چشتیؒ نے اکبر کے لئے خضوع وخشوع سے دُعائیں کیں۔

اکبر نے اپنی بیوی کو وقتِ ولادت سے پہلے ہی شیخ سلیم چشتی کے تکیے [1] پر بجھوا دیا اور وہیں ۳۰ اگست ۱۵۶۹ء کو اکبر کے لڑکا پیدا ہوا۔ شیخ سلیم نے اپنے نام پر اس کا نام سلیم رکھا۔ لیکن اکبر نے کبھی بھی شہزادے کو اس نام سے خطاب نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ ہی اُسے ''شیخوجی'' یا ''شیخو بابا'' کہتا تھا۔ اکبر نے اس موقعے پر بہت خوشی منائی۔ سلیم اس کی آرزوں اور تمناؤں کا مرکز تھا۔ وارث تاجِ تیموریہ کی پیدائش کی خوشی میں امراء انعامات سے سرفراز ہوئے۔ غریبوں میں خیرات بٹی اور قیدی آزاد ہوئے۔ سلیم کی پرورش بڑے نازونعم سے ہونے لگی۔

جب جہانگیر کی عمر چار سال، چار ماہ اور چار دن کی ہوئی تو اس کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ وقت کے تمام علماء و فضلاء مختلف علوم وفنون کی تدریس کے لئے مقرر ہوئے۔ مغلیہ

---

[1] یہ بزرگ فتح پور سیکر میں رہتے تھے جو اس زمانے میں ایک معمولی قصبہ تھا لیکن بعد میں اکبر نے اس جگہ کئی عمارتیں تعمیر کیں اور جلد ہی یہ ایک بڑے شہر میں تبدیل ہو گیا۔

دربار کی سب سے فاضل شخصیت یعنی عبدالرحیم خان خاناں کا بحیثیت اتالیق مقرر ہوا۔ شہزادہ سلیم نے تعلیم کے ''مراحل بڑی کامیابی سے طے کئے اور پندرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگیا۔ ۱۵۷۷ء میں جہانگیر کو دس ہزاری منصب عطا ہوا۔ جب شہزادے نے تعلیم مکمل کی تو اس کو بارہ ہزار کا منصب دار بنا دیا گیا۔ اس سے پہلے جہانگیر کئی مہمات کی قیادت کر چکا تھا۔ مثلاً کابل کی مہم جو بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔

جب شہزادہ تحصیل علوم سے فارغ ہوا تو اکبر نے اپنے دربار کے ایک نامور امیر، راجہ بھگوان داس جو اعلیٰ روایات کے مالک راجپوت خاندان کا معزز فرد تھا، کی لڑکی مان بائی سے جہانگیر کی شادی کر دی۔ شاہی خاندان کے ممتاز افراد کی راجپوت گھرانوں میں یہ شادیاں اکبر کی ''راجپوت نواز پالیسی'' کا عملی مظاہرہ تھیں۔ دو سال بعد اس بیوی سے جہانگیر کے ہاں پہلا لڑکا تولد ہوا جس کا نام خسرو رکھا گیا۔ اس کے بعد بھی جہانگیر نے متعدد شادیاں کیں۔ راجا اودھے سنگھ کی بیٹی جگت گوسائی عرف جودھیا بائی سے، جس کے ہاں ۱۵۹۱ء میں بمقام لاہور شہزادہ خرم (شاہجہان) پیدا ہوا۔

زین خان کوکہ کی بیٹی صاحب جمال سے ۱۵۸۹ء میں شادی ہوئی۔ جس کے بطن سے کابل میں شہزادہ پرویز متولد ہوا۔ ۱۵۹۰ میں راجا کیشو داس راٹھور کی بیٹی سے بیاہ ہوا جس سے ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ اسی طرح اور بھی کئی شادیاں ہوئیں اور ان سے بھی اولاد ہوئی۔ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا شہریار ایک خواص سے تھا جو بعد میں نور جہاں کا داماد بنا۔ اِن تمام خواتین میں جو اقبال اور شہرتِ دوام نور جہاں کو حاصل ہوا وہ کسی اور کے حصے میں نہ آیا۔ نور جہاں سے جہانگیر کی شادی ۱۶۱۱ء میں ہوئی تھی۔

۱۵۹۶ء میں اکبر جو دکن کی مہمات میں مصروف تھا، نے جہانگیر کو راجا اودھے پور کی بغاوت فرو کرنے کا حکم دیا۔ لیکن بعض درباریوں کے کہنے اور کچھ دیگر عوامل کی وجہ سے جہانگیر نے تعمیل حکم سے گریز کیا اور باپ کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر آگرہ پر قبضہ کرنے اور خود بادشاہ بننے کا منصوبہ بنایا کیونکہ اس کے مصاحبین کہتے تھے کہ بادشاہت سے حظ اٹھانے کی عمر یہی ہے۔ جہاں پناہ تو معلوم نہیں کب فوت ہوں گے لیکن آپ کی عمر

گزری جارہی ہے۔ چنانچہ جہانگیر نے باپ کا اقتدار ختم کرنے کے لئے آگرہ کی جانب پیش قدمی کی۔ جہانگیر کی اس بغاوت کا مفصل حال پہلے درج ہو چکا ہے۔

اکبر کی وفات کے بعد سلیم ۲۴ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو بڑے تزک و احتشام سے تخت پر متمکن ہوا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر اڑتیس برس تھی۔ اس نے جہانگیر لقب اختیار کیا۔ تمام امراء کو بیش قیمت انعامات دیئے اور غریبوں کو نہال کر دیا۔ اِس موقع پر شہزادہ خسرو کے سب سے بڑے حامیوں یعنی اس کے ماموں راجا مان سنگھ اور اس کے خسر عزیز الدین کوکا نے اپنے گزشتہ طرزِ عمل پر معذرت کی۔ جہانگیر نے کمال فراخ دلی سے انہیں معاف کر دیا۔ اور راجا مان سنگھ کو بنگال کا گورنر مقرر کر کے بھیج دیا۔ اس کے علاوہ اس نے عہد اکبری کے تمام امراء کو اپنے سابقہ عہدوں پر برقرار رکھا۔ جہانگیر نے اپنے بچپن کے ساتھی شریف خان کو اپنا وزیر اعظم اور سعید خان مغل کو پنجاب کا گورنر بنایا۔

جہانگیر نے برسرِ اقتدار آتے ہی اپنے باپ کے لایعنی مذہبی نظریات کو رد کرتے ہوئے اسلام کی صحیح تعلیمات پر عمل کرنا کا حکم دیا۔ حکومت سنبھالتے ہی اس نے سب سے پہلے بارہ احکام صادر کئے اور ان پر مکمل طور پر عمل کرنے کی ہدایت کی۔ تاریخ کی کتابوں میں یہ احکام تفصیلاً مرقوم ہیں۔ یہاں ان کا صرف مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ کئی ناجائز محصولات جو محض عوام پر بوجھ کی حیثیت رکھتے تھے۔ یک قلم موقوف کر دیئے گئے۔

۲۔ رشوت لینے دینے کی سخت ممانعت کر دی۔

۳۔ رہزنوں کی سرگرمیوں کو ختم کرنے کے لئے شاہراہوں کے کنارے سرائیں، کنویں اور مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اِس سے مسافروں کی جان و مال کی حفاظت کا بندوبست ہو گیا۔

۴۔ رعایا کے وراثت کے معاملات میں سرکاری ملازموں کو مداخلت کرنے سے منع کر دیا اور لاوارث افراد کے ترکے کے انتظام کے لئے خاص ملازم مقرر کئے اور اس کا مصرف بھی بتایا۔

۵۔ منشیات پر قطعی پابندی عائد کر دی۔

۶۔ سرکاری ملازمین، رعایا سے ان کے مکانات سرکاری ضرورت کی آڑ میں جبراً حاصل کر لیا کرتے تھے، جہانگیر نے اس کی سختی سے مناہی کی۔

۷۔ بعض بہیمانہ سزائیں مثلاً ناک کان کاٹنا، مکمل طور پر منسوخ کر دیں۔

۸۔ یہ بھی حکم دیا کہ صوبوں کے اعلیٰ حکام شاہی توثیق کے بغیر شادی نہ کریں۔

۹۔ حفظانِ صحت عامہ کے لئے شاہی صرفہ سے تمام شہروں اور قصبوں میں شفا خانے بنائے گئے جہاں مفت دوائیں دی جاتی تھیں۔

۱۰۔ تمام قیدی رہا کر دئے گئے۔

۱۱۔ کوئی جاگیردار، شاہی عامل یا اس کا ملازم رعیت کی کسی زمین کو چھین کر اس میں کاشت نہ کرے۔

۱۲۔ اتوار کو ذبیحہ کا ناغہ قرار دیا کیونکہ یہ اکبر کی پیدائش کا دن تھا۔

ان سب اقدامات کے علاوہ جہانگیر نے بادشاہت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد جو اہم ترین کام کیا وہ یہ تھا کہ تیس گز لمبی ایک زنجیر اپنی خواب گاہ سے لے کر محل سے باہر تک بندھوا دی جس میں کئی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی مظلوم بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بپتا سنانی چاہے تو اس زنجیر کو کھینچ دے۔ گھنٹیوں کی آواز سن کر بادشاہ فوراً اس کی فریاد سنتا اور دادرسی کرتا۔ بصورتِ دیگر شاہی محافظ بادشاہ اور مظلوم کے درمیان بہت بڑی رکاوٹ تھے۔ اس زنجیر کی وجہ سے لوگوں کو انصاف کے حصول میں کوئی رکاوٹ نہ رہی اور سرکاری ملازمین بھی چوکس ہو گئے۔ اس زنجیر کو تاریخ میں ''زنجیرِ عدل'' کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے جہانگیر کی نیک نامی میں بہت اضافہ ہوا۔ اور تاریخ میں اس کا نام ''بادشاہ عادل'' کی حیثیت سے محفوظ ہوا۔ جہانگیر کی خفیہ پولیس بھی بہت منظم تھی اور اس کی مدد سے وہ مختلف صوبوں میں متعین اپنے حکام کے شب و روز سے آگاہ رہتا تھا۔ اور اسے ان کی سرگرمیوں کی خبریں مسلسل پہنچتی رہتی تھیں۔ اور ان کی روشنی میں وہ اپنا لائحہ عمل طے کرتا تھا۔ ان اقدامات کی وجہ سے حکام بہت محتاط

ہو گئے اور کسی کے دِل میں سرکشی یا رعایا کشی کے خیالات پیدا نہ ہو پاتے۔

جہانگیر نے تخت نشینی کے پہلے ہی سال راجا اودھے پور کو باجگزار بنانے کے لئے ایک مہم روانہ کی۔ اکبر کے عہد میں اس ریاست کا بیشتر حصہ فتح ہو چکا تھا لیکن راجہ ابھی تک تاجِ دہلی کی اطاعت پر آمادہ نہ ہوا تھا۔ اس وقت اکبر کا حریف راجہ پرتاب سنگھ مر چکا تھا اور اب اس کی جگہ اس کا بیٹا امر سنگھ باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے شاہ دہلی کی اطاعت سے گریزاں تھا۔ جہانگیر نے یہ مہم جس میں مغل دربار کے کئی نامور سردار مثلاً آصف خان، عبدالرزاق معموری، ممتاز بیگ عموی، راجا جگناتھ، راجا شنکر، مادھو سنگھ، شیخ عبدالرحمان، مہا سنگھ اور راجا منوہر سنگھ شامل تھے۔ اپنے بیٹے پرویز کی قیادت میں روانہ کی۔ جہانگیر نے پرویز کو ہدایت کی کہ اس مہم کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ کیونکہ جہانگیر فوراً اپنی تمام افواج کے ساتھ ماوراء النہر کی تسخیر پر روانہ ہونا چاہتا تھا جس کی فتح کی حسرت اکبر کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی تھی۔ پرویز نے اودھے پور کے تمام علاقے کی ناکہ بندی کر دی اور راجا کے لشکر کو باہر سے رسد و کمک ملنے کے تمام راستے بند کر کے فوجی برتری حاصل کر لی۔ اِس کے نتیجے میں بالآخر راجا امر سنگھ اطاعت گزار بن گیا اور اپنے بیٹے بھاگ کو شاہی ملازمت میں دے دیا۔ پرویز نے راجا کے بیٹے کو عزت و توقیر کے ساتھ آگرہ روانہ کر دیا۔ اِس طرح یہ مہم کامیابی کے ساتھ انجام پزیر ہوئی۔

عہد جہانگیری کے پہلے سال کا سب سے اہم واقعہ بڑے شہزادے، خسرو کی بغاوت ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ دربار کا ایک طبقہ جہانگیر کے بجائے پرویز کو بادشاہ بنانے کے حق میں تھا۔ لیکن اکبر نے اپنی زندگی ہی میں جانشینی کے مسئلے کو طے کر کے اپنے بعد جنگِ اقتدار کے خطرے کو ٹال دیا۔ جب جہانگیر نے تخت و تاج سنبھالا تو یہ تمام پس منظر اس کے پیشِ نظر تھا۔ اور وہ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اگرچہ اس نے اس تحریک کے اصل محرکین راجا مان سنگھ وغیرہ کو معاف کر دیا تھا مگر شہزادہ خسرو کو ایک طرح سے نظر بند کر دیا تھا۔

ایک دِن شہزادہ خسرو نے دادا اکبر کی قبر پر جانے کی جہانگیر سے اجازت چاہی

جو مل گئی۔ لیکن شہزادے نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے ساڑھے تین سو سواروں کے ساتھ پنجاب کا رُخ کیا۔ تاکہ وہاں سے مزید فوج بھرتی کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جائے۔ جونہی جہانگیر کو اس واقعہ کا علم ہوا اس نے فوراً ایک فوج شہزادے کے تعاقب میں بھیجی اور دوسرے دن ایک اور فوج لے کر خود بھی اسی سمت میں روانہ ہو گیا۔

راستے میں خسرو کو حسین بیگ بخشی جو آگرے سے آ رہا تھا، ملا اور خسرو نے اسے بھی اس کے تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ لالچ دے کر اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ خسرو نے اسے اپنے لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا اور عبدالرحیم کو وزیر اعظم۔ راستے میں اور بھی چھوٹے بڑے جتھے اس کے ساتھ ملتے گئے۔ اور لاہور پہنچتے پہنچتے اس کے لشکر کی تعداد دس ہزار ہو گئی۔ اس نے لاہور پر قبضہ کرنا چاہا لیکن لاہور کے گورنر نے مزاحمت کی تو اس نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ جہانگیر برابر تعاقب میں رہا۔ اس نے اس خطرے کے پیشِ نظر کہ اگر شہزادہ پلٹ کر اپنے ماموں مان سنگھ کے پاس بنگال چلا گیا تو اس فتنے سے نمٹنا مشکل ہو جائے گا۔ شہزادے کو صلح کے کئی پیغامات بھیجے۔ اور اسے راہ راست پر آنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ ایک موقع پر تو شہزادہ اپنے آپ کو باپ کے حوالے کرنے پر رضامند بھی ہو گیا تھا۔ مگر اس کے ہمراہیوں، حسین بیگ اور عبدالرحیم نے اسے ایسا نہ کرنے دیا اور کہا کہ ہمارے پاس شاہی لشکر سے زیادہ قوت ہے اس لئے جھکنے کی کیا ضرورت ہے۔

جب جہانگیر نے دیکھا کہ صُلح کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی ہیں تو اس نے باغی لشکر پر اچانک حملہ کر دیا۔ خسرو کے اکثر ساتھی جنگ سے پہلے ہی فرار ہو گئے۔ معمولی سی جھڑپ کے بعد شاہی لشکر فتح یاب ہوا۔ اور شہزادے کو گرفتار کر کے جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جہاں شہزادے نے اپنی خطاؤں کی معافی کے لئے باپ کے پاؤں پڑنا چاہا مگر جہانگیر نے اُسے سختی سے ڈانٹا اور اسے مجرموں کی صف ہی میں کھڑا رہنے کا حکم دیا۔ خسرو کو تو مقید کر دیا گیا، لیکن حسین بیگ بخشی اور عبدالرحیم کو گدھے اور گائے کی کھال میں بند کر کے گدھے پر سوار کیا اور سارے شہر میں پھرایا گیا جس سے بالآخر وہ مَر گئے۔ شہزادے کی فوج میں شامل بہت سے سپاہیوں کو بھی پکڑ لیا گیا۔ بادشاہ نے مرزا کامران کی

بارہ دری سے لے کر لاہور شہر تک دو رویہ سولیاں گاڑ کر ان باغیوں کو ان پر لٹکا دیا۔ دوسرے دِن شہزادے کو ہاتھی پر بٹھا کر بالالتزام اسی راستے سے گزارا گیا۔ تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کا یہ اندوہناک انجام دیکھ کر آئندہ کے لئے عبرت پکڑے۔ شہزادہ اس منظر کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور زار زار رویا۔ اس طرح جہانگیر نے اپنے عہد کی اِس پہلی بغاوت کو کچل دیا۔

برسرِ پیکار باغیوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد جہانگیر نے ان لوگوں کے بارے میں تفتیش شروع کی۔ جنہوں نے خفیہ طور پر شہزادہ خسرو کی مالی اور اخلاقی مدد کی تھی۔ اس سلسلے میں بہت سے لوگ گرفتار کئے گئے۔ جن میں سب سے اہم شخصیت سکھ مت کے پانچویں پیشوا گرو ارجن مل کی تھی۔ خسرو جب لاہور آ رہا تھا تو اس نے ترنتارن کے مقام پر گورو سے ملاقات کی۔ گورو نے اس کی بہت آؤ بھگت کی۔ شہزادے کے ماتھے پر تلک لگایا اور اس کے ہمراہیوں کے لئے کھانے کا اہتمام کیا۔ بعض روایات کے مطابق گورو نے شہزادے کو مالی اور فوجی امداد بھی دی اور نیک خواہشات کے ساتھ رخصت کیا۔ جہانگیر نے نزدیک گورو کا یہ جرم ناقابل معافی تھا لہذا جب گورو کو رسن بستہ پیش کیا گیا تو جہانگیر نے اِس جرم کی سزا کے طور پر ان کو دو لاکھ روپیہ جرمانہ ادا کرنے کا حکم دیا لیکن گورو نے صاف الفاظ میں جرمانے کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ ہم فقیر لوگوں کے پاس اتنی رقم کہاں؟ جرمانے کی عدم ادائیگی کی صورت میں جہانگیر نے گورو کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ گورو کو قتل کر دیا گیا۔ اس واقعے پر ہم تفصیل سے گورو صاحبان کے لئے مخصوص باب میں روشنی ڈالیں گے۔

خسرو کی بغاوت فرو کرنے کے بعد جہانگیر کچھ دن کے لئے لاہور میں رک گیا یہیں اسے اطلاع ملی کہ قزلباشوں نے قندھار کا محاصرہ کر لیا ہے اور ان کے ارادے وہاں قبضہ کرنے کے ہیں۔ جہانگیر نے فوراً ایک لشکر غیاث بیگ خان کی سالاری میں قندھار کی طرف بھیجا اور اس کے چند ہی دن بعد خود بھی ایک بڑی فوج لے کر قزلباشوں کی یورش روکنے کے لئے جانا چاہا۔ ہندوستان میں حکومت کا انتظام چلانے کے لئے بادشاہ نے

بارہ دری سے لے کر لاہور شہر تک دورویہ سولیاں گاڑ کر ان باغیوں کو ان پر لٹکا دیا۔ دوسرے دِن شہزادے کو ہاتھی پر بٹھا کر بالالتزام اسی راستے سے گزارا گیا۔ تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کا یہ اندوہناک انجام دیکھ کر آئندہ کے لئے عبرت پکڑے۔ شہزادہ اس منظر کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور زار زار رویا۔ اس طرح جہانگیر نے اپنے عہد کی اِس پہلی بغاوت کو کچل دیا۔

برسرِ پیکار باغیوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد جہانگیر نے ان لوگوں کے بارے میں تفتیش شروع کی۔ جنہوں نے خفیہ طور پر شہزادہ خسرو کی مالی اور اخلاقی مدد کی تھی۔ اس سلسلے میں بہت سے لوگ گرفتار کیئے گئے۔ جن میں سب سے اہم شخصیت سکھ مت کے پانچویں پیشوا گرو ارجن مل کی تھی۔ خسرو جب لاہور آرہا تھا تو اس نے ترنتارن کے مقام پر گورو سے ملاقات کی۔ گورو نے اس کی بہت آؤ بھگت کی۔ شہزادے کے ماتھے پر تلک لگایا اور اس کے ہمراہیوں کے لئے کھانے کا اہتمام کیا۔ بعض روایات کے مطابق گورو نے شہزادے کو مالی اور فوجی امداد بھی دی اور نیک خواہشات کے ساتھ رخصت کیا۔ جہانگیر نے نزدیک گورو کا یہ جرم ناقابل معافی تھا لہذا جب گورو کو رسن بستہ پیش کیا گیا تو جہانگیر نے اِس جرم کی سزا کے طور پر ان کو دولاکھ روپیہ جرمانہ ادا کرنے کا حکم دیا لیکن گورو نے صاف الفاظ میں جرمانے کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ ہم فقیر لوگوں کے پاس اتنی رقم کہاں؟ جرمانے کی عدم ادائیگی کی صورت میں جہانگیر نے گورو کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ گورو کو قتل کر دیا گیا۔ اس واقعے پر ہم تفصیل سے گورو صاحبان کے لئے مخصوص باب میں روشنی ڈالیں گے۔

خسرو کی بغاوت فرو کرنے کے بعد جہانگیر کچھ دن کے لئے لاہور میں رک گیا یہیں اسے اطلاع ملی کہ قزلباشوں نے قندھار کا محاصرہ کر لیا ہے اور ان کے ارادے وہاں قبضہ کرنے کے ہیں۔ جہانگیر نے فوراً ایک لشکر غیاث بیگ خان کی سالاری میں قندھار کی طرف بھیجا اور اس کے چند ہی دن بعد خود بھی ایک بڑی فوج لے کر قزلباشوں کی یورش کو روکنے کے لئے جانا چاہا۔ ہندوستان میں حکومت کا انتظام چلانے کے لئے بادشاہ نے خلج

خان، میران صدر جہاں اور شریف آملی کو مقرر کیا لیکن قندھار کے صوبے دار شاہ بیگ خان نے دانش مندی اور جرأت سے دفاع کیا۔ اور کافی دِن تک محاصرین کو قلعہ پر قبضہ نہ کرنے دیا۔ دوسرے جب شاہی فوج بھی اِس کی مدد کے لئے پہنچ گئی تو حملہ آور سراسیمہ ہو گئے۔ ان کے پاس اتنی قوت تو تھی نہیں کہ ان کا مقابلہ کرتے لہذا محاصرہ اٹھا کر بھاگ گئے۔ اس تمام کارروائی کے دوران ایران کے بادشاہ شاہ عباس صفوی نے خاموش تماشائی کا کردار ادا کیا۔ وہ واضح طور پر مغلیہ سلطنت سے ٹکر نہیں لینا چاہتا تھا۔ اِس لئے جب اس نے اِس مہم کی ناکامی کا حال سُنا تو فوراً جہانگیر کے پاس اپنے ایلچی بھیجے کہ یہ حرکت ایک صوبائی افسر نے مرکز کی اجازت کے بغیر کی ہے جس پر اسے سرزنش کی گئی ہے۔ ایرانی دربار اس سلسلے میں موردِ الزام نہیں ہے۔ ایرانی دربار تو خاندان تیموریہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات کا خواہاں ہے۔ شاہ عباس نے یہ بھی کہا کہ 'جونہی مجھے اس یورش کا علم ہوا میں نے فوراً تاج دہلی کی حدود سے فوجیں نکال لینے کی ہدایت کر دی' یہ ایلچی جہانگیر کے پاس لاہور میں حاضر ہوا تھا۔ جہانگیر اس وضاحت کے بعد مطمئن ہو گیا اور اس نے خود بھی معاملے کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔

جب خسرو کی بغاوت اور قزلباشوں کی یورش سے جہانگیر کو اطمینان ہوا تو اس نے کابل جانے کا ارادہ کیا۔ تا کہ وہاں بزرگوں کے آثار کی زیارت کر سکے۔ دوسرے اسے وہاں شکار وغیرہ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اس مقصد کے لئے وہ ۲۷ مارچ ۱۶۰۷ء کو لاہور سے روانہ ہوا اور دریائے راوی کے دوسرے کنارے پر واقع ''باغ دِل افروز'' میں چار دن تک قیام کیا اور اس باغ کی دِل آویز فضا میں موسم کی لطافتوں سے لطف اٹھایا۔ پانچویں دن شاہی قافلہ وہاں سے چلا اور ساڑھے تین کوس کے فاصلے پر ہری پور کے قصبے میں اترا۔ اور اگلے دن اپنی ذاتی شکارگاہ جہانگیر پور میں وارد ہوا۔ یہاں سے کوچ کر کے دوسرے دن چاندوالی پہنچے اور اس سے اگلے دن حفیظ آباد کو منزل بنایا۔ یہاں بادشاہ نے بلند عمارتیں تعمیر کرنے کا حکم دیا اور اس تعمیر کا نگران میر قران الدّین کو مقرر کیا۔ شاہی شہزادے یہاں سے چلے تو گجرات میں اترے۔ یہاں اکبر بادشاہ نے دریا کے کنارے ایک

قلعہ تعمیر کیا تھا۔ اس قلعے کے آس پاس اکثر آبادی گوجروں کی تھی اس لئے اس قصبے کا نام ہی گجرات ہو گیا۔ جہانگیر یہاں سے روانہ ہوا تو رہتاس میں جا کر قیام کیا۔ اس نے اپنی ''تزک'' میں اس قلعے کے فن تعمیر اور دفاعی صلاحیت کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ قلعہ شیر شاہ سوری نے گکھڑوں کی باغیانہ سرگرمیوں کے سدباب کے لئے بنوایا تھا۔ بادشاہ رہتاس سے روانہ ہوا اور راستے کی رنگینیوں سے محظوظ ہوتا ہوا حسن ابدال پہنچا۔ مقامی باشندوں سے اس مقام کی وجہ تسمیہ اور تاریخ دریافت کی۔ مگر کوئی بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ اس جگہ جہانگیر نے ایک جھیل میں مچھلی کا شکار کھیلا۔ اس نے مچھلی پکڑنے کے لئے پہلی بار جال کا استعمال کیا۔ یہاں اس نے اپنے باپ کے خاص مصاحب ابوالفتح گیلانی کا مزار بھی دیکھا۔ حسن ابدال سے پشاور آیا اور اس علاقے کے تمام قابلِ ذکر مقامات دیکھے۔ قدرتی مناظر کی بطورِ خاص سیر کی۔ یہاں سے روانہ ہو کر کابل جا پہنچے۔ اس سارے سفر کا حال بڑے حسین پیرائے میں جہانگیر نے اپنی ''تزک'' میں درج کیا ہے۔ اس نے یہ سفر مکمل طور پر تفریح کے نقطۂ نظر سے اختیار کیا تھا۔ کابل میں بھی اس نے وادیوں، دریاؤں اور جنگلوں کی سیر کی، شکار کھیلا، بزرگوں سے منسوب یادگاریں دیکھیں۔ اس کے علاوہ اس نے کابل میں بعض اصلاحات بھی نافذ کیں۔ بعض ناجائز ٹیکس جو مدت سے لوگوں پر بار بنے ہوئے تھے، ختم کر دئے۔ عوام کے دلوں میں اپنے دورے کا بہترین تاثر چھوڑا۔

اس سفر میں شہزادہ خسرو بھی جہانگیر کے ہمراہ تھا۔ مگر اس حالت میں کہ پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ کابل پہنچ کر جہانگیر نے پدرانہ شفقت کے تحت اس کو آزاد کر دیا تاکہ وہ بھی اجداد کے آثار دیکھ سکے۔ مگر یہاں بھی شہزادے نے باپ کو ختم کرنے کے لئے پھر سے کوششیں شروع کر دیں۔ اور کئی لوگوں کو آمادہ کر لیا کہ جب بادشاہ تقریباً تنہا شکار کھیل رہا ہو گا تو تم بادشاہ کا شکار کر لینا۔ جب جہانگیر کو خسرو کی اس حرکت کا علم ہوا تو اس نے بیٹے کو بہت کچھ سخت سُست کہا۔ اور اس کے بعد اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دی گئیں اور اسے پھر سے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ بعد میں اس کو چھوٹے شہزادے خرم (شاہجہان) کے سپرد کر دیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ دکن لے گیا۔ جہاں اسے

قتل کر دیا اور باپ کو لکھ بھیجا کہ خسرو طبعی موت مر گیا ہے۔

کابل میں قیام کے دوران ہی میں بادشاہ کو قتل کرنے کی ایک بہت بڑی سازش کا انکشاف ہوا۔ اِس سازش کا سب سے اہم محرک حکیم ابوالفتح کا لڑکا فتح اللہ تھا۔ دربار کے کئی اور اہم نمک خوار بھی اس کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ شہزادہ خرم کی نشان وہی پر اکثر سازشیوں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ کابل ہی میں آگرہ سے اسلام خان نے اطلاع بھجوائی کہ بنگال کے حاکم قطب الدین خان کو علی قلی خان استجلو (شیر افگن) نے ہلاک کر دیا ہے جس پر قطب الدین کے سپاہیوں نے علی قلی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ بادشاہ اس اطلاع کے ملتے ہی اگست ۱۶۰۷ء کو کابل سے آگرہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ کابل میں اس نے تقریباً گیارہ ماہ قیام کیا۔ شیر افگن کے واقعہ کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے ضروری دم ہوتا ہے کہ شیر افگن اور نور جہان کے بارے میں کچھ باتیں بھی لکھ دی جائیں۔

شاہ طہماسپ صفوی کے زمانے میں خراسان پر محمد خان تکلو حاکم تھا۔ اس کا ایک زیر خواجہ محمد شریف طہرانی تھا۔ جب محمد خان فوت ہوا تو محمد شریف، شاہ طہماسپ کے ربار میں چلا گیا اور وہاں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوا۔ انہی دنوں ہمایوں بحال تباہ شاہ طہماسپ کے پاس پہنچا۔ تو شاہ نے اسی محمد شریف طہرانی کو ہمایوں کا افسر مہمانداری مقرر کیا جس نے بڑے خلوص سے ہمایوں کی خدمت کی۔ محمد شریف کے دو بیٹے تھے آغا طاہر اور مرزا غیاث بیگ۔ غیاث بیگ کی شادی عماد الدولہ حاکم خراسان کی بیٹی سے ہوئی لیکن چھے دن ہمیشہ نہیں رہتے۔ مرزا غیاث بیگ بھی حوادثِ زمانہ میں گرفتار رہا اور دل برداشتہ ہو کر وطن سے اس امید پر نکلا کہ شاید قسمت یاوری کرے اور اکبر کے دربار میں کوئی اچھی نوکری مل جائے۔ چنانچہ ایک قافلے کے ساتھ ہندوستان کے لئے روانہ ہوا۔ زادِ راہ پاس نہ تھا۔ اور چھ افراد کی سواری کے لئے اونٹ صرف دو تھے۔ اس لئے سب باری باری سوار ہوتے۔ چونکہ مرزا غیاث بیگ کی زوجہ امید سے تھی لہذا سب سے زیادہ اسے ہی سواری کا موقع دیا جاتا۔ اس عالمِ غربت و یاس میں قندھار کے قریب لڑکی پیدا ہوئی تو ماں باپ جو پہلے ہی نان و نمک سے تہی دست تھے اب اور بھی گرفتار بلا ہوئے۔

لڑکی کی صورت میں ان کے لئے ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ وہ ہرگز اس بوجھ کو اٹھانے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ماں باپ نے دل پر پتھر رکھ کر بچی کو کپڑے میں لپیٹ کے ایک درخت کے نیچے چھوڑ دیا اور خود قافلے کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔

اس قافلے کا سردار ملک مسعود، جو ایک امیر کبیر تاجر تھا، جب اس درخت کے قریب سے گزرا جہاں یہ بچی پڑی روتی تھی، اسے دیکھ کر وہ بہت متعجب ہوا اور سوچا کہ ایک تو میں ہوں کہ اولاد کے لئے ترس رہا ہوں اور ایک یہ ماں باپ ہیں کہ پھول جیسی بچی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ چنانچہ اس نے اس بچی کو اٹھا لیا اور بیٹی کی حیثیت سے اس کی پرورش کا عزم کیا۔ اب اس بچی کے لئے ایک دایہ کی ضرورت پیش آئی۔ جو اس بچی کو دودھ پلا سکے۔ کافی تلاش و جستجو کے بعد اتفاق سے اس بچی کی ماں ہی اس کام کے لئے ملی۔ ملک مسعود نے اس خدمت کے عوض اسے کافی رقم دی اور اس کے خاندان کے لئے سواریاں مہیا کیں۔ جب ملک مسعود کو اس خاندان کے پس منظر کا علم ہوا تو وہ بہت متاثر ہوا اور اس نے ان کی ہر ممکن مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

اس کس مپرسی کے عالم میں اس دنیا میں قدم رکھنے والی یہ بچی بعد میں 'نور جہاں' کے نام سے برصغیر کی ملکہ بنی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس جیسی نامور اور باوقار ملکہ تاریخ ہند میں دوسری کوئی نہیں۔ اس بچی کے بختِ بلند کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اسکی پیدائش کے ساتھ ہی اس کے خاندان سے مفلسی کے بادل چھٹ گئے اور انہیں مالی طور پر اطمینان نصیب ہوا۔ ملک مسعود اس خاندان کو بڑے احترام اور آرام سے آگرے لے آیا۔ یہاں ایک دن اس نے بادشاہ اکبر کو اس خاندان کے بارے میں بتایا تو بادشاہ نے مرزا غیاث کو باریاب کرنے کا حکم دیا۔ جب مرزا غیاث حاضر ہوا تو بادشاہ بڑی مہربانی سے پیش آیا۔ اس نے مرزا غیاث کے حالات کو بڑی توجہ اور دل سوزی سے سُنا۔ اکبر اس کے تبحر علمی سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ مرزا غیاث نے جب اسے بادشاہ ہمایوں کے ساتھ اپنی خاندانی وابستگی بتائی تو اکبر کے دِل میں اس کی قدر و منزلت مزید بڑھ گئی۔ چنانچہ اس ملاقات کے بعد بادشاہ نے مرزا غیاث کو اپنی ملازمت میں لے لیا اور جوں

انتخاب بھی اکبر ہی نے کیا تھا۔ چنانچہ بہت جلد ان کی شادی کر دی گئی۔ اکبر نے علی قلی کا بنگال میں تقرر کیا۔ اور وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر وہاں چلا گیا۔ وہاں ان کے ہاں ایک بچی بھی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصے تک شہزادہ سلیم کے خاص دستے میں بھی رہا۔

جب جہانگیر بادشاہ ہوا تو اس نے علی قلی کو اپنے راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا۔ اس مقصد کے لئے جہانگیر نے ایک دن اسے ایک جنگلی شیر سے مقابلہ کرنے کی دعوت دی۔ تاکہ اس کی شجاعت کا اندازہ ہو سکے۔ لیکن جہانگیر کو مایوسی ہوئی اور علی قلی نے شیر کو مار ڈالا۔ اس پر بادشاہ بظاہر بہت خوش ہوا اور اس نے علی قلی کو "شیر افگن" کا خطاب عطا کیا۔ لیکن جہانگیر تو بہر حال اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک دن اس پر ایک بپھرا ہوا ہاتھی چھوڑ دیا گیا۔ شیر افگن نے ہاتھی کی سونڈ کو تلوار کے ایک ہی وار میں اڑا دیا۔ اس طرح دوسری مرتبہ بھی بادشاہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اب شیر افگن خطرے کو محسوس کرتے ہوئے اپنی جاگیر بردوان (بنگال) میں چلا گیا۔ لیکن جہانگیر نے بنگال کے حاکم قطب الدین جو اس کا رشتے کا بھائی تھا، کو یہ کام کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ قطب الدین نے شیر افگن کو اپنے پاس بلایا تو اس نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ اس پر قطب الدین خود کچھ فوج کے ساتھ بردوان گیا اور اس کے قلعے کے باہر جا کر ٹھہر گیا۔ شیر افگن نے اس غرض سے کہ غلط فہمی پیدا نہ ہو اپنے ساتھ صرف دو آدمی لئے اور قطب الدین سے ملنے کے لئے چلا گیا۔ وہاں ان میں کچھ تلخ کلامی ہوئی اور قبل اس کے کہ قطب الدین وار کرتا، شیر افگن نے اس پر حملہ کر دیا جس سے اسے مہلک زخم آیا اور وہ کچھ دیر بعد مر گیا۔ شیر افگن نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن قطب الدین کے آدمیوں نے اسے گھیر لیا اور اس کے ٹکڑے کر دئے۔ اس حادثے کی اطلاع جہانگیر کو کابل میں ملی۔ یہ ستمبر ۱۶۰۷ء کا ذکر ہے۔

جہانگیر نے آگرے واپس آکر بنگال کے نئے حاکم کو لکھا کہ شیر افگن کی بیوی اور لڑکی کو فوراً دربار میں بھیج دے۔ مہر النساء اپنی لڑکی کے ساتھ دربار میں پیش کی گئی۔ جہانگیر نے اس کی دلجوئی کے لئے بہت اشکشوئی کی اور بعد میں اسے شادی کا پیغام دیا۔

لیکن مہرالنساء نے اس پیشکش کو رد کر دیا اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس پر جہانگیر نے اسے مقرب خاص کی حیثیت سے اپنی سوتیلی ماں سلطانہ بیگم کے سپرد کر دیا۔ شاہی محل کے ایک گوشے میں رہنے کے لئے ایک معمولی کوارٹر اسے مل گیا اور گزر بسر کے لئے ایک برائے نام مشاہرہ بھی۔ اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے مہرالنساء نے کڑھائی کا کام شروع کر دیا۔ وہ کپڑوں پر بیل بوٹے بھی چھاپتی تھی۔ بلکہ کپڑے پر بیل بوٹے چھاپنے کا کام پہلی مرتبہ اسی نے شروع کیا اور یہ بہت جلد ایک مقبول فیشن بن گیا۔ ان کاموں سے اس کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا اور اس کے دن اطمینان سے گزرنے لگے۔ اس نے اپنی چھوٹی سی رہائش گاہ کو کمال ہنرمندی سے آراستہ کر رکھا تھا۔ محل کی تمام سربرآوردہ خواتین اس کی آرائش دیکھنے آتیں اور اس کے فن کی داد دیتیں اور پھر اس کی مدد سے اپنے حرم سرا بھی سجاتیں۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود مہرالنساء اپنا زیادہ وقت سلطانہ بیگم کے تقرب ہی میں گزارتی۔

جہانگیر نے مہرالنساء کے انکار کے بعد بھی کئی شادیاں کیں لیکن وہ اپنے دل سے مہرالنساء کو نہ نکال سکا۔ مارچ ۱۶۱۱ء میں اس نے ایک بار پھر اسے کسی تقریب میں دیکھا تو اس کو حاصل کرنے کی تڑپ ایک نئی شدت سے پیدا ہوئی۔ جہانگیر نے اسے پیغام بھیجا جو اس نے بصد رد و کد منظور کر لیا اور مئی ۱۶۱۱ء میں ان کی شادی ہو گئی۔ مہرالنساء کو پہلے ''نور محل'' اور پھر ''نور جہاں'' کا خطاب عطا کیا گیا۔ شادی کے وقت نور جہاں کی عمر چونتیس سال اور جہانگیر کی بیالیس برس تھی۔ نور جہاں اگرچہ طبعی لحاظ سے عمر کے اس حصے میں تھی جبکہ کہولت کا آغاز ہو رہا ہوتا ہے مگر اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔

شادی کے بعد نور جہاں کے حقیقی جوہر کھلے، اس نے آہستہ آہستہ کاروبار حکومت میں دخیل ہونا شروع کیا۔ اس نے بہترین انتظامی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ انتہائی اہم اور پیچیدہ معاملات میں اس کے مشوروں سے شاہی وقار میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے علاوہ اس کے اور جہانگیر کے درمیان ذوق کا اشتراک بھی تھا۔ بادشاہ خود بیان، خوش مزاج اور خوش لباس لوگوں کو پسند کرتا تھا۔ حاضر جواب اور بذلہ سنج آدمی اس

کی طبیعت سے میل کھاتے تھے۔ فنونِ لطیفہ مثلاً شاعری، موسیقی وغیرہ سے اسے بہت شفقت تھی۔ اور یہی تمام باتیں نور جہاں کی ایک شخصیت میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ فنِ مصوری کا دلدادہ ہونے کی وجہ سے بادشاہ، مصورِ کائنات کی اس مکمل تصویر کا دلدادہ و شیدا ہو گیا۔ اپنی ہمہ نوع خوبیوں کی وجہ سے نور جہاں بتدریج دربار پر چھا گئی اور جہانگیر پس منظر میں چلا گیا۔ جہانگیر اس کی ذات پر مکمل بھروسہ کرتا تھا۔ اور انتظامِ سلطنت کا سارا بوجھ نور جہاں کی ذات پر تھا اور اس نے اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی پورا کیا۔

نور جہاں نے برسرِ اقتدار آتے ہی اہم عہدے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دیئے۔ اپنے باپ اعتماد الدولہ کو وزیر اعظم بنایا۔ اپنے بھائی ابوالحسن جسے اب آصف خان کا خطاب مل چکا تھا کو بھی دربار میں ایک اہم وزارت دی۔ اس طرح دربار پر ملکہ نور جہاں کا گروہ چھا گیا۔ اس کو تاریخ میں ''نور جہانی جتھہ'' کہا گیا ہے۔ یہ گروہ ۱۶۲۲ء تک مختارِ کل رہا۔ اس سال نور جہاں کے باپ مرزا غیاث کی وفات ہو جانے کی وجہ سے دربار پر اس گروہ کی گرفت کمزور ہو گئی۔ دوسرے اس گروہ میں اندرونی طور پر بھی اختلاف پیدا ہو گئے تھے۔

نور جہاں نے جہانگیر کی عادات واطوار کا بھی محاسبہ کیا۔ اس کی کثرتِ شراب خواری کو آہستہ آہستہ اعتدال پر لائی۔ دن میں شراب پینے سے ٹوکا اور بالآخر جہانگیر نے دن میں شراب پینا بالکل ہی چھوڑ دی اور رات کو بھی پہلے کی نسبت بہت کم کر دی۔ غرض ملکہ دربار میں ہر طرح سے ایک امتیازی حیثیت کی مالک بن گئی اور جہانگیر برائے نام مقتدرِ اعلیٰ رہ گیا۔ یہاں تک کہ سکوں اور شاہی مہر پر بھی جہانگیر کے نام کے ساتھ ساتھ نور جہاں کا نام نقش کیا جانے لگا۔ صرف خطبہ میں اکیلے جہانگیر کا نام آتا تھا۔

نور جہاں نے ۱۶۲۲ء تک ایک طرح کی خود مختار حیثیت سے حکمرانی کی۔ بادشاہ نے اپنے آپ کو امورِ مملکت سے تقریباً علیحدہ کر رکھا تھا۔ بادشاہ ملکہ سے کسی وقت بھی علیحدہ ہونا برداشت نہ کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ جب جہانگیر دربار میں بیٹھتا تو تخت کے عقب میں ایک خاص پردہ بنایا جاتا اور اس میں نور جہاں بیٹھتی تاکہ کسی بھی مشکل مسئلے

میں بادشاہ کی دستگیری کر سکے۔ بادشاہ خود کہا کرتا تھا کہ میں نے شراب کے دو جام اور کباب کی ایک قاب کے بدلے میں اپنی سلطنت نور جہاں کو دے دی ہے۔ اور نور جہاں نے بھی اپنے کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کیا جس کا تمام مشرقی اور مغربی مورخین نے شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

حکومت کے اس محنت طلب اور اعصاب شکن کام کے باوجود نور جہاں نے اپنے نسوانی فرائض کو بھی بخوبی انجام دیا اور اس نے اپنے طبعِ ذہن سے کپڑوں کے استعمال میں کئی جدتیں کیں۔ کپڑوں پر پھول کاڑھنا اور چھاپنا بھی اسی کی طبع رسا کا شاہکار ہے۔ گھروں کی آرائش نے بھی اس کی مخترع طبیعت کی وجہ سے ایک باقاعدہ فن کی شکل اختیار کی۔ گلاب کا عطر نور جہاں ہی نے ایجاد کیا۔ پان پر چونے کا استعمال بھی اسی کی اختراعات میں سے ہے۔

• جہانگیر کے عہد میں کئی فتوحات ہوئیں۔ میواڑ اکبر کے عہد سے لے کر اب تک کئی کوششوں کے باوجود فتح نہ ہو سکا تھا۔ ۱۶۱۴ء میں یہ مہم شہزادہ خرم کے سپرد کی گئی جو کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ۱۶۲۰ء میں کانگڑہ بھی شہزادہ خرم ہی کی قیادت میں فتح ہوا۔ اِس سے پہلے کئی مہمیں ناکام ہو چکی تھیں۔ جہانگیر اس فتح سے بہت خوش ہوا۔ اور خود قلعۂ کانگڑہ کے معائنہ کو گیا اور وہاں ایک مسجد بنانے کا حکم دیا۔ اکبر کے عہد میں کشمیر کی فتح کا کام اگرچہ مکمل ہو چکا تھا مگر کشتواڑہ ابھی باقی تھا۔ جہانگیر کے جرنیل دلاور خان نے ۱۶۲۲ء یہ علاقہ بھی فتح کر لیا۔ جہانگیر نے بھی اکبر کی طرح مسلسل جنگی کاروائیوں کی حکمتِ عملی اختیار کی۔ اس سلسلے میں اس نے دکن پر سب سے زیادہ توجہ دی اور شہزادہ خرم نے وہاں کئی اہم ریاستیں مسخر کیں۔ جبکہ اس سے پہلے مغلیہ دربار کے کئی اہم امراء اہلِ دکن کی چھاپہ مار (گوریلا) سرگرمیوں سے بے بس ہو کر پسپا ہوتے رہے تھے۔ لیکن شہزادہ خرم نے بڑی دانشمندی سے ان کو زیر کیا۔ جہانگیر اس کی اس کارکردگی سے بہت خوش ہوا۔ اسے تیس ہزار منصب اور ''شاہجہان'' کا خطاب عطا کیا۔ دربار میں اپنے تخت کے برابر میں ایک نشست اس کے لئے بھی رکھی گئی۔ شاہی روایات میں ایک بالکل نئی بات تھی کہ

بادشاہ کے تخت کے ساتھ برابر میں کسی اور کو بھی بٹھایا گیا۔ یہ عظیم اعزاز سب سے پہلے شاہجہان کے حصے میں آیا جس سے اس کے وقار میں بہت اضافہ ہوا۔

جہانگیر کی اولاد میں شاہجہان جوہر قابل کی حیثیت رکھتا تھا۔ خسرو کے مغضوب ہو جانے کی وجہ سے تمام لوگ اسے ہی تاج مغلیہ کا آئندہ وارث سمجھتے تھے۔ ابتدائی دور میں نور جہان بھی اس معاملے میں خرم کی طرفدار تھی۔ دوسرے خرم کی شادی نور جہاں کے بھائی آصف خان کی بیٹی ممتاز محل سے ہوئی تھی۔ اس وجہ سے بھی شاہجہان کو سارے ''نور جہانی جتھے'' کی حمایت حاصل تھی مگر بعد میں جب نور جہان نے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کی شادی جہانگیر کے سب سے چھوٹے بیٹے شہریار سے کی، تو اب اس کے لئے خرم کے بجائے شہریار اہمیت رکھتا تھا۔ لہذا اسے جانشین بنانے کے لئے زمین ہموار کرنا شروع کی۔ یہ بات شاہجہان اور آصف خان کے مفادات کے خلاف تھی۔ پہلے تو انہوں نے برداشت کی، لیکن جب معاملہ حد سے گزرا تو ۱۶۲۳ء میں شاہجہان نے کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ اس سے قبل نور جہاں کا والد اعتماد الدولہ مرزا غیاث فوت ہو چکا تھا۔ جس سے نور جہاں کے اقتدار کو پہلے جیسا استحکام حاصل نہ رہا تھا۔ اس سے پہلے ۱۶۲۲ء میں جب قندھار میں ایرانیوں نے مداخلت کی تو اس کے سدِ باب کے لئے دربار کی طرف سے شاہجہان کو وہاں جانے کا حکم ملا۔ جس کے جواب میں اس نے چند شرطیں پیش کیں۔ اور کہا کہ ان کے پورا ہوئے بغیر وہاں نہیں جا سکتا۔ ان شرائط میں ایک یہ بھی تھی کہ مجھے پنجاب کا گورنر مقرر کیا جائے۔ لیکن نور جہاں نے جہانگیر کے سامنے شاہجہان کا مسئلہ کچھ اس طرح پیش کیا کہ اس نے یہ شرائط قطعی طور پر مسترد کر دیں۔ اور اسے تنبیہ کی کہ فوراً شاہی حکم بجا لائے لیکن اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ ان دنوں شہزادہ دکن میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے دور دراز علاقے میں اس لئے بھیجا جا رہا تھا کہ اگر اس دوران جہانگیر فوت ہو جائے تو آسانی سے شہریار کو بادشاہ بنایا جا سکے۔

شہزادے کی اس حرکت پر دربار سے ایک فوج اس کے مخالف مہابت خان کی قیادت میں اس کی سرکوبی کے لئے بھیجی گئی۔ اسی دوران نور جہاں نے اپنے بھائی آصف

خان کو خزانہ لانے کے لئے آگرہ بھیج دیا۔ تاکہ وہ دربار میں رہ کر اپنے داماد کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ مارچ ۱۶۲۳ء کو بلوچ پور کے مقام پر مہابت خان اور شاہجہان کی مڈبھیڑ ہوئی جس میں شاہجہان نے شکست کھائی اور مانڈو کی جانب پسپا ہو گیا۔ نورجہاں نے مہابت خان کی کمک کے لئے شہزادہ پرویز کو بھی بھیج دیا۔ مہابت خان نے تعاقب کیا تو شاہجہان کو مانڈو سے اسیر گڑھ کی طرف بھاگنا پڑا۔ لیکن مہابت خان نے اسے کہیں بھی پاؤں جمانے کا موقع نہ دیا۔ اور شہزادہ برہانپور پہنچا۔ یہاں سے اس نے عبدالرحیم خان خاناں کو صلح کی بات چیت کے لئے بھیجا تو وہ بھی شاہی فوج کے ساتھ مل گیا۔ اب شہزادہ گولکنڈہ، تلنگانہ اور مولی سے ہوتا اڑیسہ گیا اور وہاں کے گورنر کو شکست دے کر بنگال اور اڑیسہ پر اقتدار حاصل کر لیا۔ اب اس نے مرکز اور اس کے قریب کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا تاکہ باپ سے من مانی شرائط منوا سکے۔ اس مقصد کے لئے اس نے پیش قدمی کی تو اچانک مہابت خان اور شہزادہ پرویز اس کے سر پر آن پہنچے۔ اگر وہ کچھ دن اور نہ پہنچتے تو شاہجہان اودھ اور الہ آباد وغیرہ فتح کر چکا ہوتا۔ ان کے آجانے کی وجہ سے شہزادہ ایک بار پھر محاصرہ اٹھا کر فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اور رہتاس گڑھ میں اپنی بیمار بیوی ممتاز محل کو چھوڑ کر دکن کی طرف چلا گیا۔ یہاں اس نے مغلیہ سلطنت کے ایک شدید مخالف ملک عنبر کی اعانت سے برہان پور کا محاصرہ کر لیا لیکن مہابت خان کے پہنچ جانے کی وجہ سے وہ اس کو فتح نہ کر سکا۔ یہاں بھی ناکامی کے بعد اس نے روہان گڑھ میں پناہ لی اور وہاں وہ سخت بیمار پڑ گیا اور اس کے اکثر ساتھی بھی حالات کے مسلسل ناموافق ہونے کی وجہ سے اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اور اب شاہجہان میں مقابلے کی تاب نہ رہی۔ دوسرے وہ خود بھی تین سال کی متواتر سرگردانی سے تنگ آچکا تھا۔ لہذا یہاں سے اس نے مہابت خان کو صلح کا پیغام بھیجا اور اپنی اس حرکت پر جہانگیر سے معافی کی درخواست کی۔ اس موقعے پر نورجہان نے بھی، جواب پرویز اور مہابت خان کے گٹھ جوڑ کو اپنے منصوبوں کی راہ میں رکاوٹ سمجھنے لگی تھی۔ خرم کی درخواست کو قبول کرنے کی سفارش کی جس پر جہانگیر نے اسے معاف کر دیا۔ اور اس کے بیٹوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو بطور یرغمال دربار میں منگوا

لیا۔شاہجہان نے بیش قیمت تحائف اور نذرانوں کے ساتھ دونوں لڑکے باپ کی خدمت میں بھیج دیئے۔اس طرح تین سال بعد شاہجہان کی بغاوت ختم ہوگئی جس کی وجہ سے مغل دربار کی کافی مالی اور افرادی قوت ضائع ہوئی۔

جونہی شاہجہان کی بغاوت ختم ہوئی مہابت خان نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ کیونکہ اب مہابت خان نے شہزادہ پرویز کی ولی عہدی کے لئے کھلم کھلا کوششیں شروع کر دی تھیں۔جس کے سبب نور جہاں کو اپنے داماد شہریار کا مستقبل ایک بار پھر تاریک نظر آنے لگا۔دوسرے آصف خان نے بھی مہابت خان کی بڑھتی ہوئی قوت کو اپنے لئے خطرہ سمجھا کیونکہ اس سے اس کے داماد شاہجہان کا مستقبل مخدوش ہوتا تھا۔اس لئے نور جہاں اور آصف خان نے اس کا زور توڑنے کے کئے اسے بنگال کا گورنر مقرر کر کے فوراً وہاں پہنچنے کا حکم دیا۔لیکن شہزادے پرویز نے مہابت خان کو اپنے حضور سے علیحدہ کرنے سے انکار کر دیا۔لیکن بعد میں پرویز نے اپنے لئے ایک نیا مشیر قبول کر لیا اور مہابت خان بادلِ ناخواستہ بنگال چلا گیا لیکن موقع کی تلاش میں رہا۔

مارچ ۱۶۲۶ء میں جب جہانگیر کشمیر جا رہا تھا تو مہابت خان چار ہزار مہم جو راجپوت لے کر آ گیا۔اس وقت بادشاہ دریائے جہلم کے کنارے پڑاؤ ڈالے تھا۔ مہابت خان کی آمد سے شاہی کیمپ میں ہنگامی صورت حال پیدا ہوگئی۔مہابت خان نے حاضر ہونے کی اجازت چاہی لیکن بادشاہ نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔یہاں پر برسر دربار مہابت خان کے داماد کی تذلیل کی گئی جس سے وہ اور بھی زیادہ برانگیختہ ہوا۔ دوسرے دن جب شاہی لشکر نے دریا عبور کرنا شروع کیا تو مہابت خان کو اپنا منصوبہ کامیاب ہوتا نظر آیا۔اور وہ چوکس ہو گیا۔جب اس نے دیکھا کہ سارا لشکر دریا کے پار چلا گیا ہے اور بادشاہ،، ملکہ اور چند خاص خدمت گار ہی ادھر رہ گئے ہیں تو اس نے اچانک آ کر بادشاہ اور ملکہ کو گرفتار کر لیا۔ملکہ نور جہاں بھاگ کر اپنے لشکر میں پہنچی اور بادشاہ کی رہائی کے مسئلے پر تمام امراء کی رائے طلب کی۔کچھ نے فوراً حملہ کرنے کا خیال ظاہر کیا مگر یہ تجویز اس لحاظ سے ناقابلِ عمل تھی کہ حملہ ہوتے ہی مہابت خان بادشاہ کو قتل کر دے گا۔

بالآخر فیصلہ یہی ہوا کہ تدبر اور تحمل سے کام لیا جائے۔ اس کے بعد ملکہ بھی خود کو مہابت خان کے حوالے کر کے بادشاہ کے پاس جا پہنچی۔

اب مہابت خان ہی تمام اختیارات کا مالک تھا۔ وہ جو حکم چاہتا بادشاہ سے صادر کروا لیتا اور جہاں چاہتا لئے لئے پھرتا۔ مگر اس نے بادشاہ کے احترام میں فرق نہ آنے دیا اور ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ شایانِ شان سلوک کیا۔ اس نے نور جہاں کا اقتدار ختم کرنے کے لے اہم عہدوں پر اپنے خاص آدمی مقرر کئے۔ دو ماہ تو مہابت خان بادشاہ کے ساتھ پنجاب میں رہا اور بعد میں کابل چلا گیا۔ اسی دوران میں نور جہاں نے بھی بادشاہ کو آزاد کرانے کے لئے اپنے منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس نے خدمتگاروں کے بھیس میں شاہی فوج کے خاص آدمیوں کو بھرتی کر لیا۔ اور بتدریج اس تعداد میں اضافہ کرتی گئی۔ اس نے انتہائی تدبر سے مہابت خان کی فوج کے بعض امراء کو ایک دوسرے کا مخالف بنا دیا۔ اس سے مہابت خان کی قوت کمزور ہو گئی۔

کابل میں نور جہاں نے مہابت خان کو مشورہ دیا کہ وہاں کے امراء اتنی فوج نہیں رکھتے جتنی کا انہیں مرکز نے حکم دے رکھا ہے۔ اس لئے ان کا معائنہ کرنا چاہیے۔ مہابت خان اس کے لئے تیار ہو گیا۔ ادھر نور جہان نے تمام امرائے کابل سے کہہ دیا کہ جب بادشاہ معائنے کے لئے آئے تو موقعہ مناسب سمجھ کر بادشاہ کو محاصرے میں لے لیا جائے۔ اور اسے راجپوتوں سے نجات دلائی جائے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ جب کابل کی فوجیں معائنے کی غرض سے بادشاہ کے سامنے آئیں تو انہوں نے اچانک بڑھ کر بادشاہ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اب مہابت خان کو اپنی سیاسی غلطی کا احساس ہوا۔

جب اس نے دیکھا کہ بادشاہ ہاتھوں سے نکل چکا ہے تو اس نے کابل سے بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی۔ اس طرح تقریباً ایک سال بعد جہانگیر کو مہابت خان کی حراست سے، نور جہان کی فراست کے سبب رہائی ملی۔ رہائی کے بعد بادشاہ نے مہابت خان کو حکم بھیجا کہ وہ آصف خان اور شاہی کنبے کے دوسرے افراد کو جنہیں اس نے قید کر رکھا ہے فوراً رہا کر دے تو اس کے قصور کو معاف کر دیا جائے گا۔ چنانچہ مہابت خان نے

انہیں رہا کر دیا اور بڑے احترام کے ساتھ رخصت کیا۔ جن دنوں جہانگیر مہابت خان کی قید میں تھا اسے شہزادہ پرویز کی موت کی اطلاع ملی۔ شہزادے کی موت شراب کے بہت زیادہ استعمال کی وجہ سے ہوئی تھی۔

جہانگیر خود بھی دمہ کا پرانا مریض تھا۔ وہ اپنی عمر کے آخری سالوں میں موسم سرما لاہور میں اور موسم گرما کشمیر میں گزارا کرتا تھا۔ ۱۶۲۷ء میں بھی وہ مہابت خان سے رہائی کے بعد کشمیر گیا تاکہ صحت کچھ سنبھل جائے۔ مگر پے در پے صدمات کے باعث اس کی صحت روز بروز گرتی گئی۔ جب گرمیاں ختم ہوئیں تو اس نے میدانی علاقے میں جانے کا فیصلہ کیا تاکہ کشمیر کی سردی سے دمہ شدت نہ اختیار کر جائے۔ چنانچہ جب وہ کشمیر سے واپس آ رہا تھا تو بھمبر کے مقام پر اسے دمے کا شدید دورا پڑا۔ اور وہ ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو فوت ہو گیا۔ وہاں سے اس کی لاش ہاتھی پر رکھ کر لاہور لائی گئی اور لاہور کے قریب شاہدرہ کے مقام پر نور جہاں کے باغ 'دل کشا' میں دفن کر دی گئی۔

جہانگیر ایک باوقار شخصیت اور دل کش خدوخال کا مالک اور دراز قد تھا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ اس میں انتظامی صلاحیتیں بھی تھیں۔ اس کا مزاج مجموعہ اضداد تھا۔ کبھی تو وہ انتہائی رحمدل، انصاف پرور اور عدل گستر بادشاہ ہوتا تھا۔ اور کبھی ایک ظالم، جابر اور سفاک آمرِ مطلق۔ شراب کا آخری حد تک عادی تھا۔ بعد میں جب محض شراب سے طبیعت کی تسکین نہ ہوتی تو اس میں افیون ملا کر پیتا۔ ورزش اور سیر و شکار کا بھی دلدادہ تھا مگر آخری عمر میں بالکل کاہل ہو گیا۔ جہانگیر کو فنونِ لطیفہ سے بڑی دلبستگی تھی۔ وہ ایک اچھا سخن فہم اور اعلیٰ درجے کا انشاء پرداز تھا۔ اس کی ''تزک'' اس بات کا ثبوت ہے۔ جہانگیر کو فنِ تعمیر سے شغف تھا۔ اس نے کئی خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔ جہانگیر کو سب سے زیادہ فنِ مصوری کا شوق تھا۔ اس فن میں اسے کمال درجے کی مہارت حاصل تھی۔ تصویر کے تمام جزئیات کو پہلی نظر میں سمجھ جاتا تھا۔ کسی تصویر میں اگر کوئی نقص ہوتا تو سب سے پہلے اس کی نشان دہی جہانگیر ہی کرتا۔ تصویر دیکھ کر مصوّر کا نام بتا دیا کرتا تھا۔ غرض اس فن میں اسے مہارت کلی حاصل تھی۔

جہانگیر کے عہد کا سب سے اہم واقعہ شاہی دربار میں انگریز سفراء کی آمد ہے۔ یورپی اقوام کافی عرصے سے برصغیر میں تجارت کر رہی تھیں۔ لیکن انہوں نے کبھی یہاں کی سیاست میں حصہ نہ لیا۔ مغل حکومت کی جانب سے پرتگیزوں کی زیادہ سرپرستی کی جاتی تھی۔ اکبر نے ان کو رعایتیں بھی دیں۔ مگر جہانگیر نے عہد میں پرتگیزوں نے مسلمانوں کے بعض جہازوں پر حملہ کیا جس سے جہانگیر ان سے ناراض ہو گیا اور ان کے مقابلے میں انگریزوں کو اہمیت دینے لگا۔ انگریزوں کے لئے تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لئے انگلستان کے بادشاہ جیمز اوّل نے کیپٹن ولیم ہاکنز کو ۱۶۰۸ء میں سفارت پر برصغیر بھیجا۔ وہ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا اور بہت سے اعلیٰ پائے کے تحائف پیش کئے مگر وہ اپنے ملک کے لئے کوئی تجارتی سہولت حاصل نہ کر سکا۔ وہ تقریباً پانچ سال دربار میں رہا مگر کافی حد تک ناکام ہی گیا۔ اس کے بعد شاہ انگلستان نے پارلیمنٹ کے رکن اور ممتاز سیاست دان سر ٹامس رو کو اسی مقصد کے لئے بھیجا۔ ٹامس رو ۱۶۱۵ء میں برصغیر میں وارد ہوا۔ جب جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا تو جہانگیر نے گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ تین سال جہانگیر کے دربار میں سفیر کی حیثیت سے رہا اور بالآخر انگریزوں کے لئے تجارتی مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا جو سر ٹامس رو نے انجام دیا۔ اس سے اس کے ہم وطنوں کو ہندوستان کی تجارت میں وسیع عمل دخل کا موقع مل گیا۔ اور آہستہ آہستہ وہ مضبوط طاقت بنتے گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے آہستہ آہستہ مغل حکومت کو ختم کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ سر ٹامس رو کو برصغیر میں انگریزی استعمار کے نفوذ میں مرکزی کردار کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے اپنے مثالی تدبر سے کام لے کر انگریزوں کے لئے مستقبل کو تابناک کر دیا۔ جہانگیر کا یہ فیصلہ دور رس نتائج کا حامل ہے۔ اس کا یہ نادانستہ اقدام برصغیر کی مسلم حکومت کے لئے خطرناک ثابت ہوا۔ برصغیر میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں یہ واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

شہاب الدّین شاہجہان

(۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء)

شاہجہان کی زندگی کے ابتدائی حالات کسی قدر پہلے آچکے ہیں۔ یہاں بھی اس کی تخت نشینی سے پہلے کے کچھ واقعات کی مزید تفصیل پیش کی جاتی ہے:

یہ شہزادہ لاہور میں راجا اودھے پور کی بیٹی جگت گوسائیں کے بطن سے ۱۵۹۱ء میں پیدا ہوا۔ اکبر نے خرم نام رکھا۔ اور اسے اپنی پہلی ملکہ خدیجہ زمانی بیگم کی گود میں یہ کہہ کر دے دیا کہ "تمہاری گودی ابھی تک خالی ہے اسے فرزند سمجھ کر پالو"۔ چنانچہ شہزادہ خرم کا بچپن اکبر کی براہِ راست نگرانی میں پروان چڑھا۔ اکبر نے اس کی تعلیم و تربیت کے لئے اعلیٰ انتظامات کئے۔ جب چار سال چار ماہ اور چار دن کا ہوا تو ابوالفضل کی سرپرستی میں تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ بعد میں عبدالرحیم خان خاناں بھی اس کا اتالیق بنا۔

شہزادہ خرم اپنے دادا، دادی سے بہت مانوس تھا۔ اس لئے دادا کے جیتے جی اس سے الگ نہ ہوا۔ جن دنوں میں جہانگیر کی بغاوت کا جھگڑا چل رہا تھا تو جہانگیر نے خرم کو پیغام بھیجا کہ، دربار میں تمہاری زندگی محفوظ نہیں ہے۔ میرے پاس چلے آؤ۔ مگر خرم نے جواب دیا کہ، جب تک دادا زندہ ہیں، اُنہی کی خدمت میں رہوں گا۔ خواہ میری جان پر ہی کیوں نہ بن جائے۔ چنانچہ یہ شہزادہ آخری دم تک اکبر کے ساتھ رہا۔ اس دوران میں خرم نے اپنے باپ جہانگیر کے لئے بھی بہت مفید کام کیا۔ جب جہانگیر کے مخالف یعنی راجہ مان سنگھ وغیرہ اکبر کو جہانگیر کے خلاف بھڑکاتے۔ تو ان کے جانے کے بعد خرم باپ کی وکالت کرتا تاکہ اکبر جہانگیر کے خلاف کوئی سخت قدم نہ اٹھا بیٹھے۔ اس طرح خرم دادا کا منظورِ نظر ہونے کی وجہ سے ان اثرات کو زائل کر لیتا جو مخالفین چھوڑ کر جاتے تھے۔ یوں خرم نے باپ بیٹے کے درمیان نفرت کی دیوار حائل نہ ہونے دی۔

شہزادہ خرم کی یہ امتیازی حیثیت ہے کہ وہ دادا اور باپ دونوں کی محبت وشفقت کا مرکز تھا۔ اس نے اپنے تدبر سے دادا کے دل میں اپنے لئے منفرد مقام پیدا کیا اور اپنی انتظامی لیاقت اور شجاعت سے باپ کو بھی گرویدہ بنالیا۔ جہانگیر کے عہد میں خرم کئی اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہا۔ اور اس نے ہر مرحلے پر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ پہلی بار جب تخت نشینی کے فوراً بعد جہانگیر، شہزادہ خرم کی بغاوت فرو کرنے پنجاب کی طرف آیا تو اس نے شہزادہ خرم ہی کو دارالحکومت میں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ ۱۶۰۷ء میں اسے نقارہ اور علم کے ساتھ آٹھ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب عطا ہوا۔ ۱۶۰۸ء میں اسے حصار فیروزہ کی جاگیر ملی جو اب تک ولی عہدی کی علامت بن چکی تھی۔ اس کے علاوہ کئی اہم فوجی مہمات بھی خرم کے سپرد ہوئیں جو اس نے کامیابی سے انجام دیں۔ ان میں سب سے اہم دکن کی لڑائیاں تھیں۔ جن میں اس نے بڑی بہادری اور فوجی سوجھ بوجھ سے فتح حاصل کی اور اکبر کے شروع کئے ہوئے کام کو تکمیل تک پہنچایا۔ دکن کی تسخیر سے جہانگیر کی نظر میں خرم کی قدر بہت بڑھ گئی۔ اور اس نے اس کے منصب میں بھی اضافہ کیا اور 'شاہجہان' کے خطاب سے بھی نوازا۔

شادیاں

شاہجہان کی تین شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی مظفر حسین صفوی کی بیٹی سے ۱۶۱۰ء میں ہوئی۔ دوسری نور جہاں کے بھائی آصف خان کی بیٹی ارجمند بیگم سے ۱۶۱۲ء میں ہوئی اور تیسری شاہنواز خان بن عبدالرحیم خان خانان کی بیٹی سے۔ لیکن جو تعلق خاطر شاہجہان کو ارجمند بانو سے تھا وہ کسی دوسری سے نہ تھا۔ اس نے ارجمند بانو کو ممتاز محل کا خطاب دیا جس طرح نور جہاں سے شادی کے بعد جہانگیر کی دوسری بیویاں پس منظر میں چلی گئیں تھیں۔ اسی طرح شاہجہاں کی دوسری بیویوں کا چراغ بھی ممتاز محل کے سامنے نہ جل سکا اور شاہجہان کی ملکہ کی حیثیت سے صرف ممتاز محل کے نام ہی کو بقائے دوام حاصل ہوئی۔ اگرچہ ممتاز محل بہت جلد (۱۶۳۱ء) میں ہی فوت ہوگئی لیکن شاہجہان نے اس کے ساتھ اپنی

دلبستگی کا جو نشان دنیا میں چھوڑا ہے اس کی آب و تاب اربابِ وفا کے لئے ہمیشہ اک گونہ تسکین کا سامان مہیا کرے گی۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شاہجہان نے اپنی 'وفا' کو تاج محل کی صورت میں مجسم کر کے مشرقی اقدار کی عظمت کو لازوال معنویت عطا کی ہے۔

شاہجہان کی تمام اولاد ممتاز محل ہی سے تھی۔ کل چودہ بچے ہوئے۔ جن میں سے چار شہزادے داراشکوہ، شجاع، اورنگ زیب اور مراد اور تین شہزادیاں جہاں آرا بیگم، روشن آرا بیگم اور گوہر آرا بیگم زندہ رہے اور باقی فوت ہو گئے۔ ممتاز محل نے ایک مثالی بیوی ہونے کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ اس نے خیراتی اور رفاہی کاموں میں بھرپور کردار ادا کیا۔ لیکن شاید اپنی پھوپھی نور جہاں کے حسرت ناک انجام کو پیش نظر رکھتے ہوئے سیاست میں قطعاً دخل نہ دیا۔ اس کی اس صفت سے شاہجہان خاص طور پر متاثر تھا۔

ممتاز محل سے شادی ہونے کی وجہ سے شاہجہان کو دربار میں نور جہاں اور اس کے گروہ کی حمایت حاصل ہو گئی جس سے رعایا میں یہ تاثر عام ہو گیا کہ جہانگیر کے بعد تخت کا وارث یہی شہزادہ ہوگا۔ نور جہاں ذاتی طور پر بھی شاہجہان کے استحقاق کی معترف تھی لیکن بعد میں جب نور جہاں نے اپنی بیٹی کی شادی جہانگیر کے سب سے چھوٹے لڑکے شہریار سے کی تو اس نے یکایک شاہجہان کی سرپرستی ترک کر دی اور شہریار کو جہانگیر کا جانشین بنانے کیلئے راہ ہموار کرنا شروع کر دی۔ یہ بات شاہجہان کے لئے قابلِ درگزر نہ تھی۔ پہلے تو اس نے پرامن طریقوں سے کوشش کی مگر بعد ازاں ۱۶۲۳ء میں بادشاہ کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر دی (جس کا تفصیلی ذکر پہلے ہو چکا ہے)۔ اگرچہ ۱۶۲۶ء میں شاہجہان نے باپ سے معافی مانگ کر باغیانہ روش ترک کر دی لیکن جانشینی کا کوئی تصفیہ ہوئے بغیر جہانگیر اچانک ۱۶۲۷ء میں فوت ہو گیا تو یہ مسئلہ پھر اسی ہولناکی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت نور جہاں اور اس کا گروہ شہزادہ شہریار کی حمایت کر رہے تھے۔ جب کہ آصف خان اور مرزا عظیم وغیرہ شاہجہان کے حق میں تھے۔

جہانگیر کی میت جب لاہور لائی گئی تو نور جہاں نے اپنے بھائی آصف خان اور شاہجہان کے دوسرے طرفداروں کو تدفین کے وقت گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ

شہریار کی راہ سے سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو جائے لیکن آصف خان تدفین میں شریک ہی نہ ہوا۔ اس طرح نور جہاں کا ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ تدفین کے فوراً بعد نور جہاں نے شہریار کو لاہور میں ''شاہ شاہان'' کے لقب سے تخت نشین کر دیا۔ قلعہ لاہور میں اس سلسلے میں باقاعدہ تقریب منعقد ہوئی جس میں لاہور میں موجود تمام سرکردہ امراء نے شہریار کو نذرانے پیش کئے۔ شہریار نے لاہور میں موجودہ تمام خزانوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ مسجد میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ شہریار نے ان تمام لوگوں کی نقل و حرکت پر پابندی لگا دی جن کے بارے شبہ تھا کہ وہ اس کے اقتدار کے خلاف سازشیں کر سکتے ہیں۔ عامی قسم کے لوگوں کو اعلیٰ مناصب سے سرفراز کیا۔ خزانوں کے منہ کھول دیئے اور غیر مستحق لوگوں میں خوب دولت لٹائی۔ اس دولت کا تخمینہ ستر لاکھ روپیہ ہے۔ بعد میں جب شہریار کو شکست ہوگئی تو آصف خان نے پینتالیس لاکھ کی رقم واپس حاصل کر لی۔

آصف خان کا تاریخی کردار

ادھر آصف خان نے شاہجہان، جو اس وقت دکن میں تھا، کی طرف تیز رفتار قاصد دوڑائے اور اسے فوراً مرکز پر قبضہ کرنے کی ہدایت کی۔ یہاں اس نے اقتدار اعلیٰ کے خلا کو پورا کرنے کے لئے خسرو کے بیٹے اور داور بخش کو ''شیر شاہ'' کے لقب سے تخت پر بٹھا کر ۱۲ نومبر ۱۶۲۷ء کو بھمبر میں اس کے نام کا خطبہ پڑھوا دیا۔ داور بخش کو چونکہ اپنا انجام معلوم تھا اس لئے اس نے بہتیرا انکار کیا مگر زبردستی تاج شاہی اس کے سر پر رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد آصف خان نے لاہور پر قبضہ کرنے کیلئے پیش قدمی کی۔ اس کے ساتھ بہت کم لشکر تھا۔ اس سلسلے میں کئی روایتیں ہیں۔ یہ لشکر کم از کم ایک ہزار اور زیادہ سے زیادہ دس ہزار پر مشتمل تھا۔ کیونکہ کشمیر کے سفر کی تھکان دور کرنے کے لئے اکثر لشکری اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ لاہور پہنچ کر آصف خان نے فوج کی صف بندی کی۔ درمیان میں ایک بڑے ہاتھی پر داور بخش کو سوار کیا۔ دوسرے ہاتھی پر ہوشنگ اور طہمورشاہ کو اور تیسرے پر شاہ جہان کے بیٹوں دارا شکوہ، شجاع اور اورنگ زیب کو۔ جب یہ لشکر شہر کے

قریب پہنچا تو شہریار کے لشکر نے اس کا راستہ روکا۔ شہریار کے پاس لشکر اور ساز و سامان کافی تھا۔ جہانگیر اپنی فوج کا ایک معتد بہ حصہ کشمیر جاتے ہوئے لاہور میں چھوڑ گیا تھا۔ جس کے ساتھ بڑی تعداد میں ہاتھی اور بھاری توپ خانہ تھا۔ شہریار نے دانیال کے بیٹے بایسنغر خان کو فوج کا سالار مقرر کیا لیکن عین وقت پر اس نے یہ بے وقوفی کی کہ لشکر کو چھوڑ کر خود قلعے کے اندر چلا گیا جس سے فوج کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس موقعہ پر اس کے ساتھی افضل خان نے اسے ایسا کرنے سے منع بھی کیا۔ لیکن شہریار نے اس کی نصیحت پر کان نہ دھرے۔ چنانچہ جب دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا تو شہریار کی فوج بغیر مقابلے کے راہ فرار اختیار کر گئی اور جب اپنی فوج کی ہزیمت کی اطلاع شہریار کو ملی تو وہ زنانخانے کے ایک کمرے میں چھپ گیا۔ آصف خان فتح یاب ہوا اس نے شائستہ خان، اس کے بیٹے اور ارادت خان کو قلعہ لاہور پر قبضہ کے لئے بھیجا۔ جنہوں نے کامیابی سے قلعہ میں داخل ہو کر تمام اثاثوں پر قبضہ کر لیا۔ شہریار کو زنانخانے کے ایک کمرے سے گرفتار کر کے اس کی آنکھیں نکال دی گئیں اور اسے اس کی بیوی کے ساتھ ایک دوسرے محل میں قید کر دیا گیا۔ جہاں وہ کچھ عرصے بعد شاہجہان کے حکم سے قتل ہوا۔ نور جہاں کو قلعے ہی میں محبوس کر دیا گیا۔ اس نے بقیہ زندگی سیاسیات سے مکمل طور پر علیحدہ رہ کر سماجی بہبود کے مشاغل میں بسر کی۔ شاہجہان نے اس کے لئے ایک معقول وظیفہ مقرر کر دیا تھا جس میں سے بیشتر حصہ رفاہی کاموں اور غریب لوگوں کی امداد کے لئے صرف ہوتا تھا۔ ہزاروں نادار لڑکیوں کی شادی نور جہان نے اپنے خرچ پر کی۔ تقریباً اٹھارہ سال گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے کے بعد نور جہاں نے ۱۶۴۵ء میں لاہور میں وفات پائی اور اپنے ہی تعمیر کردہ مقبرہ میں دفن ہوئی جو اس نے باغِ دلکشا میں جہانگیر کے مقبرہ سے کچھ فاصلے پر بنوایا تھا۔ اس نے عزلت گزینی کا یہ طویل عرصہ اپنی بیوہ بیٹی لاڈلی بیگم کے ساتھ ہی بسر کیا۔ نور جہاں کے مقبرے کو سکھوں کے عہد میں بہت نقصان پہنچا۔ آجکل پھر اس کی مرمت ہوئی ہے۔

بنارسی، جسے آصف خان نے شاہجہان کے پاس بھیجا تھا۔ انتہائی رفتار سے بیس دِن میں جنیسر پہنچا۔ شہزادہ ان دنوں وہیں تھا۔ بنارسی نے حاضر ہو کر جہانگیر کی وفات کی

اطلاع دی اور آصف خان کا زبانی پیغام کہ شہزادے کو فوراً دارالحکومت میں پہنچنا چاہئے۔ بناری نے اپنے قابل اعتبار ہونے کے ثبوت میں آصف خان کی خاص مہر بھی پیش کی۔

شاہجہان کو باپ کی موت کا سن کر بہت صدمہ ہوا اور اس نے وہیں سوگ کے مراسم پورے کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن آصف خان کے پیغام اور ہمراہیوں کے مشورے سے ایسا کرنے سے باز رہا اور فوراً آگرہ کی طرف کوچ کیا۔ راستے میں مختلف راجے حاضر ہوئے اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ شاہجہان نے بھی ان کے مراتب قائم رکھے بلکہ اضافہ کیا۔ اس نے آس پاس کے تمام گورنروں کو بھی ان کے عہدوں پر بحال رکھا۔ راستے ہی سے شاہجہان نے آصف خان کو اپنے کوچ کی اطلاع دی اور خفیہ طور پر اسے حکم دیا کہ فوراً داور بخش، شہریار اور دوسرے شہزادوں کو قتل کر دیا جائے تا کہ کسی طرف سے بھی اس کے خلاف آواز نہ اٹھ سکے۔ چنانچہ آصف خان نے اشارہ ملتے ہی کٹھ پتلی بادشاہ داور بخش اور اس کے بھائی گرشاسف، دانیال کے دو بیٹوں ہوشنگ اور طہمورشاہ، شہزادہ مراد کے دو لڑکوں، شہزادہ پرویز کے دو لڑکوں اور شہریار کو قتل کر دیا۔ ان کے دھڑ تو لاہور کے ایک باغ میں دفن کئے اور سر شاہجہان کے پاس آگرہ بھیج دیئے جو اس اثناء میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس طرح آصف خان نے ان تمام شہزادوں کو قتل کر دیا جن کی طرف سے کسی بھی مرحلے میں تخت و تاج کا دعویٰ ہو سکتا تھا اور یوں شاہجہان کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ اور وہ اطمینان سے تخت پر متمکن ہوا۔ لیکن تخت و تاج کے لئے برادر کشی کی یہ رسم بد، جس کی ابتدا شاہجہان سے ہوئی اور جس پر اس کے جانشینوں نے بڑی باقاعدگی سے عمل جاری رکھا۔ عظیم مغل سلطنت کے زوال کا سب سے اہم سبب بنی بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شاہجہان نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے 'برادر کشی' نہیں بلکہ 'خودکشی' کا ارتکاب کیا تھا۔

بادشاہ کی آگرہ میں آمد

شاہجہان جنوری ۱۶۲۸ء کے آخری ہفتے میں بڑی دھوم دھام سے آگرہ میں

داخل ہوا۔ وہ ایک بلند قامت ہاتھی پر بیٹھا تھا اور دونوں ہاتھوں سے زر و مال نچھاور کر رہا تھا۔ آگرے میں آکر وہ اپنے قدیم محل ہی میں اترا، جس میں وہ اپنے ایام شہزادگی میں رہا کرتا تھا۔ اس نے تخت نشینی کا جشن منانے کے لئے بڑے پیمانے پر انتظامات کرنے کا حکم دیا اور طے پایا کہ تاج پوشی کی تقریب بارہ دِن بعد ہو گی۔ چنانچہ اس جشن کے لئے بیحد وسیع انتظامات کئے گئے۔

۶ فروری ۱۶۲۸ء کو شاہجہان گھوڑے پر بیٹھ کر بڑے کروفر، تزک و احتشام، خدم و حشم اور جاہ و جلال کے ساتھ قلعۂ شاہی میں داخل ہوا۔ تمام امراء، وزرا، ندماء، سفرا، حسب مراتب جلوس کی صورت میں ہمرکاب تھے۔ تقریب گاہ میں پہنچ کر کمال تمکنت و وقار سے سر پر تاج اور تخت پر قدم رکھا۔ اور ابوالمظفر شہاب الدّین محمد صاحب قرآن ثانی شاہجہان بادشاہ غازی، لقب اختیار کیا۔ اربابِ سیف و قلم اور اعیان دولت و حشم نے تہنیت پیش کی اور نذریں گزاریں۔ بادشاہ نے سب کو انعامات اور خلعتیں دیں۔ عوام میں اتنی خیرات تقسیم ہوئی کہ نہال ہو گئے۔ قیدی آزاد ہوئے۔ مسجدوں میں بادشاہ کے نام کا خطبہ جاری ہوا۔ خطیب نے شاہجہان کے خاندان کے دس بادشاہوں کا نام، صاحب قرآن، کے الفاظ کے ساتھ خطبے میں پڑھا۔ اور ہر نام پر خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوا۔ شاہجہان کے نام کے سکّے ڈھالے گئے اور مہریں بنیں۔ محل سرا میں بھی جشنِ شاہانہ ترتیب دیا گیا۔ تمام خواتین نے نذرانے پیش کئے۔ ملکہ ممتاز محل نے زر و جواہر نثار کئے۔ شاہجہان کی بیٹی جہاں آرا بیگم نے بھی نیاز گزاری۔

تخت نشینی کے بعد شاہجہان نے شاہی خاندان کے افراد کو عنایات سے نوازا۔ ملکہ ممتاز محل کو ذاتی اخراجات کے لئے دو لاکھ اشرفی اور چھ لاکھ روپے دیئے اور دس لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ جہاں آرا کو ایک لاکھ اشرفی اور چار لاکھ روپے دیئے اور چھ لاکھ روپے سالانہ وظیفہ منظور کیا۔ ملکہ ممتاز محل کو اولاد کے اخراجات کے لئے بھی ساڑھے چار لاکھ روپے دیے گئے۔ اس کے علاوہ شہزادوں کے لئے ''روزانہ'' جیب خرچ اس ترتیب سے مقرر ہوا:

داراشکوہ کو ہزار روپے، شجاع کو ساڑھے سات سو روپے، ارنگ زیب کو پانچ سو روپے اور مراد کو ڈھائی سو روپے۔

شاہی خانوادے کے بعد شاہجہان نے اپنے خاص معتمدین کو مناصب و خطابات سے سرفراز کیا۔ اپنے سب سے بڑے محسن آصف خان کو ''یمین الدولہ'' کا خطاب اور وزیراعظم کا منصب عطا کیا۔ مہابت خان کو ''خان خانان'' بنایا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے امراء اعلیٰ مناصب سے ممتاز ہوئے۔ جن میں وزیر خان، سید مظفر خان، بہادر خان روہیلہ سردار خان، راجا بٹھل داس، مرزا مظفر کرنالی، راجا من سروپ وغیرہ خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ عہد سابق کے تمام امراء کو قائم رکھا۔ تخت نشینی کے موقع پر آصف خان بوجوہ دربار میں حاضر نہ ہو سکا۔ اور وہ لاہور ہی میں رہا۔ بعد میں جب وہ شاہجہان کے بیٹوں داراشکوہ، شجاع اور اورنگ زیب کو ساتھ لے کر آگرہ آیا تو بادشاہ نے اس کی بہت تکریم کی کیونکہ محض اسی کی کوششوں سے شاہجہان اس مقام تک پہنچ پایا تھا۔

شاہجہان نے برسرِ اقتدار آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اسلامی کیلنڈر کی تجدید کی۔ قمری نظام رائج کیا۔ اس کے علاوہ شرعی احکام کی سختی سے پابندی کرنے کا حکم دیا۔ ارتداد کی سخت سزا مقرر کی۔ اسلامی تہوار منانے کا حکم دیا۔ بادشاہ کے حضور سجدہ کرنے سے منع کر دیا۔ اور بعد میں 'زمین بوسی' کی رسم بھی ختم کر دی۔ غیر مسلموں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک الگ وزارت قائم کی۔

باغیوں کی سرکوبی

شاہجہان کے عہد کے ابتدائی حصے میں چند بغاوتیں ہوئیں جنہیں خاصی تگ و دو کے بعد کچل دیا گیا۔

۱۶۲۸ء میں بندھیل کھنڈ کے حکمران راجا جھجار سنگھ نے بقایاجات کی ادائیگی کے حکم پر مرکز سے بغاوت کر دی۔ یہ راجا بیر سنگھ بندھیلہ کا لڑکا تھا۔ جس نے جہانگیر کے اشارے پر ابوالفضل کو دکن سے واپس آتے ہوئے قتل کیا تھا۔ اس کام کے صلے میں

بادشاہ بننے کے بعد، جہانگیر نے اسے یہ جاگیر دی تھی۔ جہانگیر کی بیجا نوازشات نے اسے خودسر بنادیا اور اس نے آس پاس کے لوگوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد اس کا لڑکا بھی باپ کی روش پر ہی چلا۔ جب اس کی باغیانہ سرگرمیاں حد سے بڑھ گئیں تو شاہجہان نے اس کی سرکوبی کے لئے لشکر بھیجا اور وہ اطاعت گزار ہوا۔ بعد میں راجا جھجھار سنگھ نے جہان خان لودھی کی قیادت میں دکن میں قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے۔ تو شاہجہان کی نظروں میں اس کی قدر و منزلت پھر بڑھ گئی۔ لیکن ۱۶۳۵ء میں اس نے پھر بغاوت کر دی۔ اس مرتبہ شاہجہان نے اس کی گوشمالی کے لئے شہزادہ اورنگ زیب کی سرکردگی میں فوج بھیجی۔ اور خود اس مہم کی نگرانی کے لئے گوالیار چلا آیا۔ معرکے میں راجا، اس کا بیٹا اور اس کی فوج کا کافی حصہ کام آیا۔ اور یہ بغاوت ختم ہوئی۔

اسی طرح ۱۶۲۹ء میں خان جہان خان لودھی نے بغاوت کی۔ اس نے احمد نگر کے سلطان کی حمایت سے شاہی علاقوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ اس کی گوشمالی کے لئے شاہجہان خود دکن گیا اور شاہی لشکر کی اس کے ساتھ کئی جھڑپیں ہوئیں۔ بالآخر احمد نگر کے سلطان نے اس کی حمایت ترک کر دی اور وہ شاہی فوج کے ساتھ جنگ میں مارا گیا۔ یوں یہ مہم بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

پرتگیزوں کے خلاف اقدام

ابتدائی دور کے ان تادیبی اقدامات میں سب سے اہم وہ اقدام ہے جو پرتگیزوں کے خلاف اٹھایا گیا۔ یورپی اقوام میں سے پرتگیز سب سے پہلے برصغیر میں وارد ہوئے اور انہوں نے اس نئے بحری راستے سے تجارت شروع کی اور آہستہ آہستہ یہاں کی برآمدات کے اجارہ دار بن گئے۔ برصغیر کے مسلمان بادشاہوں نے ان غیر ملکی باشندوں کے اس اثر و نفوذ کے مضمرات سمجھنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ انہوں نے اس پہلو کی طرف کبھی توجہ ہی نہ دی کہ ان لوگوں کی تجارتی مداخلت مستقبل میں برصغیر کی سیاسی صورتِ حال پر کیا

اثرات مرتب کرے گی۔ پہلے پہل تو ان غیر ملکی افراد نے اپنی سرگرمیاں صرف تجارتی معاملات تک ہی محدود رکھیں۔ لیکن بعد میں برصغیر کے بادشاہوں کی آپس کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے بتدریج سیاست میں بھی مداخلت شروع کر دی۔ اسی دوران میں انگریز بھی ان کے 'کاروباری حریف' بن کر ہندوستان میں آنے جانے لگے، جس سے پرتگیزوں کے تجارتی مفادات پر زد پڑی، تو انہوں نے سورت میں اپنی تجارتی کوٹھیوں کو دفاعی قلعوں کی شکل دے دی۔ اس طرح انگریزوں کے ساتھ مسلح تصادم کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا۔ اِدھر انگریزوں نے یہ ہوشیاری کی کہ جہانگیر کے دربار میں ایلچی بھیجے اور بالآخر تجارتی مراعات حاصل کر لیں۔ اب انہوں نے بھی پرتگیزوں کے ساتھ تصادم کی حکمت عملی اختیار کی۔ اس طرح ان کے درمیان کئی چھوٹی بڑی جھڑپیں ہوئیں جن میں آخر کار پرتگیزوں کو پسپائی اختیار کرنی پڑی اور انگریزوں نے ان بندرگاہوں سے ہونے والی تجارت پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں نے اس علاقے میں جابجا اپنے تجارتی قلعے تعمیر کر لئے۔ ان قلعوں کی دفاعی صلاحیت بہت زیادہ تھی اور ان میں جدید آلات حرب بڑی تعداد میں محفوظ کر لئے گئے۔ بھاری توپیں قلعوں پر نصب کر دی گئیں اور ان کے لئے وافر مقدار میں گولہ بارود ذخیرہ کر لیا گیا۔ بہترین تربیت یافتہ فوج، ملازموں کے بھیس میں جمع کر لی۔ یہی کچھ پرتگیزوں نے کیا انہوں نے سورت کا علاقہ خالی کر کے بنگال کے ساحل پر ہگلی کی بندرگاہ کو اپنے استعماری مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے چٹاگانگ کی بندرگاہ پر بھی اپنا اقتدار قائم کر لیا اور روز بروز اپنی فوجی طاقت بھی بڑھاتے چلے گئے۔ یہ بات بڑی تعجب خیز ہے کہ دو غیر ملکی قومیں ایک تیسرے ملک میں تجارتی اجارہ داری حاصل کرنے کے لئے لڑتی جھگڑتی رہیں، ایک دوسرے کو بے دخل کرنے کیلئے قلعے بنائے اور اسلحہ جمع کیا۔ لیکن مغل بادشاہ اس انتہائی سنگین مسئلے سے بالکل بے نیاز رہے اور انہوں نے اس قضیے کے دوررس نتائج پر کبھی غور ہی نہ کیا۔

شاید مغل دربار، پرتگیزوں کی ان غیر آئینی سرگرمیوں کی طرف کبھی بھی توجہ نہ

دیتا اگر وہ خود حد سے نہ گزر جاتے۔ پرتگیزوں نے ہگلی اور چٹاگانگ کے علاقوں میں مقامی باشندوں سے بیگار لینے کو معمول بنالیا تھا اس پر مستزاد یہ کو انہوں نے بردہ فروشی بھی شروع کر دی۔ وہ ان علاقوں سے مرد، عورتیں اور بچے پکڑتے اور یورپی ممالک میں لے جا کر فروخت کر دیتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پرتگیز پادریوں نے مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنانا شروع کر دیا۔ جو مسلمان مرتد ہو جاتے وہ تو آرام سے رہتے اور جو اسلام کو نہ چھوڑتے ان پر طرح طرح کے ظلم کئے جاتے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی اور عوام نے مغل دربار میں جا کر مسلسل فریادیں کیں تو اس وقت کے مغل تاجدار شاہجہان نے ۱۶۳۱ء میں پرتگیزوں کی ان وحشیانہ سرگرمیوں کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کے لئے اس نے اپنے معتمد خاص قاسم خان کو بنگال کا حاکم مقرر کیا۔ کیونکہ بنگال کے موجودہ حکمران پرتگیزوں سے رشوت کھاتے تھے۔ اس لئے ان کو انہی کے خلاف کاروائی کا حکم دینا ایک قطعاً غیر منطقی بات تھی۔ چنانچہ بنگال پہنچ کر قاسم خان نے اپنے بیٹے عنایت خان کو اس مہم کا سربراہ مقرر کیا جس نے بالکل خفیہ طور پر ہگلی کے آس پاس اپنی فوج پھیلانی شروع کر دی۔ جب وہ پرتگیزوں کو ہر طرف سے مکمل طور پر گھیر چکا تو اچانک ان پر ہلہ بول دیا۔ پرتگیز چونکہ مضبوط دفاعی پوزیشن میں تھے اس لئے باوجود اچانک حملے کے انہوں نے جم کر مقابلہ کیا اور اپنے مستحکم قلعوں میں محصور ہو گئے۔ انہوں نے مغل فوج کے سالار کو حسب دستور رشوت پیش کی مگر اس نے اس پیش کش کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ تین ماہ تک محاصرہ جاری رہا لیکن کوئی قلعہ بھی فتح نہ ہو سکا۔ بالآخر شاہی لشکر نے قلعوں کی دیواروں کو بارودی سرنگوں اور براہ راست زبردست گولہ باری سے مسمار کر دیا اور قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ ہزاروں پرتگیز مارے گئے، ہزاروں بھاگتے ہوئے سمندر کی بھینٹ چڑھے اور ہزاروں ہی قید ہوئے، جن میں مرد، عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ ان کو دربار میں لایا گیا۔ جنہوں نے اسلام قبول کر لیا انہیں آزاد کر دیا گیا اور باقی کو لونڈی غلام کی حیثیت سے امرائے دربار میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس طرح برصغیر سے پرتگیزوں کی مداخلت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا اور میدان میں صرف انگریز ہی رہ گئے جنہوں نے پرتگیزوں کے انجام

سے عبرت حاصل کی اور جب تک انہیں اپنی کامیابی کا قطعی یقین نہ ہو گیا انہوں نے یہاں کے سیاسی معاملات میں مداخلت نہ کی۔

ابتدائی معرکوں میں سکھ مت کے چھٹے پیشوا، گورو ہرگو بند کے ساتھ شاہی افواج کا تصادم خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ پنجاب کی تاریخ میں یہ واقعہ کئی وجوہ کے اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا مفصل تذکرہ گورو صاحبان کے حالات کے لئے مخصوص مقام پر کیا جائے گا۔

دارالحکومت کی منتقلی

۱۶۳۱ء میں شاہجہان نے بعض انتظامی ضروریات کے تحت دہلی کو دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ موجودہ شہر کے ساتھ ہی ایک بڑا قلعہ تعمیر کیا گیا۔ اس قلعے میں بیشتر سنگ سُرخ استعمال ہوا ہے، اس لئے اس کا نام لال قلعہ پڑ گیا۔ اِس قلعے میں کئی عالیشان عمارتیں بنیں۔ جب بادشاہ مستقلاً یہاں رہنے لگا تو اس نئے شہر کے ساتھ ساتھ سارے شہر کا نام ہی ''شاہجہان آباد'' ہو گیا۔ جب کہ قبل ازیں شاہ جہان خود آگرے کو ''اکبر آباد'' کا نام دے چکا تھا۔ دہلی اب اہلِ علم اور صاحبِ فن لوگوں کا مرجع بن گیا۔ آگرہ کے دارالحکومت بن جانے کی وجہ سے دہلی کی مرکزیت کو جو نقصان پہنچا تھا وہ شاہجہان کے سنہری دور میں پورا ہو گیا۔

قحط زدہ علاقے

۳۲-۱۶۳۱ء ہی میں دو اور اہم لیکن ناخوشگوار واقعات بھی ہوئے۔ پہلا تو یہ کہ دکن، خاندایش اور برار کے علاقوں میں خوفناک قحط نمودار ہوا۔ کافی عرصے سے یہ علاقے خشک سالی کا شکار تھے۔ فصلیں نہ ہونے کی وجہ سے یہاں اجناسِ خوردنی کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔ ہزاروں لوگ ہلاک ہو گئے۔ شاہجہان نے فوراً مرکز سے امدادی اشیاء روانہ کیں اور امدادی سرگرمیوں کا تیز تر کرنے کے لئے خود بھی برہان پور چلا گیا۔ اس نے متاثرہ علاقے میں جابجا سرکاری لنگر خانے قائم کرنے کا حکم دیا۔ بے شمار روپیہ قحط زدہ

لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ جب تک بادشاہ برہان پور میں رہا، پانچ ہزار روپے ہر پیر کو ان لوگوں میں تقسیم کرتا رہا اور یہ سلسلہ بیس ہفتے جاری رہا۔ بادشاہ نے آفت زدہ لوگوں کے بہت سے ٹیکس بھی معاف کر دیئے تا کہ لوگ اطمینان سے دوبارہ آباد ہو سکیں۔

ممتاز محل کی وفات

دوسرا واقعہ ملکہ ممتاز محل کی وفات کا ہے۔ بادشاہ دکن میں جہان خان لودھی کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا کہ برہان پور کے مقام پر ملکہ ممتاز محل کے ہاں بچی پیدا ہوئی۔ بچی کی پیدائش کے فوراً بعد اسکی حالت بگڑ گئی۔ شاہجہان آخری بار اس کی بالین پر آیا تو ملکہ نے اسے بچوں کے بارے میں وصیت کی اور اس کی جان قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ شاہجہان کو اس کی موت کا بہت رنج ہوا۔ اس کی موت سے وہ پژمردہ ہو گیا۔ اس کی صحت بہت گر گئی اور وہ زندگی سے بالکل بیزار ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ملکہ کی وفات کے وقت اس کے صرف دو بال سفید تھے مگر دو سال کے قلیل عرصے میں اس کے تمام بال سفید ہو گئے۔ اور وہ اپنی عمر کی نسبت سے بہت بوڑھا دکھائی دینے لگا۔ ملکہ ممتاز محل کی نعش کو امانت کے طور پر برہان پور میں دفن کیا گیا۔ اور بعد ازاں وہاں سے نکال کر آگرہ لایا گیا۔ جہاں بعد میں شاہجہان نے ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کیا، جو زرِ کثیر کے اخراجات سے تیار ہوا۔ شاہجہان کے عہد کا یہ نمائندہ شاہکار دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہے۔ آج بھی نہایت آن بان کے ساتھ خلق کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔

شاہجہان کی لاہور میں آمد

شاہجہان کو بادشاہ بنے پانچ سال ہو گئے تھے۔ مگر بعض غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے وہ اب تک پنجاب جیسے اہم صوبے میں نہ آسکا تھا۔ چنانچہ ۱۶۳۳ء میں وہ تخت نشینی کے بعد پہلی مرتبہ لاہور آیا۔ یہاں کے انتظامات کو ملاحظہ کیا اور ان کو مزید بہتر بنانے کا حکم دیا۔ لاہور سے بادشاہ انبالہ گیا۔ وہاں سے پھر لاہور آیا۔ قلعۂ لاہور میں اکبر اور جہانگیر کے عہد کی بہت سی عمارتیں جو پرانی اور بے وضع ہو چکی تھیں، ان کو گرا کر جدید عمارتیں

بنانے کی ہدایت کی اور کہا کہ میرے کشمیر سے واپس آنے تک یہ سب تیار ہو جائیں۔ دیوان عام، ثمن برج وغیرہ اسی دوران میں بنے تھے۔ لاہور میں قیام کے دوران میں بادشاہ نے آصف خان کے نوتعمیر شدہ محل کا معائنہ کیا۔ جب بادشاہ اِس عمارت میں گیا تو آصف خان نے چھ لاکھ روپے نذر پیش کی۔ اسی قیام کے دوران شاہجہان حضرت میاں میرؒ سے ملنے ان کی خانقاہ میں گیا۔ تسبیح اور سفید دستار ہدیہ کی اور خانقاہ کے خدام میں ہزاروں روپیہ تقسیم کیا۔ لاہور سے بادشاہ کشمیر گیا اور تین مہینے تک اِس جنت نظیر وادی میں مقیم رہا اور وہاں کی سیر کے بعد لاہور سے ہوتا ہوا واپس آگرہ چلا گیا۔ کشمیر میں قیام کے دوران بادشاہ کو علم ہوا کہ بھمبر کے علاقے کے لوگ محض کلمہ پڑھنے کی حد تک ہی مسلمان ہیں اور اسلامی تعلیمات سے قطعاً بے بہرہ ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے مردوں کو دفن کرنے کے بجائے جلاتے ہیں اور اپنی لڑکیوں کو ہندوؤں کے ساتھ بیاہ دیتے ہیں۔ شاہجہان کو ان باتوں کا سن کر بہت افسوس ہوا اور اس نے حکم دیا کہ جس ہندو کے گھر مسلمان لڑکی ہے، یا تو وہ مسلمان ہو جائے یا اس سے علیحدگی اختیار کر لے۔ اس کے علاوہ علماء کو اس علاقے میں تبلیغ کرنے اور لوگوں کو اسلامی عقاید سے روشناس کرانے کا حکم دیا۔

علی مردان خاں گورنر پنجاب

قندھار ایک عرصے تک مغلوں کے زیرِ نگیں رہا تھا۔ لیکن جہانگیر کے عہد میں اس پر ایرانی افواج نے قبضہ کر لیا۔ ایرانی دربار کی طرف سے علی مردان خاں وہاں کا حاکم مقرر ہوا۔ کچھ عرصے بعد علی مردان کی شاہِ ایران سے ان بن ہو گئی تو اس نے مغلوں کے ساتھ ساز باز کر کے یہ علاقہ ان کے حوالے کر دیا اور خود شاہجہان کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے ہندوستان چلا آیا۔ بادشاہ اس زمانے میں لاہور میں تھا۔ ۱۶۳۹ء میں علی مردان لاہور میں بادشاہ سے ملا۔ بادشاہ نے اس کو بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ اعلیٰ خطابات سے نوازا ہفت ہزاری منصب عطا کیا اور پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ علی مردان خاں نے اپنے عہد کی ابتداء زراعت کے لئے تعمیر کی گئی نہر کے افتتاح سے کی۔ علی مردان

کو نہریں کھدوانے کا بہت شوق تھا۔ اس کام میں اسے مہارت بھی حاصل تھی۔ اس نے پنجاب میں کئی نہریں بنوائیں۔ شالامار باغ کو سیراب کرنے کے لئے بھی اس نے دریائے راوی سے ایک نہر نکالی تھی۔ دہلی میں بھی اس نے نہر کھدوائی جو آج تک اس کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ علی مردان قابلِ رشک انتظامی اور فوجی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے کئی اہم فوجی مہمات کی قیادت کی جن میں وسطِ ایشیا کی مہمیں بھی شامل ہیں۔ اس کے عہد میں پنجاب کے حالات مجموعی طور پر بڑے پرسکون رہے اور عوام کی خوشحالی میں اضافہ ہوا۔

آصف خان کی وفات

۱۶۴۱ء کا اہم ترین واقعہ مغل دربار کی سب سے مقتدر شخصیت، آصف خان کی وفات ہے۔ آصف خان ۱۰ نومبر ۱۶۴۱ء کو بہتر برس کی عمر میں لاہور میں فوت ہوا۔ ان دنوں بادشاہ بھی لاہور کے مضافات میں شکار کھیل رہا تھا۔ جب اسے آصف خان کی وفات کی خبر دی گئی تو اسے بہت رنج ہوا۔ بادشاہ نے آصف خان کو جہانگیر کے مقبرے کے پاس دفن کرنے کی ہدایت کی۔ آصف خان شاہجہان کا خسر ہونے کے علاوہ اپنے ذاتی اوصاف کی وجہ سے اس کا معتمد ترین آدمی تھا۔ اس نے لاہور میں ایک عالیشان محل تعمیر کیا تھا اور مرنے کے بعد کروڑوں روپے کا ترکہ چھوڑا اور وصیت کی کہ یہ تمام زرومال شاہی خزانے میں جمع کر دیا جائے۔ لیکن بادشاہ نے یہ سب کچھ اس کے تین بیٹوں اور پانچ بیٹیوں میں تقسیم کر دیا۔ صرف اس کا محل شاہجہان نے اپنے بڑے بیٹے دارا شکوہ کو عطا کیا۔

انگریزوں کو تجارتی تحفظ کا ملنا

۱۶۴۴ء میں شہزادی جہاں آرا کے جلنے کا واقعہ بھی بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ شہزادی اپنی سالگرہ کے دن بادشاہ کو سلام کر کے واپس آرہی تھی کہ اس کا باریک، نازک اور معطر لباس ایک شمع سے چھو گیا اور ایک دم بھڑک اٹھا۔ کنیزیں آگ بجھانے کو دوڑیں۔ لیکن جب تک آگ بجھی، جہاں آرا شدید طور پر جھلس چکی تھی۔ شہزادی کو بچانے کی کوشش

میں چار کنیزیں بھی بری طرح جل گئیں جن میں سے دو تو جانبر نہ ہو سکیں۔ شاہجہان اپنی اس بیٹی سے انتہائی محبت کرتا تھا اور اسے مملکت میں 'خاتونِ اول' کی حیثیت حاصل تھی۔ بادشاہ اس کے جلنے کا سن کر بہت دل گرفتہ ہوا۔ فوراً تمام شاہی حکیموں کو علاج کے لئے طلب کر لیا۔ اور خود صبح سے شام تک غریبوں میں خیرات اور صدقہ تقسیم کرتا اور ساری ساری رات خدا کے حضور میں اپنی بیٹی کے لئے شفا کی التجا کرتا، لیکن تمام طبیبوں کا علاج ناکام ثابت ہوا۔ اور جہاں آرا کے زخموں اور شاہجہان کے دل کی سوزش ویسی ہی رہی۔ مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دیسی علاج کارگر نہ ہوا تو شاہجہان نے سورت سے ایک انگریز طبیب، ڈاکٹر بارٹن کو بلایا۔ جس کے علاج سے جہاں آرا کو شفا ہوئی۔ شاہجہان نے جہاں آرا کی صحت یابی پر ایک عظیم جشن ترتیب دیا۔ ایسے جشن کی مثال مغل دور میں مشکل ہی سے ملے گی۔ ڈاکٹر بارٹن کی بہت عزت افزائی ہوئی۔ شاہجہان نے جب اسے حسبِ خدمت انعام دینا چاہا تو اس نے کسی قسم کا انعام لینے سے انکار کر دیا۔ جب شاہجہان نے بہت اصرار کیا تو اس نے کہا کہ مجھے انعام عطا فرمانے کی بجائے آپ میری قوم کو برصغیر میں تجارتی مراعات عطا فرما دیں اور انہیں یہاں کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت بخش دیں۔ شاہجہان نے اس درخواست کو قبول کیا اور سورت میں انگریزوں کو ہر قسم کی سہولتیں مہیا کر دیں۔ اس واقعے سے جہاں انگریزوں کی قوم پرستی کا ثبوت ملتا ہے۔ وہاں یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ مغل دربار میں اعلیٰ سیاسی بصیرت کا فقدان تھا کیونکہ جب اس قوم کو تجارتی سرگرمیوں کی آڑ میں آئینی تحفظ مل گیا تو اس نے چور دروازے کے راستے اقتدار پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنانے شروع کر دیئے اور بالآخر ان منصوبوں میں کامیاب ہوئی۔

علی مردان خاں کی مہمات

مغلوں کا وطنِ مالوف وسطی ایشیاء تھا، جو اب اس خاندان کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ امیر تیمور کی حکومت کا مرکز بھی سمرقند ہی تھا۔ اگرچہ ہندوستان جیسے وسیع ملک پر مغل

پرچم نہایت عظمت و وقار کے ساتھ لہرا رہا تھا لیکن وہ اپنے مرکز یعنی سرزمین سمرقند و بخارا اور بلخ و بدخشاں کو نہاں خانۂ دل سے محو نہ کر سکے۔ انہوں نے کئی بار ان علاقوں کو فتح کرنے کی کوشش کی مگر انہیں کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ بابر نے ایک بار سمرقند پر قبضہ بھی کر لیا تھا، لیکن اس کا یہ قبضہ بالکل عارضی ثابت ہوا۔ ہمایوں تو خود ہی مصائب کا شکار رہا۔ اسی طرح اکبر اور جہانگیر بھی ہندوستان کے اندرونی حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ دے سکے۔ شاہجہان کو چونکہ ملک کے اندر کوئی پریشانی نہ تھی۔ اور اسی داخلی اطمینان کی بنا پر اس نے قندھار اور بلخ پر لشکر کشی کا فیصلہ کیا۔ ادھر وسط ایشیاء میں خانہ جنگی چھڑی ہوئی تھی۔ اس صورت میں مغلوں کی یقینی کامیابی کے تمام امکانات موجود تھے۔ چنانچہ ۱۶۴۶ء میں شاہجہان نے شہزادہ مراد کی سربراہی اور علی مردان خان کی رہنمائی میں دس ہزار پیادوں اور پچاس ہزار سواروں پر مشتمل ایک فوج اس مقصد کے لئے بھیجی۔ اس فوج نے کئی کامیابیاں حاصل کیں اور بالآخر بلخ و بدخشاں مغلوں کے تسلّط میں آ گئے۔ شاہجہاں جو اس تمام عرصہ کے دوران کسی بھی ہنگامی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے لاہور میں مقیم رہا تھا۔ کو ان کامیابیوں سے بہت خوشی ہوئی۔ لیکن ایرانی حکومت کی ان علاقوں سے دلچسپی اور مداخلت کی دھمکی کے علاوہ موسمی حالات کی ناموافقت اور شہزادہ مراد کی بے عمال قیادت کی وجہ سے اس قبضے کو استحکام نصیب نہ ہوا اور مغل افواج کو تھوڑے ہی عرصے بعد وہاں سے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ واپسی کے دوران برف باری کی شدت اور مقامی باشندوں کی گوریلا سرگرمیوں کے باعث لشکر کو بہت نقصان پہنچا۔ شاہجہان نے سعد اللہ خان چنیوٹی کو کمک دے کر بھیجا، جس سے پسپائی کچھ محفوظ ہو گئی۔

بلخ اور بخارا پر فوج کشی

شاہجہان نے اس ہزیمت کا بدلہ لینے کے لئے اگلے سال ۱۶۴۷ء میں شہزادہ اورنگ زیب کی قیادت میں ایک اور مہم بلخ کی جانب بھیجی۔ فوج کے حوصلے کو قائم رکھنے کے لئے بادشاہ خود کابل تک ساتھ آیا۔ وہ تو کابل میں ٹھہر گیا اور لشکر آگے روانہ ہوا۔

اگرچہ شہزادہ اورنگ زیب کے پاس افرادی قوت پچھلے سال کی نسبت کم تھی اور اس علاقے کے جغرافیائی حالات بھی مغلوں کے مخالف تھے مگر شہزادے نے فوج کو اس خوبی سے لڑایا کہ دشمن بھاگ گیا اور بلخ پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اِس کے بعد بخارا کے حکمران عبدالعزیز کے ساتھ ایک زبردست معرکہ ہوا۔ اِس معرکے میں اورنگ زیب نے جس مجاہدانہ کردار کا مظاہرہ کیا اسے تا ابد تاریخ کے زریں اوراق میں نمایاں مقام حاصل رہے گا۔ ظہر کے وقت جب ہنگامہ کارزار عروج پر تھا، دونوں طرف سے تیر وتفنگ کی بارش ہو رہی تھی، توپوں کے دہانے آگ برسا رہے تھے، اور بندوقیں گولیوں کی بوچھاڑ کر رہی تھیں، اورنگ زیب نہایت اطمینان کے ساتھ گھوڑے سے اترا اور لڑتی ہوئی صفوں کے عین درمیان مصلےٰ بچھا کر نماز میں مشغول ہو گیا۔ اس کے اس عمل کا مخالف فوج پر شدید نفسیاتی اثر پڑا اور انہوں نے مزید مزاحمت بے کار سمجھ کر صلح کی درخواست کی۔ دوسرے حریف نذر محمد نے شاہ ایران کی اعانت سے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی، لیکن اس نے شاہجہان سے درخواست کی کہ صرف بدخشاں کا علاقہ مجھے دیدیا جائے۔ شاہجہان نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ بعد ازاں موسم کی شدّتوں کی وجہ سے جب وہاں قبضہ برقرار رکھنا محال ہو گیا تو بادشاہ نے بلخ بھی اسی کے حوالے کر کے افواج کو واپسی کی ہدایت کی۔ واپسی پر اس مہم کا حشر بھی پہلی مہم جیسا ہی ہوا۔ یعنی برف باری اور چھاپہ ماروں کی وجہ سے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔

شاہجہان کی یہ توسیع پسندانہ حکمت عملی قطعاً ناکام رہی۔ اِن مہمات میں بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان کے باوجود نتیجہ صفر رہا۔ لیکن شاہجہان کو ان مہموں کے انجام سے کوئی سبق حاصل نہ ہوا۔ اب اس نے قندھار کی جانب توجہ مبذول کر دی اور ۱۶۴۹ء، ۱۶۵۲ء اور ۱۶۵۳ء میں قندھار کی بازیابی کے لئے بھاری لشکر بھیجے۔ پہلے دو لشکر اورنگ زیب کی قیادت میں گئے اور آخری داراشکوہ کی سربراہی میں۔ لیکن یہ تینوں کوششیں بری طرح ناکام ہوئیں۔ اس سعی لاحاصل کے دوران میں ہزاروں جانیں تلف اور کروڑوں روپیہ صرف ہوا۔ ان معرکوں میں ایرانی افواج نے قابلِ قدر دفاعی صلاحیتوں کا مظاہرہ

کیا۔ دراصل اکبر کے عہد کی قائم شدہ مغلوں کی یہ عسکری برتری روبہ تنزل ہونے لگی اور اس کا بھرم مستقبل قریب، یعنی شاہجہان کے زمانے میں ایرانیوں کے ساتھ ان کی جنگوں کی بدولت کھل گیا۔ اور علاقے میں ایک ابھرتی ہوئی فوجی طاقت کی حیثیت سے ایرانیوں کا نام لیا جانے لگا اور بالآخر ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ ایرانی کے حملے کی وجہ سے مغلیہ دربار کے جاہ و جلال کا فلک بوس ایوان زمین بوس ہو گیا۔

دکن کی فتوحات کا اجمالی ذکر

دکن کی تسخیر کا سلسلہ اکبر کے زمانے میں شروع ہوا اور بتدریج مختلف علاقے مغلیہ سلطنت کے حصے بنتے گئے۔ برسر اقتدار آنے کے بعد شاہجہان نے فوراً ہی دکن کی مہمات کو تکمیل تک پہنچانے کا ارادہ کیا۔ بادشاہ نے شہزادہ اورنگ زیب کو اِس مہم کا سربراہ مقرر کیا۔ جس نے تھوڑے ہی عرصے میں احمد نگر، بیجا پور اور گول کنڈہ کو مکمل طور پر مغل تاج کے زیرِ نگیں کر لیا۔ شاہجہان نے ۱۶۳۶ء میں اورنگ زیب کی عمدہ کارکردگی کے اعتراف کے طور پر اسے اپنا نائب مقرر کیا۔ جہاں اس نے اپنی انتظامی صلاحیت کا قابلِ رشک مظاہرہ کیا۔ اس کے اقدامات کی وجہ سے انتظامی ابتری ختم ہو گئی۔ مرکز کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا، اور سالانہ خراج کی ادائیگی باقاعدہ ہو گئی۔ لیکن دربار میں موجود اس کا مخالف گروہ جس کی قیادت بڑا شہزادہ داراشکوہ کر رہا تھا۔ قدم قدم پر اس کے لئے رکاوٹیں پیدا کرتا۔ اور اسے طرح طرح سے پریشان کیا جاتا۔ مرکز کے اس رویے سے تنگ آ کر ۱۶۴۴ء میں اورنگ زیب نے احتجاجاً اس منصب سے استعفیٰ دے دیا لیکن بعد میں جب حالات پھر بگڑ گئے تو شاہجہان نے ۱۶۵۳ء میں اسے دوبارہ دکن کی نیابت عطا کی اور شہزادے نے تھوڑے ہی عرصے میں ایک بار پھر حالات پر قابو پا لیا۔

جانشینی کی جنگ

شاہجہان کا عہدِ حکومت جس طرح اپنے استحکام اور خوشحالی کے لحاظ سے منفرد ہے اسی طرح اس بادشاہ کا انجام بھی اپنی مثال آپ ہے۔ خاندانِ مغلیہ کا یہ واحد بادشاہ

ہے جس کی زندگی ہی میں اس کے بیٹوں جو آپس میں حقیقی بھائی تھے، کے مابین خونریزی ہوئی اور جس کے آخری ایام کا تذکرہ زندان کی چہار دیواری سے عبارت ہے۔ شاہجہان نے اپنی زندگی کے آخری آٹھ سال آگرے کے قلعے میں اورنگ زیب کے قیدی کی حیثیت سے گزارے۔

اگست ۱۶۵۷ء میں شاہجہان شدید بیمار ہو گیا۔ اس وقت صرف بڑا شہزادہ داراشکوہ ہی دربار میں تھا۔ جو اگرچہ تھا تو پنجاب اور کابل کے علاقوں میں بادشاہ کا نائب، مگر صوبوں کو اپنے نائب گورنروں کے سپرد کر کے، اپنا زیادہ وقت مرکز ہی میں گزارتا تھا، باقی شہزادے اپنے اپنے صوبوں میں تھے۔ یعنی شجاع بنگال میں، اورنگ زیب دکن میں اور مراد گجرات میں۔ جب بادشاہ کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو دارا نے مملکت داری کے تمام امور اپنے ہاتھ میں لے لئے اور اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لئے زبردست فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور دوسرے شہزادوں کے علاوہ امرائے دربار کو بھی حقیقتِ حال سے یکسر بے خبر رکھنے کی کوشش کی۔ ان اقدامات میں حرم کی مقتدر ترین خاتون یعنی اس کی بڑی بہن جہاں آرا بھی اس کے ساتھ مکمل تعاون کر رہی تھی۔ لیکن دوسری بہن روشن آرا کی تمام ہمدردیاں اورنگ زیب کے ساتھ تھیں۔ جب بادشاہ کے بارے میں مصدقہ اطلاعات کا دروازہ بند ہو گیا۔ تو طرح طرح کی افواہوں نے جنم لیا۔ عوام میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ بادشاہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے اور دارا اس کی موت کو سیاسی مصلحت کی بنا پر پوشیدہ رکھے ہوئے ہے۔ جب یہ افواہیں شہزادوں تک پہنچیں تو انہیں باپ کی زندگی، دارا کے عزائم اور اپنے مستقبل کے بارے میں تشویش لاحق ہوئی۔ لہٰذا انہوں نے صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے جوابی منصوبہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے شہزادہ شجاع نے بنگال میں 'ناصر الدین تیمور سوم' کے لقب سے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنی تمام فوجی طاقت کے ساتھ مرکز کا رخ کیا۔ اور بغیر کسی رکاوٹ کے جنوری ۱۶۵۸ء میں بنارس آ گیا۔ ادھر گجرات میں مراد نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ لیکن اورنگ زیب جو ان میں سب سے زیادہ دوراندیش

سیاستدان تھا، نے اس قسم کا اعلان کرنے میں عجلت نہ کی اور خاموشی سے حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ اور مسلسل اپنی قوت میں اضافہ کرتا رہا۔ بعد میں رائے عامہ پر اس کے اس عمل کا بہت اچھا اثر ہوا۔ اس دوران میں اس نے شہزادہ مراد سے برابر رابطہ قائم رکھا اور باہمی افہام وتفہیم کے بعد مشترکہ اقدام کرنے کا فیصلہ کیا اور ان کی فوجیں ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق فروری ۱۶۵۸ء میں دارالحکومت دہلی کی جانب روانہ ہوئیں۔ شہزادوں کی اس فوجی نقل وحرکت کی اطلاعات جب دارا کو ملیں تو اس نے انہیں مرکز سے دور رکھنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ اس مقصد کے لئے اس نے شاہجہان کے ہاتھ سے خط لکھوا کر شہزادوں کو بجھوائے۔ جس میں بادشاہ نے لکھا کہ 'میں زندہ سلامت ہوں اور اب تندرست ہو رہا ہوں۔ تمہیں چاہیے کہ اپنے اپنے صوبوں میں واپس چلے جاؤ ورنہ تمہارے اس عمل سے سلطنت کی شیرازہ بندی متاثر ہو گی، لیکن شہزادوں نے ان خطوط کو کوئی اہمیت نہ دی اور دہلی کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔

دارا نے بھائیوں کی مسلسل پیش قدمی پر اپنی حفاظتی تدابیر پر عمل شروع کر دیا۔ سب سے پہلے عوام کو یہ باور کرانے کے لئے کہ بادشاہ حیات ہے، اسے کئی بار جھروکے میں لایا گیا۔ اس کے بعد دارا بادشاہ کو ساتھ لے کر آگرہ چلا گیا تاکہ وہاں پر موجود بے شمار زر ومال کو اپنے تصرف میں لا سکے۔ دوسرے وہاں سے شہزادوں کے خلاف فوجی کاروائی کرنے میں بھی آسانی تھی۔ آگرہ آنے کے بعد دارا شکوہ نے تینوں شہزادوں کی پیش قدمی روکنے کے لئے فوجیں بھیجیں۔ بنگال کی طرف اپنے بیٹے سلیمان شکوہ، دکن کی جانب راجا جسونت سنگھ اور گجرات کی سمت قاسم خان کو وافر افرادی قوت اور ساز وسامان کے ساتھ روانہ کیا۔ سب سے پہلے شہزادہ سلیمان شکوہ کا شجاع کے ساتھ ۱۴ فروری ۱۶۵۸ء کو بنارس کے قریب بہادر پور کے مقام پر تصادم ہوا۔ جس میں شجاع کو زبردست شکست ہوئی اور وہ واپس بھاگ گیا۔ لیکن دوسری طرف اورنگ زیب اور مراد کے لشکر مالوہ میں آکر متحد ہو گئے اور ان کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ اسی اثناء میں راجہ جسونت سنگھ بھی ان کے مقابلے میں آن پہنچا۔ بالآخر ان میں اجین سے چودہ میل کے فاصلے پر دھرموت کے مقام

پر جنگ ہوئی جس میں اورنگ زیب کو واضح فتح حاصل ہوئی اور شاہی لشکر میدان ہار گیا۔
اب دونوں فاتح شہزادے زیادہ اعتماد کے ساتھ آگرہ کی طرف بڑھے۔ داراشکوہ کو جب اس شکست کا علم ہوا تو اس نے اگلے مقابلے کے لئے شہزادہ سلیمان شکوہ کے فتح مند لشکر کو فوراً واپس آنے کا حکم دیا۔ لیکن اس فوج میں شامل ایک بااثر شخصیت یعنی راجا جے سنگھ جسے داراشکوہ کے ساتھ پرانی شکر رنجی تھی، نے واپسی سفر کے دوران طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کیں اور اس طرح یہ فوج وقت پر نہ پہنچ سکی اور اس کے پہنچنے سے پہلے دارا ہزیمت سے دوچار ہو چکا تھا۔

اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کے مقابلے میں فتح پانے کے بعد آگرے کا رُخ کیا اور گوالیار کے راستے بڑی سرعت کے ساتھ حوالی آگرہ میں جا پہنچا۔ ادھر سے دارشکوہ بھی عظیم لاؤلشکر کے ساتھ اس کے مقابلے پر نکلا۔ آگرہ سے آٹھ میل دُور سا موگڑھ کے مقام پر ۲۹ مئی ۱۶۵۸ء کو دونوں فوجوں میں شدید جنگ ہوئی۔ جس میں فتح اورنگ زیب کے حصے آئی اور شکست دارا کا نصیب بنی۔ دارا بھاگ کر دہلی گیا اور وہاں سے پنجاب چلا آیا۔ تاکہ یہاں سے مزید فوج بھرتی کر کے تخت وتاج کے حصول کی کوشش کر سکے۔ فتح کے بعد اورنگ زیب نے شاہجہان کو خط لکھا جس میں اس سارے قضیے کی ذمہ داری داراشکوہ کے سر ڈالی اور کہا کہ میں نے یہ سب کچھ آپ کو اس کے طلسم سے آزاد کرانے کے لئے کیا ہے۔ اس کے بعد اورنگ زیب شہر میں داخل ہوا لیکن شاہجہان نے قلعے کے دروازے بند کر لئے۔ اورنگ زیب نے قلعے کو فتح کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ تو اس نے قلعے میں جانے والی نہر کو کاٹ کر اہل قلعہ کو پانی سے محروم کر دیا۔ محصورین اس صورتِ حال کے مقابلے میں تین دن بھی نہ جم سکے اور ۸ جون ۱۶۵۸ء کو شاہجہان کے حکم سے قلعے کے دروازے کھول دیئے گئے اور ساتھ ہی بادشاہ نے اورنگ زیب کو پیغام بھیجا کہ ''تمہیں احترام شاہی ملحوظ رکھنا چاہیے'' اس کے علاوہ بادشاہ نے شہزادے کو براہِ راست ملاقات کی دعوت بھی دی۔ اورنگ زیب پہلے تو ملنے پر تیار ہو گیا، لیکن اس کے چند ساتھیوں نے اسے کہا کہ آپ اپنے کو خطرے میں نہ ڈالیں اس پر اورنگ زیب نے اپنا

ارادہ بدل دیا۔

اسیری اور وفات

اورنگ زیب نے باپ کے بارے میں فیصلہ کیا کہ اب معاملاتِ حکومت دوبارہ اس کے حوالے نہیں کرنے چاہئیں بلکہ تمام اختیارات براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے کر باپ کی عملداری کو قلعۂ آگرہ کے اندر تک ہی محدود کردے۔ چنانچہ اس نے باپ کو ایک خط لکھا جس میں اس نے اپنے اس رویے کی وجوہات بیان کیں اور یہ ثابت کیا کہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد اس نے افضل خان کو بادشاہ کی خدمت کے لئے متعین کر کے دارا کے تعاقب میں دہلی کا رخ کیا جہاں اس نے بڑی افراتفری کے عالم میں تاج پوشی کی رسم ادا کی۔ اور وہاں سے پنجاب چلا آیا۔ شاہجہان آٹھ سال تک قلعہ آگرہ میں قید رہا۔ اورنگ زیب اس کی نگرانی میں بڑی احتیاط سے کام لیتا۔ اس کے قلعے سے باہر جانے پر پابندی تھی۔ اس طویل عرصے میں شاہجہان کی بیٹی جہاں آرا ہی باپ کی تنہائی کا واحد سہارا تھی۔ اس نے اپنی شگفتہ کلامی اور پرخلوص جذبہ خدمت سے شاہجہان کی زندگی کی ان تلخیوں کو کم کرنے کی حتی الوسع کوشش کی۔ اگر وہ ان ایام میں شاہجہان کی مونس و ہمدم نہ ہوتی تو وہ بہت ہی کم عرصہ زندہ رہ پاتا۔

شاہجہان جنوری ۱۶۶۶ء میں شدید بیمار پڑ گیا۔ یونانی اور انگریزی اطباء نے مقدور بھر علاج کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اور چوہتر برس کی عمر میں ۳۱ جنوری ۱۶۶۶ء کو فوت ہو گیا۔ اور اگلے دن شاہانہ عزت و احترام کے ساتھ اپنی وصیت کے مطابق روضہ تاج محل میں اپنی ملکہ 'ممتاز محل' کی قبر کے برابر دفن ہوا۔

شاہجہان ایک سخی اور رعایا پرور بادشاہ تھا۔ اس کا ذاتی کردار بہت بلند تھا۔ اس نے کبھی شراب نہ پی۔ اس نے ملکہ ممتاز محل کی وفات کے بعد پینتیس سال تجرد کے عالم میں گزار دیئے، اور شادی نہ کی۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا۔ اور اس نے اپنے عہد میں کئی خلافِ اسلام رسوم کو ختم کیا۔ اس کا دورِ حکومت برصغیر میں مسلمان سلطنت کے انتہائی

عروج کا دور ہے۔اس کے زمانے میں مملکت کی حدود اتنی وسیع تھیں کہ جتنی اس سے پہلے یا بعد کبھی نہ ہوئیں۔اس کے عرصہ حکومت میں رعایا خوشحال تھی اور انتظامِ حکومت مستحکم۔مغل بادشاہوں میں شاہجہان کو سب سے اہم خصوصیت یہ حاصل ہے کہ اسے خوبصورت عمارتیں تعمیر کرنے کا بہت شوق تھا۔تاریخ میں وہ ''انجینیر بادشاہ'' کی حیثیت سے شہرت دوام کا مالک ہے۔اس نے کئی عمارتیں بنوائیں۔دہلی میں لال قلعہ اور جامع مسجد، آگرہ میں مقبرہ تاج محل، اور لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ، شالامار باغ اور قلعے میں شیش محل وغیرہ خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔اس کے عہد کا ایک اور شاہکار تختِ طاؤس ہے۔جو خالص اور ٹھوس سونے سے بنایا گیا، جس میں کروڑوں روپے کی مالیت کے جواہرات جڑے ہوئے تھے اور اس کی پشت پر دو مور منہ میں نفیس موتیوں کی مالائیں لئے رقص کے لئے پر تولتے دکھائے گئے ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر

(۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء)

اورنگ زیب، شاہجہان کا تیسرا بیٹا تھا، وہ ۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء کو راجپوتانہ اور گجرات کی سرحد پر واقعہ ایک مقام دوحد میں پیدا ہوا۔ یہ جگہ اجین سے سو میل اور بڑودہ سے ستر میل شمال مشرق میں ہے۔ اس وقت جہانگیر نظام شاہی ریاست کے مشہور وزیر ملک عنبر کو شکست دینے کے بعد واپس دارالسلطنت کی طرف آرہا تھا۔ شاہجہان بچے کو بادشاہ کی خدمت میں لایا۔ جہانگیر بہت خوش ہوا۔ 'اورنگ زیب' نام تجویز کیا اور بعد ازاں اجین جا کر پوتے کی پیدائش کی خوشی میں ایک بڑا جشن منایا۔ کیونکہ دوحد ایک معمولی قصبہ تھا۔ اورنگ زیب کے بچپن کا ابتدائی زمانہ شاہجہان کے ساتھ دکن کے سفروں میں گزرا۔ ۱۶۲۲ء میں جب شاہجہان نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تو یہ شہزادہ بھی باپ کے ساتھ ساتھ دیار بدیار سرگرداں رہا جس کی وجہ سے تیموری خانوادے کے روائتی انداز میں اس کے تعلیم و تعلم کا اہتمام نہ ہو سکا۔ اس کے بعد جب شاہجہان نے بادشاہ سے معافی مانگ لی، تو جہانگیر نے شاہجہان کے لڑکوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو اپنے پاس بلا لیا۔ جہانگیر ان دنوں پنجاب میں تھا۔ جونہی اورنگ زیب دادا کے پاس آیا مہابت خان نے بغاوت کر دی اور بادشاہ کو حراست میں لے لیا اور مسلسل ایک برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ انتہائی غیر معمولی صورتِ حالات تھی اور ظاہر ہے کہ ان حالات میں کسی کو بھی اورنگ زیب کی تدریس کا بندوبست کرنے کا ہوش نہ تھا۔ اس کے بعد جب شاہجہان بادشاہ ہوا تو اس وقت بھی حالات بہت ناسازگار تھے۔ شاہجہان کی تاجپوشی کے وقت یہ شہزادہ اور اس کے دو بڑے بھائی آصف خان کی سرپرستی میں لاہور میں مقیم تھے۔ حالات کی ناموافقت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ شہزادے اور آصف خان تخت نشینی کی تقریب

میں شمولیت کے لئے بھی وقت پر آگرہ نہ پہنچ سکے اور خاصی دیر بعد وہاں پہنچے۔

جب ابتلاء کے دن ختم ہو گئے اور سکون کا دور شروع ہوا تو شاہجہان نے اورنگ زیب کی تعلیم و تربیت کے لئے اعلیٰ انتظام کیا۔ شہزادے کو فیاض ازل نے بے پناہ ذہنی صلاحیتوں سے فیض یاب کیا تھا۔ چنانچہ قلیل عرصے سے ہی میں اس نے علومِ متداولہ میں کافی دسترس حاصل کر لی۔ اور جلد ہی اس کی استعداد علمی کے جوہر ظاہر ہونے لگے۔ اسے کئی انتظامی امور سپرد کئے گئے۔ جن کی انجام دہی اس نے بڑی خوبی سے کی۔ خصوصاً دکن کی مہمات میں اورنگ زیب نے بڑی جانفشانی اور قابلیت سے مغل افواج کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ اس کے بعد بلخ اور قندھار کی مہموں میں بھی اورنگ زیب نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ بعد میں دکن کے ناگفتہ بہ حالات کی اصلاح کے لئے ایک بار پھر اسے ہی بھیجا گیا۔ اس نے بڑی سرعت کے ساتھ تاج دہلی کا وقار بحال کر دیا اور اپنی تخت نشینی تک وہیں رہا۔

اورنگ زیب دکن ہی میں تھا جب دہلی سے اس کے بہی خواہوں نے اسے داراشکوہ کی پراسرار سرگرمیوں کی اطلاع دی تو اس نے اپنے سے چھوٹے بھائی مراد کو ساتھ ملا کر آگرہ کی جانب پیش قدمی کی، کیونکہ بادشاہ اس دوران داراشکوہ کی معیت میں وہاں آچکا تھا۔ راستے میں داراشکوہ کے فرستادہ جسونت سنگھ سے مقابلہ ہوا۔ اورنگ زیب کامیاب ہوا۔ اس کے بعد آگرہ کے نواح میں دارا خود مقابلے میں آیا۔ لیکن شکست کھا کر دہلی کی جانب بھاگ گیا۔ اورنگ زیب فاتح کی حیثیت سے آگرہ میں داخل ہوا۔ قلعہ مسخر کیا اور باپ کو قید کر دیا۔ ۱۰ جون ۱۶۵۸ء کو اس نے دربار منعقد کیا اور باقاعدہ تاجپوشی کے بغیر ہی امورِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ آگرہ میں اپنے بیٹے شہزادہ محمد معظم کو نائب مقرر کیا اور خود دارا کے تعاقب میں دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

مراد بخش کا انجام

آگرہ میں قیام کے دوران ہی اورنگ زیب اور اس کے حلیف بھائی مراد بخش

کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ چنانچہ جب اورنگ زیب نے اسے اپنے ساتھ دہلی چلنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ لیکن بعد میں اورنگ زیب کے پیہم اصرار پر وہ ساتھ تو ہولیا مگر اس نے یہ رویہ اختیار کیا کہ اورنگ زیب کے لشکر سے کچھ فاصلے پر عقب ہی میں رہتا۔ جب اورنگ زیب کسی جگہ پڑاؤ ڈالتا تو مراد اس سے کوس دو کوس دور ہی اتر پڑتا۔ اورنگ زیب اس کے اس طرز عمل کو اپنے آئندہ عزائم کے خلاف سمجھتا تھا۔ اور اب اس نے اس پہلو پر سوچنا شروع کیا کہ بھائی سے چھٹکارا کس طرح حاصل کیا جائے۔ جب اورنگ زیب متھرا پہنچا تو اس نے مراد بخش جو اس سے تھوڑی مسافت پر قیام پذیر ہو چکا تھا، کو بڑے نرم الفاظ میں پیغام بھیجا کہ 'مستقبل کی فوجی اور سیاسی منصوبہ بندی کے بارے میں چند اہم امور پر فوری مشورہ کرنا ہے اس لئے تم فوراً تشریف لے آؤ اور جب تک تم نہ آؤ گے میں یہاں سے آگے نہیں بڑھوں گا، اس کے علاوہ اورنگ زیب نے مراد کو بیس لاکھ روپیہ بھی بھیج دیا اور اپنے وعدے کا اعادہ کیا کہ مکمل فتح کے بعد سندھ، پنجاب اور کابل کے صوبے اس کا حصہ ہوں گے اور مال غنیمت میں سے بھی وہ ایک تہائی کا حقدار ہو گا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ 'عدم تعاون کی صورت میں ہم نہ صرف آئندہ کسی کامیابی کے اہل ہو سکیں گے بلکہ اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے، اس کو بھی کھو دیں گے۔

اورنگ زیب کی ان چکنی چپڑی باتوں اور بیس لاکھ روپے نے مراد بخش کا متزلزل اطمینان بحال کر دیا اور اس کے خدشات کا ازالہ ہو گیا۔ چنانچہ وہ مزید کسی تامل کے بغیر اورنگ زیب کے پاس چلا آیا۔ اورنگ زیب نے حسب سابق بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا اور کافی دیر تک تازہ ترین صورتِ حال پر اس کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتا رہا۔ بعد میں انہوں نے کھانا کھایا جبکہ مراد بخش نے خوب شراب بھی پی اور ہوش و حواس سے تقریباً محروم ہو کر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا تو اورنگ زیب کے پہلے سے متعین آدمیوں نے اس کے خیمے سے اس کے ہتھیار نکال لئے۔ جس وقت مراد جاگا تو اس نے اپنے آپ کو حراست میں پایا۔ اورنگ زیب نے اسے سلیم گڑھ کے قلعے میں محبوس کرنے کا حکم دیا اور پھر اسے گوالیار کے قلعے میں شاہی خاندان کے افراد کے لئے مخصوص

قلعہ میں مقید کر دیا گیا۔ جہاں بعد میں وہ قتل کے الزام میں [illegible] سے
موت سے ہمکنار ہوا۔ اس سے قبل اورنگ زیب مراد کی فوج کے تمام سرکردہ امراء کو
رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا چکا تھا۔ چنانچہ مراد کی گرفتاری پر اس کی فوج کی طرف سے
کوئی احتجاج نہ ہوا۔ اورنگ زیب نے اس کے سپاہیوں کو اپنی ملازمت میں آنے کی
پیشکش کی، جسے انہوں نے بغیر کسی لیت و لعل کے قبول کر لیا اور اس کے لشکر میں شامل ہو
گئے۔ یوں اورنگ زیب نے اپنی سیاسی بصیرت سے مستقبل میں پیش آنے والے ایک
بڑے خطرے کو ابتداء ہی میں محسوس کر کے اس سے مؤثر طور پر نمٹ لیا۔

تاجپوشی

اب اس کے سامنے بڑے حریف یعنی داراشکوہ سے عہدہ برآ ہونے کا مسئلہ تھا۔
شجاع کو وہ کمزور حریف سمجھتا تھا۔ اور دوسرے شجاع مرکزی مقامات یعنی آگرہ اور دہلی
سے کافی دور تھا۔ متھرا ہی سے اورنگ زیب نے الہ آباد پر قبضہ کرنے اور داراشکوہ کے
لڑکے سلیمان شکوہ کو روکنے کے لئے ایک بڑی فوج اپنے ایک معتمد ساتھی نصیری خان کی
قیادت میں بھیجی تاکہ شہزادہ کہیں اپنے باپ تک نہ پہنچ جائے۔ اس کے بعد اورنگ زیب
دہلی آیا لیکن دارا وہاں سے پنجاب کی جانب جا چکا تھا۔ دہلی ہی میں اورنگ زیب نے ۲۱
جولائی ۱۶۵۸ء کو بڑی عجلت میں تاجپوشی کی رسم ادا کی۔ وہ دارا کے تعاقب میں جانے کے
لئے اتنا بیتاب تھا کہ اس نے قلعہ دہلی میں جا کر تقریب تاجپوشی منعقد کرنا بھی تضیعِ اوقات
سمجھا۔ چنانچہ دہلی سے باہر ایک باغ ہی میں اس سلسلے میں بہت سادہ سی تقریب منعقد
ہوئی۔ اورنگ زیب نے ''عالمگیر'' لقب اختیار کیا اور اس کے بعد فوراً دہلی سے کوچ کیا۔

داراشکوہ کا تعاقب

اس دوران میں داراشکوہ لاہور پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس نے لاہور میں موجود
تمام سرکاری خزانے کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس سے پہلے وہ آگرے اور دہلی کے خزانوں
کا بیشتر حصہ بھی حاصل کر چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہجہان نے اپنے ذرائع سے دس اونٹ

سونے چاندی کے سکوں سے لدے ہوئے اسے بھجوائے تھے۔ اب دارا کی مالی حالت کافی مستحکم ہوگئی۔ اس کے پرانے سپاہی ادھر اُدھر سے آکر پھر اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اور دارا نے اپنے شکست خوردہ لشکر کی تنظیم نو شروع کی۔ اور جلد ہی اس نے بیس ہزار سواروں کی ایک بڑی طاقت جمع کرلی۔ اس کے علاوہ بھیرہ کے حکمران خنجر خان اور جموں کے راجا راج روپ نے بھی اس کی حمایت کا اعلان کیا۔ دارا نے اورنگ زیب و دریائے ستلج عبور کرنے سے روکنے کے لئے پانچ ہزار سواروں پر مشتمل ایک دستہ روانہ کیا۔ ایک دوسرا مضبوط دستہ دریائے بیاس سے آنے والے راستے کی حفاظت کی غرض سے بھیج دیا، لیکن دارا اور اس کے ساتھیوں پر اورنگ زیب کی اس قدر ہیبت طاری تھی کہ جونہی اس کا لشکر ستلج کے پار پہنچا، دارا کے سپاہی اس کی مزاحمت کرنے کی بجائے راہِ فرار اختیار کر گئے۔ ادھر لاہور میں دارا نے بھی اپنی منتشر جمعیت کو مجتمع کرنے کی بجائے تیرہ چودہ ہزار سواروں اور لاہور سے حاصل شدہ خزانے کے ساتھ ملتان کی طرف بھاگ جانے ہی میں مصلحت جانی۔

اورنگ زیب نے بڑے سکون سے دریائے ستلج پار کیا۔ وہ خود تو دارا کے تعاقب میں ملتان کی سمت چلا گیا اور اپنے بیٹے محمد عظیم کو لاہور پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجا۔ دارا جب ملتان پہنچا تو اس کے کئی معتمد ساتھیوں نے اس سے دغا کیا اور اس مشکل وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ان میں سید عرب خان اور شیخ موسیٰ گیلانی بھی شامل تھے۔ جنہیں دارا شکوہ نے ملتان کے صوبے میں منتظم اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ ان واقعات سے دارا بہت پریشان ہوا اور فوراً ہی بھکر چلا گیا۔ لیکن جب اُسے اورنگ زیب کی مسلسل پیش قدمی کی اطلاع ملی تو وہ یہاں سے بھی بغیر مقابلے کے پسپا ہوگیا، حالانکہ اگر وہ چاہتا تو بھکر کے قلعے میں محصور ہو کر ایک لمبی مدت تک مقابلہ کرسکتا تھا۔ کیونکہ یہ قلعہ اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ بھکر سے وہ اندرون سندھ میں نکل گیا تاکہ وہاں سے فوج بھرتی کر کے اورنگ زیب کا مقابلہ کرسکے۔

چند ہی دنوں کے بعد اورنگ زیب بھی ملتان پہنچ گیا، لیکن یہاں آکر اسے

احساس ہوا کہ وہ مرکز سے بہت دور آ چکا ہے۔ اس لئے اس نے یہاں سے واپس ہونے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے اسے یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ شجاع ایک بڑے لشکر کے ساتھ تیزی سے آگرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ اپنے ایک سربرآوردہ سردار صف شکن خان کو دارا کی سرکوبی کرنے پر مقرر کر کے لاہور چلا آیا۔ وہ ۲۲ اکتوبر ۱۶۵۸ء کو لاہور میں وارد ہوا اور باغ فیض بخش میں قیام کیا۔ اگلے دن شہزادہ محمد عظیم بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے شہر اور قلعے کا ملاحظہ کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ بادشاہ اس کے ساتھ پہلے قلعہ میں گیا، جہاں امین اللہ قلعدار نے اس کا استقبال کیا۔ اورنگ زیب نے عمارتوں وغیرہ کو بڑے غور سے دیکھا۔ اور کئی مقامات کی مزید اصلاح کا حکم دیا۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر شہر میں گھوما۔ مسجد وزیر خان میں ظہر کی نماز ادا کی اور شام کو واپس اپنے مستقر میں پہنچ گیا۔ لاہور میں اس نے ایک ہفتہ قیام کیا اور کئی انتظامی عہدوں پر تقرریاں کیں۔ خلیل خان کو لاہور میں اپنا نائب مقرر کیا۔ اور خواجہ اسماعیل کرمانی کو لاہور کا دیوان نامزد کرنے کے علاوہ خلعت بھی عطا کی۔ اس نے کشمیر کے سابق حاکم لشکر خان کو ملتان کا گورنر بنایا۔

شجاع اور جسونت سنگھ سے جنگ

دہلی واپس پہنچ کر عالمگیر نے سب سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت بختیار کاکیؒ کے مزاروں پر حاضری دی اور نذرانے پیش کئے۔ اپنے جد ہمایوں کی قبر پر بھی اپنے عقیدت مندانہ جذبات کے اظہار کے لئے گیا۔ سلطنت کی انتظامی [illegible]رتِ حال کا جائزہ لیا اور اُسے بہتر بنانے کے احکام جاری کئے۔ دہلی میں آ کر اس نے شجاع کی سرگرمیوں کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کیں۔ تقریباً ایک سال قبل شجاع اور دارا کے لڑکے سلیمان شکوہ کے درمیان جنگ میں اوّل الذکر کو شکست ہو [illegible] تھی تو اس نے اپنے آپ کو مکمل تباہی سے بچانے کے لئے شاہجہان کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا جس میں اس نے اپنے باغیانہ طرزِ عمل پر معذرت کی اور آئندہ کے لئے اطاعت گذاری کا یقین دلایا۔ یہ خط ملنے پر شاہجہان نے شجاع کو امان نامہ لکھ بھیجا۔ علاوہ ازیں اسے بنگال، پٹنہ

اور مونگیر کے علاقوں کی حاکمیت بھی دے دی گئی۔ اور سلیمان شکوہ اور راجہ سنگھ کو اس کا مزید تعاقب کرنے سے منع کر دیا گیا۔ چنانچہ شجاع نے ان علاقوں کا انتظام پھر سے سنبھال لیا۔ جب اورنگ زیب نے باپ کو قید کر کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا تو شجاع کا تقرر بھی آئینی حیثیت سے بے اثر ہو گیا۔ اس پر شجاع نے اورنگ زیب کو خط لکھا کہ بنگال اور اس کے ملحقہ علاقے میرے ہی تصرف میں رہنے دیئے جائیں۔ اورنگ زیب نے اپنی روایتی سیاسی فیاضی سے کام لیتے ہوئے اس کی درخواست نہایت مسرت سے منظور کر لی۔ اور جواباً بڑے مصالحانہ اور خوش گوار اسلوب میں خط لکھا۔ شجاع اس خط سے مطمئن ہو گیا۔ لیکن کچھ مدت بعد جب اُسے مراد کے ساتھ اورنگ زیب کے سلوک کا علم ہوا تو اس کے دل میں اورنگ زیب کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ جب اورنگ زیب اپنے اہم ترین حلیف کو دغا دے سکتا ہے تو مجھے تو وہ ہرگز زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس نے ان خدشات کے پس منظر میں اپنے مستقبل پر غور کیا۔ اس وقت ملک کی عمومی صورت یہ تھی کہ اورنگ زیب مرکز سے دور پنجاب میں دارا کا پیچھا کر رہا تھا۔ شجاع نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور بڑھ کر آگرہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن ملتان پہنچ کر اورنگ زیب کو دارالسلطنت سے مسلسل غیر حاضری سے پیدا ہونے والے خطرات کا احساس ہو گیا۔ اور وہ فوراً لاہور سے ہوتا ہوا واپس دہلی آ گیا۔ دہلی میں آ کر اس نے شجاع کے عزائم کے بارے میں تحقیقات کرائی تو اسے معلوم ہوا کہ وہ معاہدے سے منحرف ہو کر سارے ملک پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے اپنے لڑکے سلطان محمد کو شجاع کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کا فرمان بھیجا اور خود بھی ۱۲ دسمبر ۱۶۵۸ء کو اسی سمت روانہ ہو گیا تا کہ اگر شجاع آمادۂ پیکار ہو تو خود اس کا استیصال کر سکے۔

دریں اثناء شجاع راستے میں قتل و غارت کرتا ہوا بنارس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اورنگ زیب بھی اِس جگہ شہزادہ سلطان محمد اور اپنے مشہور سردار داؤد خان کے ساتھ آ کر مل گیا۔ اس نے نامہ و پیام کے ذریعے شجاع کو راہِ راست پر آنے کی تلقین کی اور اسے

بنگال وغیرہ پر قانع رہنے کا مشورہ دیا، لیکن وہ نہ مانا۔ تصادم کے امکانات واضح ہوتے گئے تو اورنگ زیب نے اپنے لشکر کو کسی بھی ہنگامی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہر وقت تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ ایک رات اورنگ زیب نے یہاں تک حکم دے دیا کہ سپاہی ہتھیار بند رہیں اور گھوڑوں سے زینیں بھی نہ اتاری جائیں۔ چنانچہ اس رات اس کے خدشات حقیقت بن کر سامنے آ گئے۔ یعنی رات کے پچھلے پہر مارواڑ کے راجا جسونت سنگھ نے اچانک شاہی لشکر پر ہلہ بول دیا۔ یہ راجا قبل ازیں داراشکوہ کی فوج میں شامل تھا۔ بعد میں اورنگ زیب سے اپنے گزشتہ رویہ کی معافی مانگ کر اس کے ہمراہ ہو گیا۔ لیکن اب اس نے عین وقت پر دھوکہ دیا اور شجاع سے ساتھ ساز باز کر کے اورنگ زیب کے لشکر پر شب خون مارا۔ اورنگ زیب کے فوجی پہلے تو اس اچانک حملے سے سراسیمہ ہو گئے مگر بعد میں جب اورنگ زیب نے خود قیادت سنبھالی تو فوج کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے۔ اور انہوں نے ثابت قدمی سے حملہ آوروں کا مقابلہ شروع کر دیا۔ جسونت سنگھ کے دستے میں شامل راجپوتوں نے شاہی لشکر میں خوب لوٹ مچائی۔ جس کے جو ہاتھ لگا لے کر چلتا بنا۔ اِس غارت گری کے بعد جسونت سنگھ اپنے جتھے کو ساتھ لے کر آگرے کی طرف چلا گیا۔

دو دِن تو اورنگ زیب نے اپنی فوج کو دوبارہ منظم و مرتب کرنے میں گزارے۔ اس دوران میں اس کے بہت سے سپاہی جو اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے۔ بھی واپس آ کر فوج میں شامل ہو گئے۔ تیسرے دن بنارس سے کچھ فاصلے پر واقع ''کھجواہ'' کے درمیان میں باقاعدہ لڑائی کا آغاز ہوا۔ پہلے توپوں نے آگ اگلی اور اس کے بعد عام معرکہ شروع ہوا جس میں دونوں طرف سے ہزاروں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ شجاع کی فوج میں تین بہت ہی عظیم الجثہ ہاتھی تھے جو دو دو تین تین من وزنی آہنی زنجیریں اپنی سونڈ میں پکڑ کر گھماتے تھے۔ ان کے حملے کی وجہ سے اورنگ زیب کی صفوں کی صفیں الٹ گئیں۔ اورنگ زیب اس پر بہت پریشان ہوا اور یہ پریشانی اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب اورنگ زیب خود بھی ان کی زد میں آ گیا۔ اس نے اپنے ماہر نشانہ بازوں کو حکم دیا کہ

فوراً ان ہاتھیوں کے فیلبانوں کو گولی مار دو۔ چنانچہ جونہی ان میں سے ایک فیلبان گولی لگنے سے گرا فوراً ہی اس کا ہاتھی دوسرے دو ہاتھیوں کے ساتھ منہ موڑ گیا۔ اب اورنگ زیب نے ایک زوردار حملہ کیا، شجاع کا لشکر میدان سے بھاگنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اورنگ زیب کو فتح حاصل ہو گئی۔ بہت سا مالِ غنیمت اس کے ہاتھ آیا۔ جس میں ایک سو چودہ توپیں، ایک سو پندرہ ہاتھی اور بہت بڑی قیمت کے ہیرے جواہرات بھی تھے۔ اورنگ زیب نے یہاں کوئی ہفتہ بھر قیام کیا۔ شہزادہ سلطان محمد کو شجاع کے تعاقب میں بھیجا تا کہ شجاع کہیں بھی قرار نہ پا سکے اور خود فوراً آگرہ کی طرف روانہ ہوا، مبادا جسونت سنگھ آگرے پر قبضہ کر کے شاہجہان کو آزاد کرا دے۔ جس سے سارا کھیل ہی بگڑ جانے کا خدشہ تھا۔ دوسرے آگرہ پر قبضہ کر لینا جسونت سنگھ کے لئے بہت آسان تھا۔ کیونکہ آگرہ سے تمام فوج شجاع کے مقابلے پر آ چکی تھی اور شہر میں فوجی قوت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اورنگ زیب بہت تیزی کے ساتھ آگرہ کی طرف بڑھا لیکن جسونت سنگھ کو آگرہ آنے کی ہمت ہی نہ ہوئی، بلکہ وہ مالوہ کی طرف چلا گیا۔ اس پر اورنگ زیب ایک مخالف کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔ اور اس کی گوشمالی کے لئے دس ہزار سواروں کا ایک دستہ محمد امین خان کی قیادت میں روانہ کیا۔ اب اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ دارا شکوہ کا تھا۔ جس سے وہ جلد از جلد نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

دارا شکوہ سے تصادم

دارا شکوہ ملتان سے بھاگا تو اس نے قندھار جانے کا ارادہ کیا لیکن اس کے اہلِ حرم اور قریبی ساتھیوں نے اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔ اور اسے ہندوستان ہی میں رہ کر حالات کا مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اب دارا نے سندھ عبور کر کے گجرات جانا چاہا تا کہ وہاں کے راجپوت قبائل سے مدد حاصل کر سکے۔ اس صبر آزما سفر میں اس کے بہت سے ساتھی اس سے الگ ہو گئے۔ جب بعد میں تعاقب کرنے والے دستوں کو اورنگ زیب نے کسی وجہ سے بلا لیا تو دارا کے مصائب میں کچھ کمی آ گئی۔ اس طرح باقی سفر اس نے قدرے اطمینان سے طے کیا۔ وہ مختلف مقامات سے ہوتا ہوا احمد آباد پہنچا۔ وہاں کے

صوبیدار شہوار خان نے بڑے عقید تمندانہ جذبات کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اپنے مکمل تعاون کی پرخلوص پیش کش کی۔ صوبیدار نے مراد بخش کی دولت اور جواہرات وغیرہ جن کی مالیت تقریباً دس لاکھ روپیہ تھی۔ دارا کی خدمت میں نذر کیے۔ اس کے علاوہ سورت اور دکن کے حکمرانوں نے بھی کافی روپیہ اور سامانِ جنگ مہیا کیا۔ اب دارا نے پھر فوج جمع کرنا شروع کی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس کے پاس بائیس ہزار سوار جمع ہو گئے۔ اس اثناء میں جسونت سنگھ نے دارا کو کئی پیغامات بھیجے جن میں اس نے اجمیر کی طرف آنے کا مشورہ دیا۔ اور لکھا کہ میں بہت بڑی تعداد میں راجپوت اور راٹھور قبائل کے افراد کو آپ کی اعانت کے لئے تیار کر چکا ہوں۔ چنانچہ اس کی باتوں پر اعتبار کرتے ہوئے دارا ۲۴ فروری ۱۶۵۹ء کو ایک بڑے لشکر اور بھاری توپخانے کے ساتھ احمد آباد سے چلا۔ یہ توپخانہ اس نے سورت سے منگوایا تھا۔ راستے میں بھی اسے جسونت سنگھ کی طرف سے برابر خط ملتے رہے۔ اور دارا بڑے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ جب وہ جودھپور کے قریب پہنچا تو جسونت سنگھ جو ان دنوں وہیں مقیم تھا، اس کے استقبال کے لئے شہر سے نکلا۔ لیکن اسی دوران میں جسونت سنگھ کے ایک قریبی رشتہ دار راجا جے سنگھ نے، جو اورنگ زیب کا بڑا منظورِ نظر امیر تھا، جسونت سنگھ کو بادشاہ کی طرف سے خط لکھا کہ "تم دارا کی حمایت کر کے غضبِ شاہی کے مستوجب قرار پاؤ گے۔ تمہارے اس عمل سے تمہارے متعلقین کی بہتری تو نہیں البتہ بربادی ضرور ہو گی۔ اس لئے تم اس سے باز آؤ۔ اگر تم دارا کی حمایت سے دست کش ہو جاؤ، تو تمہاری پچھلی خطائیں بھی معاف کر دی جائیں گی، یہ خط ملتے ہی جسونت سنگھ کی نیت بدل گئی اور وہ دارا سے ملاقات کئے بغیر ہی واپس چلا گیا۔ اس کے اِس طرزِ عمل پر دارا بہت پریشان ہوا۔ دارا نے اپنے کئی قریبی ساتھی اس کے پاس بھیجے جنھوں نے اس کی بہت کچھ منت سماجت کی لیکن وہ حمایت پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر میں دارا نے اپنے لڑکے شہزادہ سپہر شکوہ کو بھیجا۔ سپہر شکوہ نے اسے اس کے خطوط یاد دلائے اور ایفائے عہد کا احساس دلایا، لیکن جسونت سنگھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور سپہر شکوہ بھی مایوس لوٹا۔

جسونت سنگھ کی اس وعدہ خلافی کی وجہ سے داراشکوہ کی دفاعی قوت کو بہت دھچکا

لگا اور اس کی کامیابی مخدوش ہوگئی۔ دارا نے جب کوئی دوسری صورت نہ دیکھی تو مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ادھر اورنگ زیب بھی زبردست فوج کے ساتھ دارا کو روکنے کے لئے آ چکا تھا۔ دارا نے بڑھ کر اجمیر کے نواح میں دیورائے کی پہاڑیوں میں مضبوط قلعہ بندیاں بنا کر دفاعی پوزیشن اختیار کر لی۔ ناکوں پر توپیں نصب کر دیں۔ اورنگ زیب نے بھی صورتِ حال کے مطابق فوج کو منظم کیا اور زور شور سے جنگ شروع ہوگئی۔ تین دِن تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ دارا کا لشکر بہت مستحکم مورچوں میں تھا۔ اور بلندی پر ہونے کی وجہ سے اسے قابلِ ذکر برتری بھی حاصل تھی۔ اورنگ زیب نے فوج کو بڑی مہارت سے لڑایا۔ نتیجۃً چوتھے دن اورنگ زیب کی فتح کے آثار نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ دارا رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے حرم کی خواتین اور چند خاص خدام اور کنیزوں کے ساتھ احمد آباد کی طرف فرار ہوگیا۔ اور باقی سامان جو بارہ ہاتھیوں پر لدا ہوا تھا اپنے معتمد آدمیوں کے سپرد کر کے اسے فوراً احمد آباد پہنچانے کی تاکید کی۔ لیکن جنگ میں محض مادی وسائل ہی کو شکست نہیں ہوئی تھی بلکہ دارا کا مقدر بھی ہار چکا تھا۔ چنانچہ جب دارا نے احمد آباد میں پناہ گزین ہونے کی کوشش کی تو وہاں کے نئے حاکم نے اسے شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ ادھر راجا جے سنگھ کی قیادت میں شاہی فوج بڑی مستعدی سے اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ چنانچہ اب دارا کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ اس کے اہل و عیال جب راجپوتوں کے علاقوں سے گزر رہے تھے۔ تو انہوں نے ان کا تمام سامان لوٹ لیا۔ اور وہ لوگ بڑی کسمپرسی کی حالت میں دارا کے پاس پہنچے۔ اب پھر دارا نے قندھار جانے کا ارادہ کیا۔ سندھ میں اپنے ایک پرانے نمک خوار ملک جیون، جس کی اس نے ایک بار جان بھی بچائی تھی، کے پاس آ کر ٹھہرا تا کہ ان مشکل ایام میں اس سے کچھ اعانت حاصل کر سکے۔ ملک جیون نے بظاہر گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور مقدور بھر امداد کا یقین دلایا لیکن دراصل اب اس کا دِل خلوص سے خالی ہو چکا تھا۔ یہاں دارا کو ایک اور صدمۂ جانکاہ سے دوچار ہونا پڑا۔ یعنی اس کی چہیتی بیگم، نادرہ بیگم ایک طویل علالت کے بعد فوت ہوگئی، جس نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی بڑے

استقلال اور عزم سے دارا کا ساتھ دیا تھا۔ اور دارا بھی اس باوفا بیگم سے بہت متاثر تھا۔ اس کی موت سے دارا کو ناقابلِ بیان صدمہ پہنچا اور کئی دن تک سوگ نشین رہا۔ دارا نے وصیت کے مطابق بیوی کا تابوت اپنے معتمد ترین ساتھی گل محمد کی نگرانی میں لاہور بھیجا تاکہ اسے حضرت میاں میرؒ کی خانقاہ کے احاطے میں دفن کیا جاسکے۔

دارا کی اسیری اور قتل

اس دوران میں ملک جیون برابر اس تاک میں رہا کہ دارا کو گرفتار کر کے بادشاہ کے لئے خدمت انجام دے۔ اب جب دارا نے اپنے رہے سہے ساتھی بھی تابوت کے ساتھ لاہور بھیج دیئے اور خود اس کے ساتھ بہت ہی کم جانثار رہ گئے تو ملک جیون کو اپنا منصوبہ کامیاب ہوتا نظر آیا۔ چنانچہ جب دارا اپنے چند ساتھیوں اور بچے کھچے خزانے کے ساتھ قندھار کی طرف روانہ ہوا تو ملک جیون اچانک عقب سے آیا اور محسن کشی کی بدترین مثال قائم کرتے ہوئے اسے حراست میں لے لیا۔ اس نے تعاقب میں آنے والی فوج کو اپنے اس کارنامے سے مطلع کیا۔ چند دن بعد شاہی لشکر آگیا اور دارا اور اس کے لڑکے سپہر شکوہ کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ دارالسلطنت میں جب اعلان کیا گیا کہ دارا کو گرفتار کر کے لایا جارہا ہے تو دہلی کے عوام کو اس کا بہت افسوس ہوا۔ اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اس سارے المیے کا مرکزی کردار ملک جیون ہے تو لوگوں نے اس پر بہت لعنت ملامت کی۔ چند دن بعد داراشکوہ اور اس کے لڑکے کو ہاتھی پر بٹھا کر شہر میں لایا گیا۔ اور تمام اہم بازاروں میں ان کو پھرایا گیا۔ لوگ اس منظر کو دیکھ کر بڑے دل گرفتہ ہوئے۔ شہر میں پھرانے کے بعد دارا کو قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس پر ارتداد کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ اور علماء نے فتویٰ دیا کہ وہ اپنے عقائد کی بناء پر واجب القتل ہے۔ چنانچہ ۹ ستمبر ۱۶۵۹ء کو اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کا سر تو شاہجہان کے پاس آگرہ بھیج دیا گیا، جسے شاہجہان نے بغیر دیکھے تاج محل میں دفن کرا دیا، اور سر بریدہ نعش کو ہمایوں کے مقبرے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ جب دہلی کے بازاروں میں اس کی نعش کو پھرایا جارہا تھا تو وہاں

کے باشندے زار زار روتے تھے۔

دارا شکوہ مغلیہ خاندان میں سب سے زیادہ عالم فاضل شہزادہ تھا۔ اہل اللہ سے اس کو خاص اُنسیت تھی۔ حضرت میاں میرؒ سے غایت درجہ عقیدت رکھتا تھا۔ سکھ پنتھ کے چھٹے پیشوا، گورو ہرگوبند کے ساتھ اس کے بہت گہرے مراسم تھے۔ اور ان کی آپس میں اکثر و بیشتر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ کیونکہ دارا پنجاب کا نائب السلطنت ہونے کی وجہ سے اکثر لاہور آتا رہتا تھا۔

دارا کے قتل کے بعد اب اورنگ زیب کا ایک ہی قابلِ ذکر حریف باقی رہ گیا تھا یعنی دارا کا بڑا لڑکا سلیمان شکوہ، جبکہ شجاع پہلے ہی اراکان کی طرف فرار ہو چکا تھا۔ اور اب اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہ تھی۔ سلیمان شکوہ کو بھی شاہی لشکر نے مقابلے کے بعد گرفتار کر لیا اور گوالیار کے قلعے میں مقید کر دیا۔ جہاں بعد میں زہر دے کر اس کا کام تمام کر دیا گیا۔

جشنِ تاجپوشی

تمام مخالفوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اورنگ زیب نے اپنا جشنِ تاجپوشی منانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۱۵ مئی ۱۶۵۹ء کو بڑے وقار کے ساتھ تاجپوشی کی رسم ادا ہوئی۔ اورنگ زیب نے ''ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی'' لقب اختیار کیا اور نئے سکے جاری کئے۔ مدّت سے رائج بہت سی غیر اسلامی رسُوم کو منسوخ کر دیا۔ مختلف نوعیت کے تقریباً اسی محصولات ختم کرا دیئے لیکن جزیہ پھر سے نافذ کر دیا، جو اکبر کے زمانے سے معاف تھا۔ پچھلے دو سال کی خانہ جنگی کی وجہ سے امن و امان کی صورتِ حال ابتر ہو چکی تھی۔ اورنگ زیب نے اس طرف خصوصی توجہ دی۔ اس کے علاوہ اشیائے صرف کی قیمتوں کو اعتدال پر لانے کے لئے بھی کئی اقدامات کئے۔

باغیوں کی سرگرمیاں

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے ابتدائی حصے میں کئی بغاوتی ہوئیں۔ جن میں

سے سب سے پہلے موجودہ شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے افغان قبائل باغی ہوئے۔ ان قبائل کا یہ پرانا وطیرہ تھا۔ کہ وقتاً فوقتاً میدانی علاقوں میں رہنے والے عوام کو اپنی لوٹ مار کا نشانہ بناتے تھے۔ مغل حکمرانوں نے اس مشکل کا یہ حل ڈھونڈا کہ ان لوگوں کو کچھ مال وزر دے دیتے اور یہ غارتگری سے باز رہتے۔ اب ان لوگوں نے پھر اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ جب اورنگ زیب نے انہیں بزورِ قوت دبانا چاہا تو یہ اور زیادہ خطرناک صورت میں حملے کرنے لگے۔ بادشاہ نے کئی نامور مغل سرداروں کی قیادت میں ان کی سرکوبی کے لئے مہمیں بھیجیں، لیکن سب ناکام رہے۔ بالآخر بادشاہ خود پنجاب سے ہوتا ہوا حسن ابدال آباد آیا اور ان قبائل سے بات چیت کی اور انہیں کچھ دے دلا کر اپنے حق میں ہموار کر لیا اور انہوں نے اپنی یہ روش ترک کر دی۔

اِس کے بعد بھی مختلف علاقوں میں بغاوتیں ہوئیں۔ جن کو بادشاہ نے اپنے تدبر سے فرو کیا۔ ان میں اہم بغاوت راجپوتوں کی ہے۔ راجپوت اکبر کے زمانے سے مغل اقتدار کے بڑے مضبوط ستون بنے ہوئے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے عہد میں ''جزیے'' کی ادائیگی کے مسئلے پر ان کی حکومت کے ساتھ ٹھن گئی، اور اس کے بعد ان کی آپس میں صلح صفائی نہ ہو سکی۔ مغلیہ اقتدار کے زوال کے اسباب میں تاج دہلی سے راجپوتوں کی برگشتگی خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ سکھوں کے ساتھ بھی حکومت کے کئی تصادم ہوئے جن کی تفصیل گورو صاحبان کے لئے مخصوص باب میں دی جائے گی۔

اورنگ زیب کی پنجاب میں آمد

بادشاہ بننے کے بعد اورنگ زیب دسمبر ۱۶۶۲ء کے آخر میں دہلی سے پنجاب کے لئے روانہ ہوا۔ وہ ۱۰ فروری ۱۶۶۳ء کو شالامار باغ میں آکر اترا۔ ایک ہفتہ وہاں ٹھہرا اس کے بعد ۱۸ فروری کو شہر میں داخل ہوا۔ اور قلعہ میں نزول اجلال فرمایا۔ تقریباً اڑھائی مہینے لاہور میں مقیم رہنے کے بعد ۳ مئی ۱۶۶۳ء کو کشمیر کی سیاحت کے لئے روانہ ہوا۔ اس سفر میں مشہور فرانسیسی سیاح برنیر بھی بادشاہ کے ہمرکاب تھا۔ بادشاہ کشمیر کی پر کیف فضا میں

موسم گرما گزارنے کے بعد واپس دہلی چلا گیا۔

۱۶۷۰ء میں بادشاہ نے اپنے رضائی فدائی بھائی خان کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ اسی کے عہد میں اورنگ زیب کے حکم سے لاہور میں دنیا کی وسیع ترین مسجد تعمیر کی گئی۔ ۱۶۷۳ء میں بادشاہی مسجد کی بنیاد پڑی اور اس پر تقریباً چھ لاکھ روپیہ خرچ آیا۔ ۱۶۷۵ء میں امانت خان لاہور کا صوبیدار بنا اور اس کے بعد قوام الدین حاکم ہوا۔ ۱۶۸۰ء میں اورنگ زیب نے شہزادہ محمد معظم کو پنجاب میں نائب السلطنت مقرر کیا۔ بعد ازاں مکرم خان اور سپہ دار خان اس علاقے کے حکمران متعین ہوئے۔ ۱۶۹۱ء میں خانجہان پنجاب کا گورنر ہوا۔ اور اس کے بعد ایک قلیل عرصے کے لئے مہابت خان اس منصب پر فائز رہا۔ ۱۶۹۶ء میں شاہجہان کے نامور وزیر اعظم سعد اللہ خان چنیوٹی کا بیٹا حفظ اللہ خان حاکمِ پنجاب ہوا۔ جو نواب میاں خان کے نام سے مشہور تھا۔

فروری ۱۷۰۰ء میں شہزدہ محمد معظم ایک بار پھر پنجاب میں بادشاہ کی نیابت کے لئے مقرر ہوا۔ یہی شہزادہ، اورنگ زیب کے بعد بادشاہ بھی بنا تھا۔

وفات

ابتدائی دور کی بغاوتیں فرو کرنے کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے دور دراز کے علاقے فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ کچھ ہی عرصے میں تبت، آسام اور بنگال سے آگے اراکان وغیرہ فتح ہوئے۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے ساری توجہ دکن کی تسخیر پر مرکوز کر دی۔ کیونکہ وہاں مرہٹوں نے خاصی قوت پیدا کر لی تھی۔ اور وہ لوٹ کھسوٹ کی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے علاقے میں ایک افراتفری مچا رکھی تھی۔ اور عوام ان کی حرکتوں سے بہت پریشان تھے۔ اور اب مرکز سے مداخلت کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے مرہٹوں کی گوشمالی کے لئے کئی دستے بھیجے لیکن جب اس کے بھیجے گئے جرنیلوں کو کوئی واضح کامیابی نہ ہوئی تو خود دکن گیا اور تقریباً چھبیس برس تک وہیں رہا۔ اس کی ان کوششوں کے نتیجے میں سارا دکن مغل سلطنت کے زیر نگیں آ گیا۔ گولکنڈہ اور

بیجا پور کی حکومتوں نے بھی اطاعت کا اعلان کیا۔ غرض اورنگ زیب کی عمر کا بیشتر حصہ دکن ہی میں گزرا اور وہ وہیں ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو نوے برس کی عمر میں فوت ہوا اور اس کی وصیت کے مطابق اُسے دولت آباد میں شیخ برہان الدین کے مزار کی حدود میں دفن کیا گیا۔

اورنگ زیب برصغیر کے مسلمان بادشاہوں میں مدتِ حکومت کے لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہے۔ اس نے پچاس سال تک ایک کامیاب حکمران کی حیثیت میں نظم و نسق کی ذمہ داری نبھائی۔ اسے آخر دم تک امور مملکت پر مکمل گرفت حاصل رہی۔ وہ اعلیٰ پائے کا صاحبِ سیف وقلم تھا۔ اس کا سب سے اہم امتیاز مذہب سے اس کی پرخلوص وابستگی ہے۔ متعصب ہندو اور مغربی مورخ اسے ایک تنگ نظر انسان کی صورت میں پیش کرتے ہوئے اس پر ہندو کشی کا بے بنیاد الزام عائد کرتے ہیں۔ حالانکہ اورنگ زیب ایک وسیع الظرف اور نیک دل مسلمان تھا۔ اس نے کبھی ہندوؤں پر زیادتی نہ کی۔ لیکن وہ انتظامی معاملات میں کیا ہندو کیا مسلمان کسی کو بھی معاف نہ کرتا تھا۔ اور امن وامان بحال کرنے کے لئے سخت قدم اٹھاتا۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ اس نے مندروں کی تعمیر کے لئے امداد دی اور ان کی بقا کے لئے جاگیریں عطا کیں۔ اِس قسم کے تاریخی حقائق کی روشنی میں عالمگیر پر یہ الزامات بالکل لغو ثابت ہو جاتے ہیں۔

شاہ عالم بہادر شاہ

(۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء)

عالمگیر نے اپنی وفات سے قبل دو تحریریں یوں چھوڑیں، ایک خط اور دوسرا وصیت نامہ۔ وصیت نامے کے مطابق تقسیم ملک اس طرح کی گئی:

۱۔ شمال اور شمال مشرقی اضلاع معظم شاہ کو دیئے، جو کابل اور پنجاب کا گورنر تھا۔

۲۔ جنوبی اضلاع اعظم شاہ کو ملے، جو دربار میں تھا۔

۳۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستیں کام بخش کے حصے میں آئیں۔

اور یہ وصیت نامہ حمید الدین خان کے حوالے کر دیا گیا۔ لیکن اورنگ زیب کی وصیت پر کسی نے بھی عمل نہ کیا۔ باپ کی وفات کے بعد سب شہزادوں نے اپنی اپنی بادشاہت کا اعلان اور اپنے اپنے نام کا سکہ جاری کر دیا۔ تمام شہزادے اپنے جملہ وسائل مجتمع کر کے مرکز پر قبضہ کرنے کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے۔

شہزادہ معظم شاہ نے اپنے والد کی بیماری کی خبر پشاور کے قریب جمرود کے مقام پر سُنی تو وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت لاہور پہنچا۔ پنجاب کے گورنر منعم خان نے اس کے لئے جنگی ساز و سامان فراہم کیا۔ معظم ابھی لاہور میں تھا کہ ملتان سے اس کا بیٹا شہزادہ معز الدین مع فوج اور خزانے کے لاہور اپنے باپ سے آملا۔

معظم شاہ نے محرم ۱۱۱۹ھ بمطابق مارچ ۱۷۰۷ء کو اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اس وقت اس کی عمر تریسٹھ سال تھی۔ اور اس کے متعدد پوتے پوتیاں تھے۔ تخت نشینی کے وقت معظم نے ''خلد منزل شاہ عالم بہادر'' کا لقب اختیار کیا۔ اس نے تمام مساجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھنے اور سونے کا آدھ ماسہ وزنی سکہ جاری کرنے کا حکم دیا۔ علاوہ ازیں امراء وزراء اور شہزادگان کو انعامات اور خطابات عطا کئے۔ لاہور کے صوبیدار منعم

خان کو وزیر اعظم کا عہدہ اور جملۃ الملک کا خطاب دیا۔ منعم خان نے بادشاہ کو چالیس لاکھ روپیہ، پانچ ہزار سوار اور ایک بہت بڑا توپخانہ فراہم کیا تھا۔ ان امور کی انجام دہی کے بعد شاہ عالم نے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ اس سے پہلے منعم خان راستہ میں حائل تمام دریاؤں پر کشتیوں کے پل تعمیر کروا چکا تھا۔

شاہ عالم دہلی میں

جب شاہ عالم بہادر شاہ سرہند پہنچا تو وہاں کے قلعدار نے ۲۸ لاکھ روپیہ پیش کیا اور سرہند ہی میں اسے شہزادہ عظیم کا پیغام ملا کہ میں نے بیس ہزار کا لشکر جمع کر لیا ہے اور اب صرف آپ کا انتظار ہے۔ سرہند کے بعد شاہ عالم تیزی سے دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ دہلی کے قلعدار محمد یار خان نے طے کر رکھا تھا کہ تخت و تاج وارثوں کا حق ہے۔ تینوں شہزادوں میں سے جو بھی پہلے دہلی پہنچ جائے یہ امانت اس کے حوالے کر دوں گا۔ چنانچہ جب شاہ عالم دہلی کے باہر خیمہ زن ہوا تو قلعدار مذکور خزانہ کی چابیاں، ایک سو اشرفی اور دو ہزار روپیہ بطورِ نذرانہ پیش کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہوا۔ شاہ عالم نے دہلی اور آگرہ کے خزانوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ ان دونوں خزانوں کے حصول سے اس کی مالی حالت دوسرے بھائیوں کی نسبت بہتر اور مضبوط ہو گئی۔

دہلی میں شاہ عالم بہادر شاہ نے خزانے پر قبضہ کرنے کے بعد اس میں سے تیس لاکھ روپے نکلوا لئے۔ شاہ عالم کے بیٹے عظیم الشان نے تیزی کے ساتھ قلعہ آگرہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہاں سے اسے چوبیس کروڑ روپے حاصل ہوئے۔ بعد میں شاہ عالم بھی آگرہ پہنچ گیا۔

آگرہ میں جلال الدین اکبر اور شاہجہان کا جمع کردہ ایک بہت بڑا خزانہ موجود تھا۔ اس خزانے میں بعض روایات کے مطابق نو کروڑ روپے کی خالص سونے کی اشرفیاں تھیں اور چوبیس ہزار روپیہ جو شاہجہان نے ڈھلوایا تھا، بھی۔

شاہ عالم بہادر شاہ نے آگرہ پہنچ کر حکم دیا کہ چار کروڑ روپے کی مالیت کی

اشرفیاں خزانے سے نکال لی جائیں۔ بادشاہ نے تین تین لاکھ اشرفیاں سب شہزادوں میں تقسیم کر دیں۔ علاوہ ازیں امراء کو دو دو لاکھ روپے تک دیئے۔ جن لوگوں کے بقایا جات واجب الادا تھے وہ ادا کئے۔ اس کے علاوہ اس نے امراء اور تمام لشکر میں تین تین ماہ کی پیشگی تنخواہ بھی تقسیم کر دی۔ مزید براں لاہور، سرہند اور دہلی وغیرہ سے وصول شدہ تمام نذرانے اور بہت سا اپنا ذاتی روپیہ بھی اس نے فوجوں میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح ایک بڑی لشکر جمع ہو گیا۔

اعظم شاہ سے جنگ

۱۸ ربیع الاوّل ۱۱۱۹ھ کو ''جاجو'' کے میدان میں شاہ عالم بہادر شاہ اور شہزادہ اعظم شاہ کے لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ شاہ عالم بہادر شاہ خدارسیدہ اور نرم دل انسان تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دونوں جانب سے مسلمانوں کا قتل عام ہو۔ بدیں وجہ اس نے اپنے بھائی اعظم شاہ کے نام ایک خط تحریر کیا۔ جس میں باپ کی وصیت کا ذکر کیا اور کہا کہ میں تمہیں اس کی وصیت کی رو سے چار صوبے اور مزید دو صوبے اپنی طرف سے دیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ دونوں طرف مسلمانوں کا قتلِ عام ہو۔ شاہ عالم نے یہ بھی لکھا کہ اگر تمہیں اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ ہے تو بجائے اس کے کہ ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام ہو میں اور تم دونوں کسی مقررہ مقام پر زور آزمائی کر لیتے ہیں، جو جیت جائے وہ ہندوستان کا بادشاہ بن جائے۔ جب یہ پیغام شہزادہ اعظم کو ملا تو وہ آگ بگولا ہو گیا اور اس نے اپنے بھائی کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اس طرح جاجو کے میدان میں دونوں فوجوں میں جنگ کا آغاز ہوا۔ دونوں طرف سے بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھائے گئے۔ موسم اِس قدر گرم تھا کہ بہت سے سپاہی جو آہنی زرہ بکتر اور خود وغیرہ پہنے تھے جان بحق ہو گئے۔ اعظم شاہ بذاتِ خود بڑا بہادر اور جنگجو شہزادہ تھا۔ اس کی فوج میں بھی بڑے بہادر اور نامور جرنیل موجود تھے۔ گولہ باری اور شدت کی جنگ میں اعظم شاہ کی فوج کے کئی جرنیل بھی موت کی آغوش میں چلے گئے۔ اور شاہ عالم کا لشکر غالب آنے لگا۔

ذوالفقار خان نے اعظم شاہ سے عرض کیا کہ میدان سے نکل جانا چاہیے تاکہ دوبارہ منظم ہو کر مقابلہ کیا جا سکے۔ لیکن اعظم شاہ نے اس تجویز کو سختی سے رد کر دیا۔ اس پر ذوالفقار خان شہزادہ اعظم شاہ کا ساتھ چھوڑ کر گوالیار کی طرف چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی حمید الدین بھی نکل گیا۔ جسے قبل از وفات اورنگ زیب نے وصیت نامہ سپرد کیا تھا۔ بالآخر شہزادہ اعظم شاہ کے ساتھ صرف تین سو جان نثار رہ گئے باقی تمام دیکھا دیکھی میدان سے فرار ہو گئے۔ اس پر شاہ عالم کی فوج نے اعظم شاہ کو گھیر لیا۔ اعظم شاہ کے تین فیلبان اس جنگ میں کام آئے اس پر بھی اعظم شاہ نے ہمت نہ ہاری اور تن تنہا لڑتا رہا۔ اور ساتھ اپنے بیٹے عالی تبار کو جو اس کے ساتھ ہاتھی پر ہودے میں تھا۔ تیروں کی بوچھاڑ سے بچاتا رہا۔ بہت زیادہ زخمی ہونے پر شہزادہ اعظم شاہ ہود میں گر گیا۔ بہادر شاہ کا ایک جرنیل رستم دل خان اپنے ہاتھ کو بڑھا کر شہزادے کے ہودے میں داخل ہوا اور اس کا سر کاٹ کر اپنے پاس چھپا لیا۔ باقی ماندہ چند سو جان نثار فاتح فوج نے گرفتار کر لئے۔ شاہ عالم بادشاہ کی فتح کا بگل اور نقارہ بجا دیا گیا۔ رستم دل خان شاہ عالم کے پاس گیا اور اعظم کے کٹے ہوئے سر کو اپنے دامن سے نکالا اور بادشاہ کے سامنے اس کے چہرے پر بڑے غصے سے دانت کاٹے اور شاہ عالم کے ہاتھی کے پاؤں تلے ڈال دیا۔

اعظم شاہ کا تمام لشکر تباہ و برباد ہو گیا اور اس کے دو بیٹے عالی تبار اور سعید بخت اور بیدار بخت کا بیٹا بیدار دل گرفتار ہوئے۔ جب کہ تیسرا لڑکا بیدار بخت لڑتے ہوئے قتل ہوا۔ بادشاہ کو خاصا مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ جس میں بے شمار اشرفیوں، ہیرے جواہرات کے علاوہ توپخانہ اور دیگر جنگی ساز و سامان بھی تھا۔

کام بخش کا انجام

اورنگ زیب کے تیسرے بیٹے کام بخش نے بھی دوسرے شہزادوں کی طرح اپنی بادشاہی کا اعلان کر کے اپنے نام کا سکہ جاری کر دیا۔ اور کافی تعداد میں فوج بھرتی کر لی۔ شاہ عالم نے اپنے اس بھائی کے نام بھی ایک خط لکھا جس میں اسے والد کی وصیت کے

مطابق سلطنت کی تقسیم پر رضامند ہونے کے لئے کہا۔ لیکن اس نے کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ جس پر شاہ عالم دکن روانہ ہوا۔

شہزادہ کام بخش کی فوج کے تمام سر برآوردہ سرداردل سے شاہ عالم کے طرفدار بن گئے۔ اور خفیہ طور پر انہوں نے شاہ عالم کو اپنی اطاعت کا یقین بھی دلا دیا۔ یوں کام بخش کی اپنی فوج میں نفاق پیدا ہو گیا۔ حیدرآباد (دکن) کے قریب برہانپور کے میدان میں دونوں شہزادوں کی جنگ ہوئی۔ جس کے نتیجے میں شہزادہ کام بخش زخمی ہو کر گرفتار ہوا اور اس کا ایک بیٹا محی السنۃ میدان جنگ میں کام آیا۔

خود شاہ عالم نے اس کی تیمارداری کی۔ جو چیز بھی اسے کھانے کے لئے دیتے تھے وہ انکار کر دیتا تھا۔ شاہ عالم نے شوربے کا ایک پیالہ خود اپنے ہاتھ سے اسے پلانا چاہا لیکن اس نے قطعی انکار کر دیا۔ شاہ عالم نے یونانی اور یورپی جراحوں اور طبیبوں کو اس کے علاج معالجہ کے لئے مقرر کیا۔ رات کو بادشاہ پھر کام بخش کے خیمے میں اسے دیکھنے گیا۔ بادشاہ نے چند چمچے دوائی کے اپنے ہاتھ سے کام بخش کے منہ میں ڈالے اور اپنی ریشمی شال اتار کر زخمی شہزادے کو اڑا دی، کچھ ہی دیر بعد کام بخش فوت ہو گیا۔ کام بخش کے دوسرے بیٹے فیروزمند کو بھی گہرے زخم آئے اور وہ بھی ان زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جان بحق ہو گیا۔ شاہ عالم کو اپنے بھائی اور بھتیجے کے مرنے کا بہت رنج ہوا۔ شاہ عالم نے ان کو ہمایوں کے مقبرے میں دفن کیا۔

مغلیہ خاندان کے سینکڑوں قابل شہزادے، نامور جرنیل اور دانش و بینش والے اس جنگ اقتدار میں کام آئے۔ اپنے اپنوں کی گردنیں کاٹ کر غیروں کے لئے میدان صاف کر گئے۔ یہی خانہ جنگی مغلوں کے زوال کا سبب بنی۔ مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دکن میں مرہٹوں، بنگال میں انگریزوں، شمالی برصغیر میں راجپوتوں اور پنجاب میں سکھوں نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے، جو بعد میں مغلیہ سلطنت کی مکمل تباہی کا باعث بنے۔

لاہور میں آمد

شاہ عالم بہادر شاہ نے بمشکل جنگِ اقتدار سے فراغت حاصل کی تھی، کہ شمالی برصغیر میں راجپوتوں نے بغاوت کر دی۔ بندہ بیراگی نے پنجاب میں قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس نے مظفر گڑھ، کرنال، ساڈھورہ، شاہ آباد، سہارنپور، اور سرہند کے علاقوں کو روند ڈالا۔ بندہ بیراگی کی زیر کمان سکھوں کی فوج اسی ہزار گھوڑ سوار پر مشتمل تھی۔ جسے خانخانان نے شکست دے کر بھگا دیا تھا اور یہ شکست خوردہ لشکر جنگلوں میں روپوش ہو گیا تھا۔ لوہ گڑھ کی جنگ (۱۷۱۰ء) میں شکست کے بعد بندہ بیراگی خود بھی روپوش ہو گیا۔ بعد ازاں اسی سال بہادر شاہ جو سکھوں کی تباہ کاریوں کا حال سن کر اجمیر سے پنجاب کے لئے روانہ ہوا تھا، لاہور پہنچ گیا۔ بادشاہ نے لاہور میں سکھوں کے داخلے پر مکمل پابندی عائد کر دی۔ اس کے باوجود سکھ رات کے وقت راوی کو عبور کر کے آتے اور پھر واپس چلے جاتے۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش سکھوں کی مکمل بیخ کنی کے لئے بادشاہ نے مغلیہ افواج کے دستے مقرر کئے اور محمد امین خان کو ان دستوں کا کمانڈر مقرر کیا۔ اس تمام عرصے کے دوران میں بادشاہ نے لاہور میں قیام کیا۔ بابا بندہ کا مفصل حال بعد میں لکھا جائے گا۔

وفات

شہنشاہ محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ نے اکہتر سال کی عمر میں چار سال دو ماہ حکومت کرنے کے بعد ۲۱ محرم الحرام ۱۱۲۴ ہجری بمطابق ۱۹ فروری ۱۷۱۲ء کو لاہور میں وفات پائی۔ اسے دہلی میں حضرت قطب صاحبؒ کے احاطے سے باہر دفن کیا گیا۔

جہاندار شاہ

(۱۷۱۲ء تا ۱۷۱۳ء)

شاہ عالم بہادر شاہ کی وفات کے بعد چاروں شہزادے لاہور پہنچ گئے۔ شاہ عالم نے تقسیم مملکت کے ضمن میں کوئی وصیت نامہ نہیں چھوڑا تھا۔ باپ کی تجہیز و تکفین کے بعد شاہ عالم کے چاروں بیٹوں میں تقسیم مملکت کے بارے میں گفت و شنید کا آغاز ہوا۔ شہزادوں نے جنگ و جدل کے بجائے افہام و تفہیم کی راہ اختیار کی کیونکہ ان کے پیشِ نظر جاجو اور برہانپور کے خونی معرکے تھے جن میں تقریباً تمام شہزادے شریک رہے تھے۔ علاوہ ازیں ان کو اعظم شاہ اور کام بخش کے خاندانوں کی تباہی کا حال بھی معلوم تھا۔ چنانچہ دربار کے ایک مقتدر امیر ذوالفقار خان نے بڑی تگ و دو کی کہ کسی نہ کسی طرح شاہ عالم کے بیٹوں میں تصفیہ ہو جائے اور خاندان تیموری کے علاوہ مسلمانوں کا بھی قتلِ عام نہ ہو۔ جیسا کہ اس سے قبل کئی بار ہو چکا تھا۔ وہ اس کوشش میں رہا کہ کشت و خون تک نوبت نہ آئے۔ لہذا چاروں شہزادوں میں ان امور پر مسلسل ایک ہفتہ تک مراسلت جاری رہی، لیکن کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ اور یہ ساری جدوجہد بے سود ثابت ہوئی۔ اسی دوران میں ذوالفقار خان کے متعلق یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ وہ دراصل شہزادہ جہاندار شاہ کو اقتدار دلانا چاہتا ہے۔ ذوالفقار خان کے متعلق بدگمانی بڑی سرعت کے ساتھ تمام شہزادوں کے طرفداروں میں بھی پھیل گئی۔ شہزادہ جہان شاہ کے مشیروں نے تجویز پیش کی کہ ذوالفقار خان کو گرفتار کر لیا جائے۔ اس سے جہاندار ایک دور اندیش اور مدبر سیاستدان سے محروم ہو جائے گا۔ لیکن شہزادہ جہان شاہ اسے گرفتار کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اسی اثناء میں ایک اور اہم واقعہ رونما ہوا۔ ایک دن جہان شاہ کے بارود خانے کو آگ لگ گئی اور تمام گولہ بارود پل بھر میں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔ عظیم الشان نے اپنے لشکر کی جگہ تبدیل کر کے دریائے

راوی کے کنارے بودانہ کے مقام پر خیمے لگا دیئے۔ اس منتقلی کے دوران شہزادہ عظیم الشان کے تین اونٹ جن پر کپڑا، اشرفیاں اور دیگر مال و اسباب لدا ہوا تھا، جہان شاہ نے پکڑ لئے۔

ذوالفقار خان نے ایک ہفتہ تک تصفیے کی کوشش کی، لیکن وہ ناکام رہا۔ اور بعد ازاں ایک اور کوشش کی گئی تا کہ کوئی فیصلہ ہو جائے اور مسلمانوں کا خون ناحق نہ بہے۔ اس کوشش کے نتیجے میں ذیل کی تقسیم پر اتفاق رائے ہو گیا:

ا۔ شہزادہ رفیع الشان کے حصے میں ٹھٹھہ (سندھ) ملتان اور کشمیر کے صوبہ جات آئے۔

۲۔ برصغیر کا شمالی علاقہ بشمول پنجاب جہاندار کے تصرف میں چلا گیا۔

۳۔ دکن کی تمام ریاستیں اور صوبہ جات وغیرہ جہان شاہ کو ملے۔

۴۔ صوبہ جات بنگال، بہار اور اڑیسہ وغیرہ عظیم الشان کے قبضہ میں دے دیئے گئے۔

خافی خان لکھتا ہے کہ شہزادہ عظیم الشان اور جہاندار شاہ سے متعلق مملکت کی تقسیم کا فیصلہ نہ کیا گیا بلکہ انہیں اس بات کی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ باہمی رضامندی سے آپس میں سلطنت کو تقسیم کر لیں۔ خزانے کے بٹوارے کے بارے میں کوئی مصالحت نہ ہو سکی لہذا یہ منصوبہ بھی ناکام ہو گیا۔ اور تصادم کے امکانات بڑھتے گئے۔

اسی دوران ایک اور واقعے نے حالات کی سنگینی میں مزید اضافہ کیا۔ بخشی صدر الدین محمد خان صفوی شہزادہ عظیم الشان سے بات چیت کر کے اپنے لشکر میں واپس جا رہا تھا کہ شہزادہ جہان شاہ کے آدمیوں نے اسے پکڑ لیا اور قتل کر دیا۔ اس کے قتل پر شہزادہ عظیم الشان جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کے علاوہ ایک اور واقعہ اسی عرصہ میں وقوع پذیر ہوا۔ حکیم محسن خان شہزادہ رفیع الشان کا مشیر اور قابل جرنیل تھا۔ اس پر الزام لگایا گیا کہ وہ خفیہ طور پر شہزادہ عظیم الشان سے ملا ہوا ہے۔ شہزادہ رفیع الشان نے اس اطلاع پر اسے گرفتار کر لیا اور شکنجے میں الٹا کسوا کر تمام لشکر میں اُس کی تذلیل کرائی۔ تمام مال و زر جو اس

کے پاس تھے ضبط کر لیا گیا۔ لیکن یہ حکیم غدار نہیں تھا۔ بلکہ وہ اپنے لشکر کے ایک امیر سے ذاتی عناد کی بنا پر شہزادہ کے عتاب کا نشانہ بنا تھا۔

عظیم الشان بہادر شاہ کا سب سے پیارا اور لاڈلا بیٹا تھا اور اس نے باپ کی وفات کے بعد بیگماتِ حرم کی خدمت داری کا انتظام خود سنبھال لیا تھا۔ اس سے اس کا مقصد حرم کی بیگمات کی ہمدردیاں حاصل کرنا تھا۔ اس کی فوج قلعہ لاہور کے بالکل نزدیک خیمہ زن تھی اور باقی شہزادوں کی افواج شہر لاہور سے کچھ فاصلے پر قیام پذیر تھیں۔ اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ لاہور کے تمام خزانے پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور اس رقم سے ایک بہت بڑی فوج بھرتی کر لی تھی۔ قلعہ میں اپنے سر پر تاج رکھ کر تمام امراء اور وزراء سے جو لاہور کے دربار سے متعلق تھے، نذرانے قبول کئے۔ چونکہ عظیم الشان نے باقی شہزادوں کی رضامندی کے بغیر اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تھا۔ لہذا اس پر امیر الامراء ذوالفقار خان نے سخت اعتراض کیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس خزانے سے باقی تین شہزادوں کو بھی برابر کا حصہ ملنا چاہیے۔ جو عظیم الشان نے بادشاہ کی وفات کے بعد اپنے قبضے میں لے رکھا ہے۔ لیکن عظیم الشان نے یہ بات ماننے سے انکار کیا۔ اس پر شہزادوں نے لاہور کے قلعہ کے اردگرد اپنی افواج جمع کر کے توپ خانہ کے لئے دمدمے تیار کئے اور ان پر توپیں نصب کر دیں۔

شہزادہ معز الدین نے اپنی فوج کو قلعہ لاہور کی فصیل کے نیچے خیمہ زن ہونے کا حکم دیا تھا لیکن چونکہ جگہ کم تھی اس لئے فوج نے لاہور کے ایک بہت بڑے علاقے میں سے مکانات زبردستی حاصل کر لئے اور مکینوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔ اس طرح شہر کے کافی باشندے گھر سے بے گھر ہو گئے۔ اس واقعہ کے دوران میں بعض شرپسند اور گستاخ قسم کے سپاہیوں نے عورتوں سے زیادتی بھی کی اور وہ روتے بلکتے بچوں کو ساتھ لے کر گھر بار پر حسرت کی نظر ڈالتے ہوئے باہر نکل کھڑی ہوئیں۔ لاہور کے شہریوں میں اس واقعہ سے غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

اسی اثناء میں عظیم الشان نے اپنے تمام لشکر کو دریائے راوی کے کنارے منتقل کر

دیا۔شہزادے نے اپنے عقب میں دریا کو حصار خیال کرتے ہوئے فوج کو دائیں بائیں خندقیں کھودنے کا حکم دیا۔اور اپنے تمام دفاعی انتظامات مکمل کر لیے۔باقی تینوں شہزادے باہم ایک دوسرے کے اتحادی بن گئے۔حصولِ اقتدار کی یہ جنگ لاہور کے نواح میں لڑی گئی۔

عظیم الشان کی شکست

۷ اپریل ۱۷۱۲ء کو بھائیوں کے درمیان جنگ سلطانی کا آغاز ہوا۔شہزادہ عظیم الشان کے خلاف تینوں بھائیوں کی فوجیں صف آرا ہوئیں اور انہوں نے شدید گولہ باری شروع کر دی تھی۔متواتر پانچ روز تک گولہ باری ہوتی رہی تھی۔عظیم الشان کے پاس ستر ہزار فوج تھی۔جو اس نے لاہور سے حاصل کردہ خزانے کے بل بوتے پر اکٹھی کی تھی۔اس جنگ میں عظیم الشان کا توپخانہ بھی مسلسل گولہ باری کرتا رہا۔اس گولہ باری سے دونوں طرف کا بہت نقصان ہوا۔بے شمار سپاہیوں کے علاوہ متعدد نامور جرنیل بھی مارے گئے۔

میدانِ جنگ میں عظیم الشان اپنے ہاتھی پر سوار تھا کہ اچانک غائب ہو گیا۔اس کی تلاش میں چاروں طرف فوجی دستے بھیجے گئے تاکہ اس کے بارے میں کچھ معلوم کیا جا سکے۔لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا اور یہ معما آج تک لاینحل ہے۔بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگا اور دریائے راوی کو عبور کرتے ہوئے اس میں ڈوب گیا۔بعض مورخین یہ کہتے ہیں کہ دورانِ جنگ اس پر ایک بڑا بھاری قسم کا گولہ گرا جس سے اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا اور اس کی نعش کی شناخت نہ ہو سکی۔بعض مورخین کی رائے یہ ہے کہ وہ میدانِ جنگ سے فرار ہونے کے بعد روپوش ہو گیا۔اور اس نے بقیہ زندگی گمنامی میں گزار دی۔بہر حال تخت و تاج کے چار عہدے داروں میں سے ایک کا خاتمہ ہو گیا اور باقی تین رہ گئے جو فاتح بھی تھے۔وہ تمام مال و دولت جو عظیم الشان نے بنگال اور لاہور کے قلعوں سے اکٹھا کیا تھا،اس کے سپاہیوں نے لوٹ لیا۔

عظیم الشان کی ناکامی کی وجوہات

اس جنگ میں شہزادے عظیم الشان کی ناکامی کی وجوہات مختصراً درج ذیل ہیں:

۱۔ اگرچہ شہزادہ عظیم الشان کے پاس بھاری توپخانہ اور ستر ہزار فوج تھی لیکن اس نے جگہ کا انتخاب غلط کیا تھا۔ اس نے دریائے راوی کو پشت پر رکھا اور اپنے دائیں بائیں خندقیں کھود لیں۔ یوں وہ ایک طرح سے محصور ہو گیا، حالانکہ جنگ کے دوران پیش قدمی اور پسپائی دونوں صورتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن پسپائی کی صورت میں اس نے خود اپنے راستے مسدود کر رکھے تھے۔ چنانچہ اب عظیم الشان صرف پیش قدمی ہی کر سکتا تھا اور پسپائی اختیار کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس نے پسپائی کی صورت میں دریا عبور کرنے کے لئے کشتیوں کا انتظام بھی نہ کیا تھا۔

۲۔ مخالف شہزادوں کا متحدہ توپخانہ بلندی پر نصب تھا، جہاں سے وہ متواتر اور کارگر گولہ باری کر رہے تھے۔ جبکہ عظیم الشان کے لشکر کو نشیب میں ہونے کی وجہ سے زیادہ تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔

۳۔ علاوہ ازیں شہزادوں کے عقب میں شہر لاہور تھا جہاں سے وہ اشیائے خورد و نوش حاصل کر سکتا تھے۔ اور ان کی رسد کا سلسلہ برقرار تھا۔

۴۔ ذوالفقار خان اور رستم خان جیسے نامور جرنیل شہزادوں کی جانب سے برسرِ پیکار تھے۔ اور ان جرنیلوں نے متحدہ افواج کو اپنی قیادت میں لڑوایا تھا۔ انہوں نے گھوڑ سوار افواج کی مدد سے عظیم الشان کی فوج پر شدید حملہ کیا۔ وہ گولہ باری کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اور خندقوں کو عبور کر کے عظیم الشان کی فوج میں گھس گئے تھے۔ جس سے عظیم الشان کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔

۵۔ عظیم الشان کی فوج کے دو نامور جرنیل راجا لکھن چند کھتری اور راجا راج سنگھ جٹ میدانِ جنگ میں کام آئے، جس سے فوج کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ اسی طرح اُس کا بہترین جرنیل سلمان خان پنی ابھی کمک لے کر میدانِ جنگ میں داخل ہوا ہی تھا کہ اُس پر ایک گولہ گرا اور اس کے پرخچے اڑ گئے۔ یہ حادثہ بھی فوج کی مایوسی میں اضافے کا باعث بنا۔

۶۔ متحدہ شہزادوں نے عظیم الشان کے ساتھ امراء اور جرنیلوں کو لالچ دیئے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے آقا کے ساتھ غداری کی اور متحدہ فوجوں میں شامل ہو گئے اس ضمن میں سب سے زیادہ ذوالفقار خان نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے عظیم الشان کے لشکر میں شامل اپنے پرانے بہترین جرنیل ساتھیوں کو اپنی طرف راغب کرلیا۔ علاوہ ازیں کچھ دیگر امراء بھی محض دیکھا دیکھی عظیم الشان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے اور ذوالفقار خان سے مل گئے۔ اس سے شہزادہ عظیم الشان کے لشکر میں بددلی کی سی فضا پیدا ہوگئی۔ اس سے اس کی کامیابی کافی حد تک مخدوش ہوگئی۔

۷۔ لیکن ان تمام وجوہات میں سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ شہزادہ عظیم الشان میں جنگی بصیرت کا فقدان تھا۔ جبکہ دوسرے شہزادے اور ان کے ساتھ شامل امراء فنِ حرب وضرب میں بہت ماہر تھے۔

شاہ عالم کے بیٹوں میں دُوسری جنگ

جب تینوں شہزادے شہزادہ عظیم الشان کے خلاف متحد ہوئے تھے تو انہوں نے آپس میں بڑے بڑے وعدے کیئے تھے۔ لہذا عظیم الشان کی شکست کے بعد دوسرے ہی دن تینوں کے درمیان گفت وشنید شروع ہوئی۔ لیکن مغلوں کی روایت کے مطابق اب کی بار بھی معاملہ بات چیت سے حل نہ کیا جا سکا۔ کسی نے بھی اپنے وعدوں پر عمل نہ کیا۔ لہذا تینوں میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ ان شہزادوں میں چند ایک ایسی غلطیاں پیدا ہوگئی تھیں جو بعد میں دُوسری جنگ کا سبب بنیں اور مغل خاندان تباہی اور زوال کے مزید قریب پہنچ گیا۔ شہزادوں میں اتحاد کے وقت یہ طے ہوا تھا کہ فتح کے بعد تینوں خزانہ اور سلطنت آپس میں مساوی طور پر تقسیم کرلیں گے۔ لیکن جنگ کے خاتمے کے بعد جہاندار شاہ نے وعدہ ایفاء کرنے میں لیت ولعل سے کام لیا۔ ذوالفقار خان کے بیچ میں پڑنے سے یہ فیصلہ ہوا کہ خزانے کے دو حصے کیئے جائیں۔ نصف حصہ جہاندار کو اور باقی نصف کو دونوں شہزادے

باہم بانٹ لیں۔

خزانے کی مالیت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسی چھکڑے سونے کی اشرفیوں اور سو چھکڑے روپوں کے تھے۔ یہ خزانہ اس قدر زیادہ تھا کہ اسے شمار کرنے میں کئی ماہ صرف ہو جاتے۔ شہزادوں میں بات چیت ناکام ہوئی اور دوسری جنگ کی نوبت آ پہنچی۔

شہزادہ جہان شاہ نے جہاندار شاہ کے لشکر پر بڑا شدید حملہ کیا۔ جہاندار شاہ اس حملہ کی تاب نہ لاتے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا اور اس کی تمام سپاہ بھی تتر بتر ہو گئی۔ بذاتِ خود جہاندار شاہ نے ایک قریبی مقام پر چھپ کر جان بچائی، لیکن اسی اثناء میں جہان شاہ کا بڑا لڑکا فرخندہ اختر قتل ہو گیا۔ اس کی موت کا جہان شاہ پر گہرا اثر ہوا۔ اور وہ حوصلہ ہار بیٹھا۔ امراء نے اس کی بہت ہمت بندھائی، مگر اس نے کہا کہ تخت و تاج حاصل کرنے کے لئے یہ جدو جہد اس کے لئے ہی تھی، جب وہ نہیں رہا تو اب میں دنیا میں رہ کر کیا کروں گا۔ یہ کہتے ہوئے وہ پھر میدان جنگ میں کود پڑا۔ جہاندار کے بچے کھچے ساتھی ابھی تک مزاحمت کر رہے تھے۔ جس جگہ جہان شاہ کھڑا تھا اچانک وہاں ایک گولہ گرا اور جہان شاہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ اس طرح جہان شاہ کی جیتی ہوئی جنگ ہار میں بدل گئی۔ جونہی شہزادہ کے مرنے کی خبر عام ہوئی اس کی فوج بھی بھاگ کھڑی ہوئی۔ جہاندار شاہ نے فوراً اپنے لشکر کو منظم کر کے موقعے سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چونکہ اسے مکمل کامیابی حاصل ہوئی۔ شہزادہ جہان شاہ اور اس کے بیٹے فرخندہ اختر کی لاشوں کو شاہی خیمے میں رکھا گیا اور بعد ازاں ہمایوں کے مقبرے میں دفن کرنے کے لئے دہلی بھیج دیا گیا۔ خجستہ اختر کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔

شہزادہ رفیع الشان

اب شاہ عالم بہادر شاہ کے چار بیٹوں میں سے دو کے درمیان تخت و تاج کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔ ان میں سے ایک کا نام شہزادہ جہاندار شاہ اور دوسرے کا نام شہزادہ رفیع الشان تھا۔ اب ان دونوں شہزادوں میں مصالحتی گفتگو کا سلسلہ چلا۔ لیکن خانی خان کی

روایت کے مطابق ابھی بات چیت جاری تھی کہ جہاندار شاہ نے ذوالفقار خان کے کہنے پر شہزادہ رفیع الشان کے لشکر پر شبخون مارا۔ شہزادہ رفیع الشان بڑی بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس نے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ دشمنوں نے بھی تعریف کی جبکہ سیّد محمد لطیف لکھتے ہیں کہ جہاندار نے شبخون نہیں مارا تھا بلکہ ان دونوں بھائیوں میں باقاعدہ جنگ ہوئی تھی اور رفیع الشان نے بہادری سے مقابلہ کیا۔ وہ اپنا ہاتھی بڑھا کر مخالف فون کی صفوں میں گھس گیا۔ لیکن اسی دوران میں اس کا فیلبان مارا گیا۔ شہزادہ ہاتھی سے نیچے کود پڑا۔ اسے جنگ میں اتنے زخم آئے کہ وہ دوبارہ نہ اٹھ سکا۔

رفیع الشان کے تینوں بیٹوں محمد ابراہیم، رفیع الدولہ اور رفیع الدرجات بھی میدان جنگ میں زخمی ہو گئے تھے، جنہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اب میدان میں صرف جہاندار شاہ ہی رہ گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں تخت تیموری کا کوئی اور دعوے دار نہیں تھا۔ اس کے تمام مخالف یکے بعد دیگرے ختم ہو چکے تھے۔

جب جہاندار شاہ اپنے تمام مخالفوں کو ختم کر چکا تو اس نے اپنی بادشاہت کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے قلعہ لاہور میں اپنا جشنِ تاجپوشی منعقد کیا۔ لاہور میں موجود تمام امراء نے اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور نذرانے پیش کیے۔ اس کے نام کا مسجد میں خطبہ پڑھا گیا اور ملک میں سکہ رائج ہوا۔

شہزادوں کا قتل

رفیع الشان کے تینوں بیٹے میدانِ جنگ میں زخمی ہو چکے تھے۔ اور انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جہاندار شاہ نے لاہور کے عوامی دباؤ کی وجہ سے ان شہزادوں کی مرہم پٹی وغیرہ کروائی۔ لیکن جنگ کے خاتمہ کے بعد تیسرے روز اذیّت ناک طریقے سے انہیں قتل کرا دیا۔ عظیم الشان کے بڑے لڑکے شہزادہ محمد کریم نے ایک مکان میں چھپ کر جان بچائی تھی۔ لیکن جب وہ اپنی شاہی انگوٹھی کی بنا پر گرفتار ہو گیا۔ تو اسے جہاندار شاہ نے قتل کر دیا۔ جہان شاہ کا بیٹا خجستہ اختر بھی زندہ گرفتار کر لیا گیا تھا۔ بعد ازاں اس کے ساتھ بھی

وہی سلوک کیا گیا جو دیگر شہزادوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اورنگ زیب کا پوتا اور شہزادہ اعظم شاہ کا بیٹا عالی تبار خان جو جاجو کی جنگ کے دوران میں اپنے باپ کے ساتھ ہودہ میں سے گرفتار ہو کر شاہ عالم بہادر شاہ کے حضور پیش ہوا تھا اور بہادر شاہ نے اس کے ساتھ ہمیشہ بیٹوں کی طرح سلوک کیا تھا، جہان دار شاہ نے اسے بھی دوسرے شہزادوں کے ساتھ ہی قتل کر دیا۔ علاوہ ازیں اورنگ زیب کے تیسرے بیٹے کام بخش کے دولڑکے جو برہانپور کی جنگ میں گرفتار ہوئے تھے اور جنہیں بہادر شاہ نے اپنے بیٹوں کی مانند پرورش کیا تھا اور ہمیشہ ان کے ساتھ محبت سے پیش آتا تھا انہیں بھی جہاندار نے ظالمانہ طور پر تہ تیغ کرا دیا۔ لاہور میں ان شہزادوں کے علاوہ کئی سرکردہ امراء بھی قتل کئے گئے۔

لاہور میں بیش بہا انسانی جانوں کے ضیاع کے بعد جہاندار نے دہلی کا قصد کیا۔ دہلی میں بھی اس نے اپنے مخالف بیس نامور امراء کو بیدردی سے قتل کرا دیا۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

رستم دل خان، مخلص خان (ان دونوں جرنیلوں کے اعضاء کاٹنے کا حکم دیا) مہابت خان، خان زمان خان، عبدالقدیر خان، لطیف اللہ خان، حکیم الملک ہدایت اللہ خان اور جہان شاہ کے بخشی محمد علی خان کو بھی مروا دیا۔

جہاندار شاہ نے مغلیہ دربار کے ان سربرآوردہ امراء کی تذلیل و تشہیر بھی کرائی اور ان کی تمام جائیداد اور گھر بار وغیرہ کو بحق سرکار ضبط کر لیا۔ درباری امراء کے ساتھ جہاندار کے اس ناروا اور غیر انسانی سلوک کی وجہ سے وہ عوام اور باقی امراء کی ہمدردیوں سے محروم ہو گیا۔ کیونکہ عوام تو اس کے ظلم و استبداد سے متنفر تھے جبکہ امراء کو ہر وقت جان اور آبرو خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ کیا معلوم کس وقت وہ بادشاہ کے عتاب کا نشانہ بن جائیں۔ دربار میں سیاسی دھڑے بندی کا فتنہ پیدا ہو گیا اور ہر گروہ خود ہمہ مقتدر بننے کے لئے سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ جہاندار کے ان غیر دانشمندانہ اقدامات کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کے انحطاط کی رفتار تیز ہو گئی اور اب اس کا سنبھلنا مکمل طور پر مخدوش ہو گیا۔

شخصیت اور کردار

جہاندار کا عہدِ حکومت ظلم وستم اور فسق و فجور کا دور تھا۔ قاضی القضاۃ کے ہاتھ میں صراحی تھی۔ مفتی اور مولانا کے ہاتھ میں جام تھا۔ عنانِ حکومت ایک بازاری عورت لال کنور اور اس کے نااہل رشتہ داروں کے ہاتھ میں تھی۔ خود جہاندار کو انتظامِ مملکت سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ ہر وقت لہو ولعب ہی میں محو رہتا۔ جس کی وجہ سے سلطنت کی انتظامی صورتِ حال روز بروز بد سے بدتر ہوگئی۔ مرکزیت کا احترام ختم ہوگیا اور اکثر علاقوں کے صوبیدار خود مختار ہوگئے۔ دراصل مغل خاندان میں طوائف الملوکی کی ابتداء اِس بادشاہ کے زمانے سے شروع ہوئی اور دو بدو اس میں اضافہ ہوا۔ کیونکہ اِس کے بعد اس افراتفری کی صورت میں عہدہ برآ ہونے والی کوئی مضبوط شخصیت تاج دہلی کے وارث کی حیثیت سے ابھر نہ سکی۔

وفات

جہاندار شاہ نے تقریباً دس ماہ حکومت کی۔ یہ سارا عرصہ اس نے دن رات ایسے کاموں میں گزارا جن سے مغل تاج کا وقار خاک میں مل گیا۔ اس نے عوام کی بہتری اور اپنے خاندان کی نیک نامی کے لئے کوئی کام نہیں کیا۔ بالآخر عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے اپنے باپ اور بھائیوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے اس پر فوج کشی کی۔ آگرے کے قریب جنگ ہوئی جس میں جہاندار کو شکست ہوئی اور وہ دہلی کی جانب راہِ فرار اختیار کر گیا۔ لیکن بعد میں گرفتار ہوا اور تسمہ کشی کے ذریعے جنوری ۱۷۱۳ء میں اپنے انجام کو پہنچا۔

محمد فرخ سیّر

(۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء)

ابتدائی حالات

فرخ سیر شاہ عالم بہادر شاہ کا پوتا اور عظیم الشان کا بیٹا تھا۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے آخری ایام میں عظیم الشان کو بنگال سے دکن میں طلب کیا تھا۔ عظیم الشان نے بنگال سے روانہ ہوتے وقت اپنے بیٹے محمد فرخ سیر کو قائم مقام گورنر مقرر کیا تھا۔ تاکہ عظیم الشان کی عدم موجودگی میں صوبہ کے امور کی انجام دہی میں خلل نہ واقع ہو۔ عظیم الشان ابھی دکن پہنچنے نہ پایا تھا کہ شہنشاہ اورنگ زیب کا انتقال ہو گیا۔ شاہ عالم بہادر شاہ اس وقت جمرود (پشاور) میں تھا اور جب وہ لاہور اور دہلی سے ہوتا ہوا آگرہ آیا تھا تو عظیم الشان بھی اپنی بیس ہزار فوج کے ہمراہ باپ کے لشکر میں شامل ہو گیا۔

جاجو کے میدانِ جنگ میں اعظم شاہ کی شکست اور موت کے بعد عظیم الشان اپنے چچا کام بخش کے مقابلہ پر برہانپور کی جنگ میں شمولیت کے لئے دکن چلا گیا تھا۔

برہانپور کی جنگ میں شہزادہ کام بخش کو شکست دینے کے بعد جب شاہ عالم بہادر شاہ اجمیر میں قیام پزیر تھا۔ تو شمالی برصغیر پاک و ہند میں راجپوتوں کی بغاوت کو فرو کیا۔ اسی اثناء میں پنجاب میں سکھوں کے انسانیت سوز مظالم جو انہوں نے سرہند میں مسلمانوں پر ڈھائے تھے، کی فریاد لے کر زندہ بچ جانے والے چند مسلمان شاہ عالم بہادر شاہ کے پاس اجمیر میں پہنچے۔ اِس خبر کو سنتے ہی شاہ عالم دہلی اور آگرہ کو نظر انداز کرتے ہوئے عازم پنجاب ہوا۔ تو عظیم الشان بھی اپنے والد شاہ عالم کے ہمراہ پنجاب آ گیا۔ اس تمام عرصے کے دوران میں فرخ سیر بنگال ہی میں مقیم رہا۔ شاہ عالم بہادر شاہ نے فرخ سیر کو بنگال سے لاہور طلب کیا اور اس کی جگہ عزالدولہ خان خانخانان کو بنگال کا گورنر مقرر کر

دیا۔ فرخ سیر بنگال کی حکومت اس کے سپرد کر کے پٹنہ پہنچا لیکن وہ دادا کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا اور اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں محمد رفیع نامی ایک منجم نے اسے کہا تھا کہ تم لاہور مت جاؤ۔ بلکہ تمہیں اس وقت تک یہیں مقیم رہنا چاہیے جب تک خود تمہارے نام کا سکہ اور خطبہ مملکت میں رائج نہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کی بیماری اور موسم برسات کی آمد کا بہانہ کر کے پٹنہ ہی میں سکونت پذیر ہو گیا۔

فرخ سیر کو پٹنہ میں اپنے دادا شاہ عالم بہادر شاہ کی وفات کی اطلاع ملی۔ یہ اطلاع ملتے ہی اس نے اپنے باپ عظیم الشان کے نام کا خطبہ پڑھوا دیا۔ باپ کے پاس جانے کا ارادہ کیا لیکن اب پھر وہی منجم مانع ہوا کہ ابھی یہاں سے تمہارا جانا مناسب نہیں۔ سادات بارہہ کے سید حسین علی جو عظیم الشان کی طرف سے پٹنہ کا نائب صوبیدار تھا۔ مالیہ کی وصولی کے لئے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ جب کچھ دنوں کے بعد وہ واپس آ گیا تو اس نے بھی فرخ سیر کی منت سماجت کر کے عظیم الشان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اسکے بعد حسین علی نے اپنے بڑے بھائی سید عبداللہ الہ آباد کے صوبیدار کو خط لکھا اور عظیم الشان کی کامیابی کے لئے فرخ سیر کا ساتھ دینے کی درخواست کی۔ چند ہی دنوں کے بعد جب فرخ سیر کو باپ اور بھائیوں کے قتل اور جہاندار کے بادشاہ بننے کا حال معلوم ہوا تو اس نے سید بھائیوں کی بھرپور اعانت کے ساتھ اپنے بھائیوں اور باپ کا بدلہ لینے اور تخت پر قبضہ کرنے کے لئے زور شور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔

یکم جنوری ۱۷۱۳ء کو فرخ سیر نے اکبر آباد (آگرہ) کے قریب جہاندار کو شکست دی اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سید برادران نے آگرہ ہی میں اس کی تاجپوشی کی باقاعدہ تقریب منعقد کی۔ اس موقعہ پر فرخ سیر نے اپنے تمام امراء کو انعامات اور خطابات سے نوازا۔ سید حسین علی کو حسب وعدہ امیر الامراء مقرر کیا اور آگرہ میں ایک ہفتہ قیام کے بعد دہلی کو روانہ ہوا۔ جہاندار شاہ دہلی کی جانب بھاگ آیا، جہاں اس کے اپنے ہی ایک ساتھی نے اسے گرفتار کر کے فرخ سیر کو مطلع کر دیا۔ جب فرخ سیر اکبر آباد سے دہلی پہنچا تو جہاندار کو قید خانہ سے نکال کر فرخ سیر کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے

اپنے باپ اور بھائیوں کے قاتل کو تسمہ کشی کے ذریعے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود تختِ طاؤس پر جلوہ افروز ہوا۔ اب تمام اطرافِ مملکت میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا اور سکے جاری ہوئے۔

سکھوں سے مڈبھیڑ اور بندہ بیراگی کا انجام

۱۷۱۴ء میں فرخ سیر نے عبدالصمد خان کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ قبل ازیں وہ کشمیر کا صوبیدار تھا۔ بادشاہ کا فرمان ملتے ہی عارف خان کو کشمیر کا نائب مقرر کر کے عبدالصمد خان پنجاب کی جانب روانہ ہوا۔ اس کے ہمراہ قمرالدین خان، محمد امین خان اور اصغر خان بھی پنجاب آئے۔ بادشاہ نے عبدالصمد خان کا تقرر پنجاب میں سکھوں کی بڑھتی ہوئی غارت گرانہ سرگرمیوں کے سدِ باب کیلئے کیا تھا۔ جب عبدالصمد خان کشمیر سے اپنے لشکر کے ساتھ لاہور کی جانب آ رہا تھا تو راستے میں گورداسپور کے قریب سکھوں نے اچانک شاہی لشکر پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک اور شدید حملے کی وجہ سے مغلیہ لشکر میں زبردست بدنظمی پھیل گئی اور متعدد مسلمان سپاہی بھی شہید ہو گئے۔ جبکہ سکھوں کا نقصان بہت کم ہوا۔ بعض مؤرخین اس خیال سے متفق نہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب عبدالصمد خان لاہور جاتے ہوئے گورداسپور کے قریب پہنچا تو اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ مقام سکھوں کا مرکز ہے۔ اور ان کا وہ رہنما جس نے مسلمانوں کو ختم کر کے مغل حکمرانوں کا تختہ الٹنے کا تہیہ کیا ہوا ہے اور جس نے پنجاب میں ہر طرف اپنی خون آشام سرگرمیاں شروع کر رکھی ہیں، اسی گڑھی میں مقیم ہے۔ چنانچہ اگر سکھ حملہ نہ کرتے عبدالصمد سیدھا لاہور جاتا اور وہاں پہنچ کر سکھوں کے بارے میں اپنا لائحہ عمل طے کرتا، لیکن چونکہ سکھوں ہی نے پہل کرتے ہوئے اچانک حملہ کر دیا تھا لہٰذا عبدالصمد کو گڑھی کا محاصرہ کرنا پڑا۔ یہ محاصرہ تقریباً چھ ماہ تک جاری رہا۔ مغلیہ فوج نے گڑھی کو چاروں طرف سے گھیر کر محصورین کی رسد کمک کے تمام ذرائع کو بالکل مسدود کر دیا۔ جب سامان خورد و نوش ختم ہو گیا تو محصورین اپنے گھوڑے بھی کھا گئے۔ جب وہ بھی ختم ہو گئے تو گھوڑوں کی ہڈیاں بھی پیس کر کھا گئے۔

مسلمانوں میں بندہ بیراگی کے متعلق مشہور ہو گیا تھا کہ وہ بہت بڑا جادوگر ہے اور جب محصور ہو جاتا ہے تو مختلف قسم کے جانوروں کی شکل بنا کر بچ نکلتا ہے لہذا جب عبدالصمد نے گڑھی کا محاصرہ کر رکھا تھا، اس دوران میں جونہی مسلمان کسی جانور کو گڑھی کے پاس آتے جاتے دیکھتے تو فوراً تیروں کی بارش کر کے اسے ختم کر دیتے۔ آخر کار سکھ تنگ آ کر قلعہ سے باہر نکلے اور بڑی خون ریز جنگ ہوئی۔ سکھوں نے ابتداء میں تو خندق کے اس پار سے تیر برسائے۔ یہ خندق عبدالصمد خان نے قلعہ کے اردگرد کھدوائی تھی۔ بعد ازاں مسلمانوں نے سکھوں پر حملہ کر کے اُنہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا۔ اس جنگ میں تقریباً ایک ہزار سکھوں کے ساتھ بندہ بیراگی کو گرفتار کر لیا گیا اور اُسے بڑی احتیاط اور سخت پہرہ میں لاہور لایا گیا۔ جہاں اس کی تذلیل کرائی گئی۔ انہیں گدھوں پر الٹے رخ سوار کیا گیا اور ان سب کے چہروں پر سیاہی مل دی گئی۔ اس کے بعد عبدالصمد خان نے ان تمام سکھوں کو بندہ بیراگی کے ہمراہ لاہور سے اسی طرح گدھوں پر سوار دہلی روانہ کر دیا۔ جب بندہ بیراگی کو گدھے پر باندھا گیا تو اس کے متعلق لوگوں نے پھر یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ یہ کسی جانور کی صورت اختیار کر کے فرار ہو جائے گا۔ اس پر ایک مغل سپاہی نے اپنے آپ کو پیش کیا کہ اس کے ساتھ مجھے باندھ دو۔ اگر یہ بھاگنے کی کوشش کرے گا تو میں اس کے پیٹ میں خنجر گھونپ دوں گا۔ لیکن یہ تمام خدشات غلط ثابت ہوئے اور بندہ بیراگی کو دہلی پہنچا دیا گیا اور اس کے ساتھ دوسرے سکھ قیدیوں کو بھی، جن کی تعداد ساڑھے سات سو بتائی گئی ہے۔ پہلے عام سکھوں کو دہلی کے بازاروں میں سولیوں پر لٹکایا گیا اور آخر میں بندہ بیراگی کو شدید اذیتیں دے کر ہلاک کیا گیا۔ اسے قتل کرنے سے پہلے اس کے آٹھ نو سال کے لڑکے کو اس کی گود میں ذبح کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان سکھ مقتولین، خاص کر بابا بندہ سنگھ نے اس تمام عرصے کے دوران میں حیرت انگیز صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔

مصائب کا دور

فرخ سیر، سید برادران کے بل بوتے پر بادشاہ بنا تھا لیکن اب ان میں غلط

فہمیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ درباری امراء نے اپنے کوکئی دھڑوں میں منقسم کر لیا تھا۔ اس گروہ بندی کا نتیجہ مسلح تصادم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جس میں ایک سخت مقابلے کے بعد سید بھائیوں نے بادشاہ فرخ سیر کو گرفتار کر لیا۔ جب فرخ سیر نے اپنی فوج کی شکست اور سیدوں کی فوج کی فتح ہوتے دیکھی تو اپنی جان بچانے کے لئے زنانہ محل میں چھپ گیا۔ فاتح سپاہیوں نے اس کو محل سے باہر آنے کے لئے آوازیں دیں لیکن وہ نہ آیا۔ اس پر نجم الدین علی خان اور صلابت خان روہیلہ کا لڑکا سپاہیوں کو لے کر محل میں داخل ہو گئے۔ بادشاہ محل کی چھت پر تھا اور اسے اس کی والدہ اور حرم کی دوسری خواتین نے اپنے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ وہ مغل شہزادیاں سپاہیوں کے قدموں پر گر گئیں اور خدا کے نام پر منت و خوشامد کرنے لگیں کہ وہ فرخ سیر کو گرفتار نہ کریں لیکن ایسے موقعہ پر منت وزاری کون سنتا ہے۔ کارخانہ قدرت کی یہ نیرنگی باعثِ عبرت ہے کہ وہ محل جس میں مغل تاجدار کی گرج سے بڑے بڑے جری تھرا جاتے تھے آج اسی محل میں مغل شہزادیاں اپنے خاندان کے پروردوں سے مغل تاج کے وارث کے لئے زندگی کی بھیک مانگ رہی تھیں، لیکن ان کی اس آہ وفغاں کا کسی نے احساس نہ کیا بلکہ سپاہیوں نے مستورات حرم کی بے حرمتی کی اور ان کا مال واسباب اور زیورات وغیرہ سب کچھ لوٹ لیا۔ اور بادشاہ فرخ سیر کو بری بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ اور قلعے میں تریپولی کے تنگ وتاریک قید خانہ میں ڈال دیا۔ اس میں قیدیوں کے لئے کوٹھڑیاں قبرنما بنائی گئی تھیں۔ یہاں پہلے ہی کئی مغل شہزادے محبوس تھے۔ ان میں رفیع الشان کے دو لڑکے بھی تھے۔ سید بھائیوں نے ان میں سے چھوٹے شہزادے کو جیل سے نکال کر رفیع الدرجات کے نام سے تخت نشین کر دیا تھا۔ فرخ سیر کی معزولی کا واقعہ ۲۸ فروری ۱۷۱۶ء کو پیش یا۔ قید خانے میں بادشاہ فرخ سیر کو لوہے کی سلاخیں گرم کر کے اندھا کر دیا گیا۔ اور بعد ازاں اس پر زہر کا استعمال کیا گیا۔ لیکن بادشاہ پر اس زہر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بعد ازاں اسے پھر کھانے میں زہر دیا گیا تھا لیکن جب اس بار بھی زہر مؤثر ثابت نہ ہوا تو اسے تیسری بار پھر زہر پلایا گیا۔ اس بار زہر کا اثر خاطر خواہ ہوا لیکن اتنا نہیں جس سے اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرتی۔ وہ کافی دیر تک حالتِ

جان کنی میں رہا۔

جب بادشاہ بہت دیر تک جان کنی کے اس تکلیف دہ عذاب میں مبتلا رہا تو سید بھائیوں نے اس کا خاتمہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ دلسوز واقعہ ۱۶ مئی ۱۷۱۹ء کو اربابِ تاریخ کے سپرد ہوا۔ جلادوں نے رسّی سے بادشاہ کا گلا گھونٹ کر مارنا چاہا، لیکن اس نے مزاحمت کی، لہذا جلادوں نے بادشاہ کے ہاتھوں پر اتنے زور زور سے ڈنڈے مارے کہ اس کے ہاتھ بیکار ہو گئے اور اُسے ختم کر دیا گیا۔

جب فرخ سیر کا جنازہ دفن کے لئے ہمایوں کے مقبرے کی جانب لے جایا جا رہا تھا تو تین چار ہزار شہری جنازہ کے آگے آگے گریہ کناں چلے جا رہے تھے۔ اور وہ سرکاری حکام پر پتھراؤ کر رہے تھے۔ اور ملاحیاں سنا رہے تھے۔

فرخ سیر کو بے جواز اذیتیں دے کر موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد سید بھائی خود بھی اپنے انجام سے خوفزدہ رہتے۔ ان کا اطمینانِ قلب رخصت ہو گیا اور انہوں نے مصنوعی طریقوں سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ بڑے بھائی سید عبداللہ نے صحبتِ نسواں میں سکون حاصل کرنا چاہا اور چھوٹے بھائی سید حسین علی نے ضمیر کے کچوکوں پر دولت کو بطورِ مرہم استعمال کیا لیکن یہ سب کچھ سعی لا حاصل ثابت ہوا اور وہ حقیقی طمانیت سے محروم ہی رہے۔

رفیع الدرجات

(۱۷۱۹ء تا ۱۷۱۹ء)

سید بھائیوں نے شمس الدین ابوالبرکات رفیع الدرجات کو ۲۸ فروری ۱۷۱۹ء کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس وقت شہزادے کی عمر صرف بیس برس کی تھی۔ اور وہ تریپولی کے جیل خانہ میں چھ سال سے قید میں تھا۔ اور تپ دق کے مرض میں مبتلا تھا۔ سید برادران نے بغیر غسل اور حجامت کے اسی قیدیوں والے لباس ہی میں اسے تخت پر لا بٹھایا اور اس کے گلے میں مروارید کا ہار ڈال کر شہر میں اس کی بادشاہت کا فوری طور پر اعلان کروا دیا۔ اور اس کے نام کا نیا سکہ جاری کیا تاکہ امن وامان بحال اور بے چینی ختم ہو۔

انتظامی صورتِ حال بہتر ہونے کے فوراً بعد سید بھائیوں نے تمام مشہور و معروف ڈاکٹروں اور حکیموں کو نئے بادشاہ کے علاج کے لئے طلب کیا۔ لیکن قید، خراب آب و ہوا اور انتہائی ناقص غذا کی وجہ سے اس کا مرض آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا اور اسے اپنی زندگی سے بالکل مایوسی ہو گئی تھی۔ حصولِ اقتدار اور ہر قسم کے علاج معالجے کے باوجود وہ ہر وقت مغموم و متفکر رہتا۔ سید برادران اسے خوش رکھنے کی بہت کوشش کرتے لیکن رفیع الدرجات روز بروز مضمحل ہوتا گیا اور اِس کے پژمردہ دِل میں تخت و تاج کی تمنا قطعاً نہ رہی۔ اس نے سید بھائیوں سے بڑی دلعذی کیساتھ درخواست کی کہ میرے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو قید سے نکال کر میری جگہ بادشاہ بنالو۔ چنانچہ اس کے پیہم اصرار پر رفیع الدولہ کو تخت نشین کر دیا گیا۔ رفیع الدرجات اپنے بڑے بھائی کی تخت نشینی کے تین دن بعد فوت ہو گیا۔

رفیع الدولہ شاہجہان ثانی

(۱۷۱۹ء تا ۱۷۱۹ء)

رفیع الدرجات کی خواہش کے مطابق سیّد برادران نے شہزادہ رفیع الدولہ کو تریپولی کے قید خانہ سے نکال کر ۴ جون ۱۷۱۹ء کو شاہجہان ثانی کے لقب سے تخت نشین کیا اور مغل تاج کی حدودِ اختیار میں اس کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً ۲۲ برس تھی۔

رفیع الدولہ بھی محض نام کا بادشاہ تھا جبکہ تمام اختیارات سید بھائیوں کے پاس تھے۔ وہ جو چاہتے کرتے۔ ان کے اقدامات ہر قسم کی قدغن سے بے نیاز تھے۔ جبکہ رفیع الدولہ بہادر پر سابقہ بادشاہ کی مانند کسی قسم کی پابندیاں تھیں۔ بادشاہ کو امورِ سلطنت کا حق نہ تھا۔ اس کی نقل وحرکت پر مکمل پابندی تھی۔ وہ سید بھائیوں کی اجازت کے بغیر سیر شکار کے علاوہ نمازِ جمعہ کے لئے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ہر وقت سیدوں کا ایک معتمد اس کی نگرانی کے لئے موجود رہتا۔ اسے تنہائی میں کسی سے گفتگو کرنے کی بھی ممانعت تھی۔ الغرض یہ بادشاہ مکمل سید بھائیوں کے رحم وکرم پر تھا۔ وہ اس سے شاہِ شطرنج کی طرح جو چاہتے کام لیتے۔

اکبر آباد میں بغاوت

اکبر آباد کی بغاوت رفیع الدولہ کے عہد کا ایک اہم واقعہ ہے۔ یہ شورش بادشاہ رفیع الدرجات کے عہدِ حکومت کے آخری ایام میں ہوئی تھی اور اسی وجہ سے سابق بادشاہ پر اعصابی دباؤ بڑھ گیا تھا جو اس کی موت کا فوری سبب بنا۔ اِس بغاوت کا پس منظر مؤرخین اس طرح بیان کرتے ہیں کہ شہزادہ محمد اکبر نے اپنے باپ اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کی لیکن ناکام ہوا اور ایران کی طرف بھاگ گیا تو شہنشاہ عالمگیر نے اس کے تین بچوں جن

میں ایک لڑکا نیکوسیر اور دولڑکیاں تھیں، کو قلعہ آگرہ میں قید کر دیا تھا۔

شہنشاہ عالمگیر کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ نے اپنے لڑکوں رفیع الشان اور جہان شاہ سے ان لڑکیوں کی شادی کر دی تھی۔ لیکن نیکوسیر کو آزاد نہ کیا اور اس طرح ۴۰ سال اس نے قید ہی میں بسر کر دیئے۔ مترسین نامی ایک برہمن جو طبیب ہونے کی وجہ سے قلعہ میں آنا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے نیکوسیر کے علاوہ قلعہ کے دیگر افراد سے بھی راہ ورسم پیدا کر لی۔ جب اس برہمن کو نیکوسیر سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں تو اس نے نیکوسیر کو تخت نشین کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں اور آس پاس کے چھوٹے راجوں اور نوابوں کو اپنا ہم خیال بنالیا۔ جنہوں نے اسے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ لوگ اپنی سازش میں کامیاب ہوتے، سید حسین علی کو کسی طرح خبر ہو گئی۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنے ایک معتمد سمندر خان کو آگرے کا قلعہ دار بنا کر روانہ کر دیا تاکہ ان لوگوں کے منصوبے کو ناکام بنایا جا سکے۔ ادھر آگرے میں مشہور ہو گیا کہ سمندر خان نیکوسیر کو ہلاک کرنے کے احکام لے کر آیا ہے۔ اب مترسین وغیرہ نے فوراً اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ سمندر خان کے آگرہ پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے نیکوسیر کو قید سے نکالا اور تخت نشین کر دیا۔ وہاں کے قلعدار غیرت خان کو بھگا کر تمام سرکاری خزانے پر قبضہ کر لیا۔ مترسین خود وکیلِ سلطنت بن گیا اور سلطنت میں نیکوسیر کے نام کا سکہ جاری ہوا۔

آگرہ کے ان سنگین حالات کی اطلاع جب دہلی پہنچی تو سید حسین علی نے فوراً حیدر قلی خان کی قیادت میں شاہی فوج روانہ کر دی۔ حیدر قلی خان نے آگرہ پہنچ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ چند دن بعد سید حسین علی بھی آگرہ پہنچ گیا۔ یہ محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ نیکوسیر کے متعدد فوجی جرنیل شاہی لشکر سے مل گئے جس سے محصورین کی قوت میں کمی واقع ہو گئی۔ علاوہ ازیں طویل محاصرے کی وجہ سے قلعے میں خوراک کے ذخائر ختم ہو گئے۔ ان حالات میں اہلِ قلعہ نے مزید مزاحمت کو بے کار جان کر ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا اور سید حسین علی کے ایک منظورِ نظر منصب دار چوڑامل کی وساطت سے صلح کا پیغام بھجوایا۔ اور جان اور مال کی پناہ مانگی۔ قلعے اور خزانہ کی چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔ اس طرح سیّد

بھائیوں نے ۱۷۱۹ء میں دوبارہ قلعہ آگرہ پر قبضہ کرلیا۔

نیکوسیر اور اس کے متوسلین کو گرفتار کرلیا گیا۔ لیکن مترسین کو اپنے اعمال کی بناء پر جان بخشی کا یقین نہیں تھا۔ لہذا اس نے خودکشی کرلی۔

اس قلعہ میں مغل دور سے پہلے کے بادشاہوں نے کافی زر و جواہر جمع کیا تھا جن میں اکبر اور شاہجہان نے بہت اضافہ کیا۔ اِس طرح یہ خزانہ ہندوستان بھر کے تمام مالیاتی ذخیروں پر بھاری تھا۔ قلعے پر قبضے کے بعد یہ سب کچھ سید حسین علی کے براہِ راست تصرف میں آ گیا۔ اس نے اس میں جن اشیاء کو اپنے لئے منتخب کیا ان میں سے دو چیزیں بہت ہی قابل ذکر ہیں۔ یعنی شاہجہان کے حکم سے بنائی گئی چادر جو سونے کی تاروں میں مروارید کے موتی پرو کر تیار ہوئی تھی۔ یہ چادر شب جمعہ اور عرس کے موقع پر ممتاز محل کی قبر پر بچھائی جاتی تھی۔ اور دوسرے نور جہان کی ایجاد چقوں کا جوڑا۔ یہ چقیں بھی سونے کی تاروں اور بیش قیمت موتیوں سے تیار ہوئی تھیں جن کے حاشیے پر گران بہا زمرد اور یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ نقد و جنس جو اس قلعے میں تھا اس کی مالیت کا اندازہ تین کروڑ لگایا گیا ہے۔ ان سب چیزوں پر سید حسین علی نے قبضہ کرلیا اور اپنے بڑے بھائی سید عبداللہ کو اس میں سے کچھ بھی نہ دیا۔ جس پر دونوں بھائیوں میں مفاہمت کی وہ پہلے جیسی فضا نہ رہی اور ان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور یہ بدمزگی روز بروز بڑھتی گئی۔ اگرچہ بعد میں سید حسین علی نے سید عبداللہ کو کچھ دے دیا مگر اس کے دِل سے بھائی کے بارے میں کدورت ختم نہ ہوئی۔

وفات

رفیع الدولہ کی زندگی کا وہ حصّہ جس میں جسمانی اور ذہنی نشو و نما ہو رہی ہوتی ہے، قید خانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں گزرا تھا۔ جہاں کی مضرِ صحت آب و ہوا و غذا نے اس کی تندرستی کو تباہ کر دیا۔ جب اسے رہا کر کے بادشاہ بنایا گیا تو اسہال کا مرض اس کی جان کے ساتھ لگ چکا تھا۔ چنانچہ اسے اقتدار ملے ابھی صرف تین ہی مہینے ہوئے تھے

کہ اس پر مرض کا شدید حملہ ہوا۔ اگرچہ بادشاہ گر بھائیوں نے تمام دیسی اور ولائتی طبیبوں کے ذریعے اس کا مقدور سے بڑھ کر علاج کروایا مگر ہو جانبر نہ ہو سکا اور بالآخر ۱۷ ستمبر ۱۹ ۱۷ء کو فوت ہو گیا۔

روشن اختر محمد شاہ

(۱۷۲۰ء تا ۱۷۴۸ء)

ابتدائی حالات

شہزادہ روشن اختر بروز جمعۃ المبارک ۱۵ اگست ۱۷۰۲ء کو غزنی کے قریب پیدا ہوا تھا۔ یہ خجستہ اختر جہان شاہ کا فرزند تھا۔ اس شہزادہ کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی گئی۔ شہزادہ روشن اختر کی والدہ نواب قدسیہ بانو ایک بہت ہی قابل اور دُور اندیش خاتون تھی۔ سید بھائی بادشاہ رفیع الدولہ کے دائمی اور لاعلاج مرض کی وجہ سے جب بالکل مایوس ہو گئے تو انہوں نے بادشاہت کے لئے کسی دوسرے شہزادے کی تلاش شروع کر دی۔ اب ان کی نگاہِ انتخاب شہزادہ محمد شاہ پر پڑی، جو ان دنوں اپنی والدہ کے ساتھ فتح پور میں مقید تھا۔ چنانچہ سید عبداللہ نے اپنے ماموں زاد بھائی غلام علی خان کو شہزادہ روشن اختر کو لانے کے لئے فتح پور روانہ کیا۔ شہزادے کی والدہ کو جب غلام علی کی آمد کا مقصد معلوم ہوا تو اس نے اسے بہت کہا کہ ہم بادشاہت نہیں چاہتے کیونکہ جس سر پر تاج سجتا ہے وہ سر زیادہ دیر تک سلامت نہیں رہتا۔ لیکن غلام علی نے اسے بہت تسلیاں دیں۔ اور شہزادے کو ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت شہزادے کی عمر اٹھارہ برس تھی اور وہ ایک نہایت حسین اور باوقات شخصیت کا مالک نوجوان تھا۔ جب روشن اختر دہلی پہنچا تو رفیع الدولہ فوت ہو چکا تھا۔ لیکن پورے ایک ہفتے تک اس کی وفات کو عوام و خواص سے پوشیدہ رکھا گیا تاکہ انتظامِ حکومت میں خلل پیدا نہ ہو۔ ۲۵ ستمبر ۱۷۱۹ء بمطابق ۱۶ ذیقعد ۱۱۳۱ھ محمد شاہ کو تخت نشین کر دیا گیا۔ اس نے ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ اپنے لئے لقب اختیار کیا۔ چند دن بعد بادشاہ کی والدہ بھی دہلی میں آ گئی۔ اس نے اپنی اعلیٰ فراست سے سید برادران کا مکمل اعتماد حاصل کر لیا اور بڑی حکمت سے بتدریج کاروبارِ مملکت میں حصہ

لینا بھی شروع کر دیا۔

سید برادران محمد شاہ کو دہلی کی بجائے فتح پور سیکری میں رکھتے تھے۔ انہوں نے سابقہ بادشاہوں کی مانند اس پر بھی طرح طرح کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ محل میں بادشاہ کا تمام عملہ سادات بارہہ کے خاص معتمدین پر مشتمل تھا۔ اس طرح بادشاہ ہر وقت سادات کے آدمیوں میں گھرا رہتا اور اسکے معمولات میں اس کی مرضی کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ وہ تخت پر رونق افروز ضرور تھا لیکن اس کی اہمیت ایک قیدی سے زیادہ نہ تھی۔ محمد شاہ اور اس کی ماں بہت جلد اس صورت سے تنگ آ گئے اور انہوں نے سید برادران سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ مادر ملکہ نے اعتماد الدولہ محمد امین خان کو اپنے منصوبے میں شامل کیا اور دکن کے صوبیدار نظام الملک آصف جاہ سے بھی اس سلسلے میں خط و کتابت کی کیونکہ اس زمانے میں وہی ایک ایسا شخص تھا جو مغلیہ خاندان کے ساتھ بے لوث اور پرخلوص جذباتی لگاؤ رکھتا تھا۔ اور وہ دل سے مغلیہ سلطنت کی بقاء کا خواہشمند تھا۔ چونکہ وہ ایک بہادر جرنیل اور دور اندیش سیاستدان بھی تھا۔ اس لئے صرف اسی میں مغلیہ اقتدار کی متزلزل بنیادوں کو سہارا دینے کی قابلیت تھی، لیکن وہ دہلی دربار کی گھٹیا سیاست اور گروہ بندی سے تنگ آ کر دکن چلا گیا تھا۔ اور وہیں اس نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ جب آصف جاہ کو مغل دربار کی ابتری اور بادشاہ کی بے بسی و مجبوری کا علم ہوا تو وہ بہت متاثر ہوا اور اس نے ہر حال میں بادشاہ کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس مقصد کے لئے ضروری تیاریاں شروع کر دیں۔ تھوڑی ہی مدت میں اس نے خاصی قوت جمع کر لی اور تاج دہلی کی سابقہ عظمت کو بحال کرنے کے لئے دہلی کا رخ کیا۔

نظام الملک کے ارادوں کی اطلاع جب آگرہ میں سید بھائیوں کو ملی تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے جوابی تیاریاں شروع کر دیں اور غلام علی خان و عالم علی خان کی قیادت میں دو مضبوط دستے نظام الملک کو روکنے کے لئے روانہ کئے۔ برہانپور کے قریب ان کی نظام الملک کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی۔ اس معرکے میں نظام الملک کو فتح ہوئی جس سے اس کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور اس کے عزم میں مزید

استقلال آ گیا۔ اب اس نے بہت تیزی کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ادھر آگرہ میں جب نظام الملک کی فتح اور اس کی برق رفتار پیش قدمی کے حالات سید برادران کو معلوم ہوئے تو ان کو اپنا مستقبل مخدوش نظر آنے لگا۔ اور انہوں نے اس کی پیش قدمی کو پوری قوت سے روکنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ خود تو سید حسین علی خان نے محمد شاہ کو اپنے ساتھ لیا اور ایک بڑے لشکر کو ہمراہ لے کر نظام الملک کی مزاحمت کے لئے روانہ ہوا۔ اور اس نے سید عبداللہ کو دارالحکومت دہلی میں انتظام بحال رکھنے اور کمک کا بندوبست کرنے کے لئے بھیج دیا۔ لیکن جب حسین علی فتح پور سے پینتیس میل دُور تورہ کے مقام پر فروکش تھا، کہ ایک شخص میر حیدر قلی کاشغری، نظام الملک کے خلاف شکایت پیش کرنے کے بہانے اس سے آن کر ملا اور جب وہ اس کی درخواست پڑھنے میں محو تھا تو میر حیدر قلی نے اچانک خنجر نکالا اور حسین علی خان کے پہلو میں گھونپ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک اور شخص بھی حملہ آور کے ساتھ تھا۔ اس نے بھی حسین علی کو زخم لگایا جس سے وہ موقعہ پر ہی جان بحق ہو گیا۔ سارے لشکر میں سادات بارہہ کے سرخیل سید حسین علیخان کے قتل کی خبر آناً فاناً پھیل گئی اور شاہی لشکر دو حصوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو گیا۔ کافی دیر تک خون ریز لڑائی جاری رہی۔ اس جنگ میں بادشاہ محمد شاہ نے بھی تیموری شجاعت کے قابلِ قدر کارنامے سرانجام دیئے۔ اس لڑائی میں سادات کی فوج کو شکست ہوئی اور محمد شاہ کو فتح۔ سیدوں کی فوج میں شامل سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد شاہی لشکر میں شامل ہو گئی۔ مشتعل فوجی اور غیر فوجی افراد نے آگرہ میں سیدوں کے تمام گھر لوٹ لئے جن میں ایک اندازے کے مطابق تقریباً ایک کروڑ کا سامان موجود تھا۔ سید حسین علی خان کے قتل کا یہ واقعہ ۱۰ اکتوبر ۱۷۲۰ء کو ہوا۔

سید حسین علیخان کے قتل اور سادات کی ہزیمت کی خبر سید عبداللہ کو دہلی پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں مل گئی۔ اس سے سید عبداللہ بہت شکستہ خاطر ہوا اور اب اسے سادات بارہہ کے زوال کا یقین ہو گیا۔ ان سب باتوں کے باوجود بھی اس نے حوصلہ نہ ہارا اور دہلی میں جا کر جوابی کارروائی کے لئے تیاریاں کرنے لگا۔ اس نے اپنے اس اقدام کو آئینی

حیثیت دینے کے لئے رفیع الشان کے بیٹے شہزادہ محمد ابراہیم کو ابوالفتح ظہیرالدین محمد ابراہیم کے لقب سے ۱۵ اکتوبر ۱۷۲۰ء کو دہلی میں تخت نشین کر دیا۔ اور ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر سے اعتماد الدولہ محمد امین خان، بادشاہ محمد شاہ کو ساتھ لے کر دہلی کی سمت بڑھا۔ شاہ پور اور حسن پورہ کے نواح میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ ۱۶ نومبر ۱۷۲۰ء کو معرکۂ کارزار گرم ہوا۔ دو دن تک انہوں نے آپس میں خوب مقاتلہ کیا۔ بالآخر سادات کو یہاں بھی ناکامی ہوئی۔ سید عبداللہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں اس نے قید خانے میں خودکشی کر لی۔ اس طرح سادات بارہہ کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

جہاندار شاہ کے بھائیوں پر ظالمانہ سلوک کا بدلہ فرخ سیر نے لیا۔ فرخ سیر کی زیادتیوں کا انتقام سید بھائیوں نے لیا اور اعتماد الدولہ امین خان نے سادات کا استیصال کر کے فرخ سیر کے ساتھ ان کے ناروا رویے کا بدلہ چکایا۔

سید برادران اور پنجاب

سادات بارہہ اور پنجاب کے وائسرائے عبدالصمد خان کے آپس میں تعلقات کشیدہ تھے۔ عبدالصمد خان بندہ بیراگی کے خلاف کامیاب کاروائی کر کے بڑی ناموری حاصل کر چکا تھا۔ بادشاہ گر بھائی اس کی اس روزافزوں ترقی سے بہت جلتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسے مسائل میں الجھانے کے لئے قصور ضلع لاہور کے قلعدار حسین خان پٹھان کو بغاوت پر آمادہ کیا، چنانچہ اس نے نہ صرف خود محصولات کی ادائیگی سے انکار کیا بلکہ عبدالصمد خان کی طرف سے مقرر کردہ عمال کو بھی ان کے فرائض منصبی کی بجا آوری سے جبراً منع کیا۔ اس نے قطب الدین خان کو قتل کر دیا، جو عبدالصمد کی فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اور مالیہ، آبیانہ وغیرہ وصول کرنے کے بعد واپس لاہور آ رہا تھا۔ حسین خان کے آدمیوں نے اسے قتل کرنے کے بعد تمام سرکاری خزانہ بھی چھین لیا۔

جب اس افسوسناک واقعہ کی اطلاع عبدالصمد خان گورنر کو ملی تو وہ حسین خان

پٹھان کی سرکوبی کے لئے ہزار سواروں کا لشکر لے کر لاہور سے روانہ ہوا۔ چونیاں کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ جنگ کا آغاز لاہور کے توپخانے کی شدید گولہ باری سے ہوا۔ پٹھانوں نے بھی اسی شدت سے حسین خان کی قیادت میں جوابی حملہ کیا۔ وہ آگ برساتی توپوں کے اوپر سے گھوڑے پھلانگ کر لاہوری فوج پر ٹوٹ پڑے۔ اس شدید حملے کے باعث ابتدا ہی میں مغلوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان سے پسپا ہونا شروع ہو گے۔ آغر خان اپنے صرف ساٹھ سپاہیوں کے ہمراہ میدان میں ڈٹ گیا۔ جبکہ اس کے اکثر ساتھی فرار ہو چکے تھے۔ اس کے مٹھی بھر ثابت قدم ساتھیوں نے حسین خان کے حملے کو تیروں کی بارش سے روکا۔ اس کے بعد اس نے اپنے منتشر دستے کو منظم کر کے حسین خان پر زبردست حملہ کیا۔ جس وقت آغر خان کے ساٹھ ساتھی مخالفوں پر تیر برسا رہے تھے تو بہادر خان نے اپنا ہاتھی بڑی سرعت کے ساتھ حسین خان کے قلب کی طرف بڑھایا اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ حسین خان پٹھان نے بھی پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ آغر خان نے بھی اپنے حملے کا رخ مخالف فوج کے قلب کی طرف کر دیا۔ حسین خان اس دوطرفہ حملے کو روک نہ سکا۔ اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد اس کی فوج بھی میدان میں ٹھہر نہ سکی۔ اس جنگ میں پٹھانوں کے کئی جرنیل کام آئے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد حسین خان نے پھر اپنی فوج کو ترتیب دیا اور دوبارہ مقابلہ پر آ گیا۔ حسین خان کا مرشد "فقیر بیگ" ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ میدانِ جنگ میں بھی اس کے ساتھ ہاتھی کے ہودہ میں سوار تھا۔ اب کے قصوری فوج نے دو حصوں میں تقسیم ہو کر منظم حملہ کیا تھا۔ لیکن لاہوری فوج کی دوبارہ زبردست گولہ باری کے سامنے حسین خان کی فوج جم نہ سکی۔ اسی اثناء میں حسین خان کے فیل بان کو ایک تیر لگا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا اور ہاتھی میدانِ جنگ میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہودے میں ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ اور حسین خان اور فقیر بیگ دونوں مارے گئے۔ جب حسین خان کے مارے جانے کی خبر محمد شاہ بادشاہ کو دہلی میں ملی تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے مبارکباد کا پیغام گورنر لاہور کو بھجوایا، اگرچہ اس وقت بادشاہ سید بھائیوں کی گرفت میں تھا۔ عبدالصمد خان نے

آغر خان کو تلوار اور ہاتھی عنایت کیا۔ اور پانچ سو سواروں کا اضافہ کیا۔ جنہیں تنخواہ سرکاری خزانے سے دینے کا اعلان ہوا۔

اگرچہ اس سارے جھگڑے کی ابتداء سید بھائیوں کی انگیخت کی وجہ سے ہوئی تھی اور وہ اپنی سازش کی ناکامی پر بہت افسردہ بھی ہوئے لیکن انہوں نے ظاہرداری قائم رکھنے کے لئے اس فتح کے بعد عبدالصمد خان کو ''سیف الدولہ'' کا خطاب عطا کیا۔ حسین خان کی شکست کے بعد پنجاب میں امن وامان کی فضا بحال ہو گئی اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ ہی عرصے بعد بادشاہ گر سید بھائیوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

پنجاب میں امن وامان کی یہ فضا زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ قصور کی بغاوت فرو کئے ابھی کچھ ہی مدت گزری تھی کہ کشمیر میں ہندو مسلم فساد نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ کشمیر میں کئی سال سے ہندو اور مسلم قوموں میں کشیدگی بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ کشمیری مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد وہاں کے ایک عالم محبوب خان عرف عبدالنبی کی قیادت میں گورنر کشمیر میر احمد خان کے پاس حاضر ہوا اور اپنے مطالبات پیش کئے۔ جس نے ان پر ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ کیا۔ گورنر کی یقین دہانی کے بعد وفد کے ارکان واپس آ گئے لیکن اس اثناء میں مسلمانوں کے دل میں کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی۔ ایک دن جب کشمیر کا ایک اور امیر ترین ہندو برہمن مجلس رائے اپنے گھر کے باغ میں ہندوؤں کو کھانا کھلا رہا تھا تو عبدالنبی دس ہزار مسلمانوں کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اور کچھ دیر بحث مباحثہ کے بعد اس نے مسلمانوں کو ہندوؤں پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ لہذا جو بھی مسلمانوں کے سامنے آیا اسے قتل کر دیا گیا اور جو بھاگ گئے وہی زندہ بچ سکے۔ مجلس رائے نے گورنر کشمیر میر احمد خان کے گھر جا کر پناہ لی۔ اس کے بعد عبدالنبی نے شہر میں واقع ہندوؤں کے محلہ پر حملہ کر دیا اور خوب قتل وغارت کے بعد مکانوں کو آگ لگا دی۔ بعد ازاں بے شمار مسلمانوں نے گورنر میر احمد خان کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ اور محل پر اینٹ پتھر پھینکنے کے علاوہ گولیاں بھی چلائیں لیکن وہ باہر نہ نکلا۔ اور نہ ہی اس نے مجلس رائے کو بلوائیوں کے حوالے کیا۔ جب دو دن تک بلوائیوں نے محاصرہ نہ اٹھایا تو گورنر نے فوج طلب کر لی اور جب سرکاری فوج

آئی تو عبدالنبی جنگ کے لئے تیار تھا۔ لہذا جنگ کا آغاز ہوا۔ جس بازار میں گورنر کی فوج کھڑی تھی اس کے آخر میں ایک پل تھا۔ عبدالنبی کے آدمی سرکاری فوج کے عقب میں پہنچ گئے اور پل کو آگ لگا دی تا کہ وہ واپس نہ جا سکیں، اور اس کے علاوہ بازار کے دونوں اطراف میں بھی آگ لگا دی گئی۔ آتش زنی کے بعد عبدالنبی کے آدمی مکانوں پر چڑھ گئے اور فوج پر اینٹیں برسانا شروع کر دیں۔ اس جنگ میں گورنر میر احمد خان کا بھتیجا بھی جو کہ نائب کوتوال تھا، کئی ہزار سپاہیوں کے ساتھ مارا گیا لیکن محاصرہ پھر بھی ختم نہ کیا جا سکا۔ بلکہ عوام نے محل پر قبضہ کر لیا اور گورنر کو ذلیل کرنے کے بعد کشمیر سے نکال دیا۔ جو ہندو اس ہنگامہ کے دوران میں گورنر کے پاس پناہ گزین ہوئے تھیں انہیں محل سے گھسیٹ کر نکالا گیا اور ان کے کان ناک کاٹ دیئے اور بعض کو مختوق کر دیا۔

چند روز بعد مسلمانوں نے باہمی اتفاق رائے سے میر احمد خان کی جگہ محبوب خان عرف عبدالنبی کو گورنر مقرر کر دیا۔ وہ اس عہدہ پر تقریباً پانچ ماہ تک رہا۔ اس نے اسلامی اسلوب جہانبانی کو اپنایا۔ وہ امورِ سلطنت کے متعلق تمام فیصلے مسجد میں بیٹھ کر کرتا اور عدل و انصاف کرتا۔ ملک میں اسلامی قوانین نافذ کئے۔ ان کارناموں کی بدولت وہ عوام میں بہت زیادہ مقبول ہو گیا۔ اور عوام اسے دیندار خان کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

جب کشمیر کے اس ہنگامہ کی اطلاع دہلی پہنچی تو وہاں سے مومن خان کو کشمیر کا صوبیدار مقرر کر کے روانہ کیا گیا تا کہ وہ وہاں کی دگرگوں صورتِ حال کو بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ جب مومن خان کی آمد کی اطلاع عبدالنبی کو ملی تو وہ بہت پریشان ہوا۔ اور آخر اس نے فیصلہ کیا کہ نئے گورنر کا استقبال کیا جائے لیکن مومن خان نے اس کی خطاؤں کو معاف نہ کیا اور اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے دونوں جوان بیٹوں کو اس کے سامنے ہلاک کرنے کے بعد خود اسے بھی قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے ساتھیوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ ہزاروں قتل ہوئے۔ بہت سوں کو اندھا کر دیا گیا۔ اور ان لوگوں کے گھر بار کو بحق سرکار ضبط کیا گیا۔ بہر حال کافی زیادہ خون ریزی کے بعد کشمیر میں امن عامہ کی

صورتِ حال پر قابو پا لیا گیا۔ اور وہاں کے عوام ایک بار پھر اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔

قصور اور کشمیر کے واقعات کے بعد پنجاب میں مسلسل اکیس برس تک مکمل امن و سکون رہا۔ اس سارے عرصے میں پنجاب کا وائسرائے نواب عبدالصمد خان دلیر جنگ، سیف الدولہ بہادر تھا۔ اس کی وفات ۱۷۳۷ء میں ہوئی۔ اور اس کے بعد بادشاہ محمد شاہ نے مرحوم گورنر کے بیٹے نواب زکریا خان کو لاہور اور ملتان کی حاکمیت کا فرمان اور خلعت روانہ کیا۔ زکریا خان بھی اپنے باپ کی مانند قابل سیاستدان اور باعزم سپہ سالار تھا۔ عبدالصمد خان نے تقریباً ۲۱ برس تک بڑی کامیابی سے پنجاب پر حکومت کی۔ اس نے سکھوں کی سرکوبی پر خصوصی توجہ دی۔ اس کے ان اقدامات کی وجہ سے پنجاب سکھوں سے پاک ہو گیا۔ یہاں تک کہ سکھ ماجھے کے علاقے میں بھی نظر نہیں آتے تھے، جو ان کا خاص گڑھ تھا۔ عبدالصمد خان نے ایک لمبے عرصے تک پنجاب پر تقریباً خودمختار حیثیت سے حکومت کی۔ وہ برائے نام تاج دہلی کا ماتحت تھا۔ اس زمانے میں دربار دہلی کی حالت بھی بڑی دگرگوں تھی۔ تاج دہلی کی عظمت تاریخ کے اوراق کہنہ کا حصہ بن چکی تھی۔ تمام صوبے مرکز کی حقیقی اطاعت سے گریز اختیار کر چکے تھے۔ دربار کے تقریباً سارے امراء مختلف گروہوں میں بٹ کر خود سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے جوڑ توڑ میں مصروف تھے۔ ان میں سے بعض تو بیرونی طاقتوں سے بھی تعلقات استوار کئے ہوئے تھے۔ اس قسم کے حالات کی وجہ سے بیرونی مداخلت یقینی ہو گئی۔ اور بالآخر ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ ایرانی نے حملہ کر کے مغل دربار کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی۔ یہ واقعہ نواب زکریا خان کے دور کے آغاز میں پیش آیا۔

نادر شاہ کا حملہ

نادر شاہ کا اصل نام ''نادر قلی'' تھا۔ وہ ترکمانوں کے ایک قبیلے افشار سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ خراسان کے صدر مقام مشہد سے پچاس میل شمال میں واقع دستگرد نامی قلعہ میں دسمبر ۱۶۸۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ امام قلی خان اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ نادر قلی ابھی بچہ ہی تھا کہ امام قلی خان کا انتقال ہو گیا۔ بعد ازاں قلعہ اور قبیلہ کی سرداری نادر قلی کے نام سے اس کے چچا نے اپنے ذمہ لی۔ جب نادر شاہ جوان ہوا اور اسے سرداری کی پیشکش کی گئی تو اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور مشہد میں امام علی کے پاس معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا۔ اپنی محنت اور خداداد قابلیت کی بنا پر وہ ایک فوجی دستے کا سردار بن گیا۔ وہ ازبکوں سے جنگ میں گرفتار ہو کر چار سال تک قید میں رہا۔ لیکن وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ رہائی کے بعد نادر قلی ایک سردار بابل علی بیگ کا ملازم ہو گیا۔ اور چند سال ملازمت کرنے کے بعد سردار کی بیٹی کو اغوا کر کے فرار ہو گیا تھا۔ اسی کے بطن ہی سے رضا قلی مرزا پیدا ہوا اور اب نادر شاہ نے چند ڈاکوؤں کو ساتھ ملا کر لوٹ مار اور قتل وغارت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

اسی زمانے میں نادر قلی کی بہادری اور شجاعت کی شہرت سن کر خراسان کے حکمران نے اسے اپنی فوج میں بھرتی کر لیا تھا۔ جہاں ازبکوں کے خلاف جنگ میں نادر قلی نے اپنی شجاعت اور مردانگی کے جوہر دکھائے۔ اس کامیابی کے بعد حاکم خراسان نے اسکی بہادری اور تدبر سے متاثر ہو کر اسے اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا تھا۔ نادر قلی بچپن ہی سے مجرمانہ ذہنیت کا مالک تھا۔ یہاں بھی اس نے اپنی انہیں مجرمانہ عادات کی وجہ سے حاکم خراسان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تو اس نے اسے سزا دینے کے بعد شہر بدر کر دیا۔

نادر قلی حاکم خراسان کے سلوک سے اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ اسے کسی کی

ملازمت کرنے سے سخت نفرت ہوگئی۔ اب اس نے دوبارہ لوٹ مار اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ نادر قلی کے ساتھ بڑی تعداد میں فوجی بھگوڑے آ کر شامل ہو گئے۔ تھوڑی ہی مدت میں تین ہزار گھوڑ سواروں نے اس کی معیت میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا اور وہ اس علاقے کی ایک قابلِ ذکر طاقت بن گیا۔ افغان اِن دنوں ایران پر اکثر حملے کرتے رہتے تھے اور انہوں نے ایران کا ایک وسیع علاقہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ صفوی خاندان زوال پذیر تھا۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ طہماسپ افغانوں کے حملوں سے تنگ آ کر اپنی افواج کے ہمراہ ان کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ نادر قلی بھی اپنے تین ہزار جری اور خونخوار جوانوں کے ساتھ طہماسپ کی فوج میں شامل ہو گیا۔ اور افغانوں کو عبرتناک شکست دی۔ نادر قلی نے افغانوں کو نہ صرف ایران سے نکال دیا تھا بلکہ بعض اہم افغانی مقامات پر بھی قبضہ کر لیا۔ نادر قلی نے روسی حملہ آوروں کو بھی بحیرہ کیسپین کے کنارہ پر شکست فاش دے کر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا عربوں کو اس نے اسی جگہ روک دیا تھا جہاں سے انہوں نے پیش قدمی کا آغاز کیا۔ اس نے ۱۷۲۸ء میں غلجیوں کو شکست دی۔ ۱۷۲۹ء میں بلوچیوں کو صوبہ کرمان سے نکال کر باہر کیا۔ جنہوں نے ایران کی کمزور حکومت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کرمان اور قندھار پر قبضہ کر لیا تھا۔ نادر قلی خان نے ۱۷۲۹ء میں ترکوں سے تبریز چھین لیا۔ بعد ازاں اس نے ابدالی قبائل سے خراسان بھی خالی کروالیا۔ اور انہیں ایران سے مار بھگایا۔ علاوہ ازیں ۱۷۳۱ء میں ہرات پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا۔ ہرات کا محاصرہ تقریباً دس ماہ جاری رہا۔ اس معرکے میں ابدالی اور خلجی اپنی متحدہ طاقت کے باوجود نادر قلی کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ بعد ازاں نادر نے ملتان کے سدوزئی قبائل کے حکمرانوں سے ۱۷۳۱ء میں فوجی اتحاد کر لیا۔ ملتانی حکمران نادر شاہ کے بہترین دوست ثابت ہوئے۔

شاہ طہماسپ ۱۷۲۲ء میں تخت نشین ہوا۔ اور دس سال حکمرانی کرنے کے بعد ۱۷۳۲ء میں انتقال کر گیا تھا۔ اس کے بعد شاہ عباس سوم ایرانی تخت پر جلوہ گر ہوا۔ شاہ عباس چار سال حکومت کرنے کے بعد ۱۷۳۶ء میں فوت ہوا۔ اس دوران میں ایرانی

دربار میں نادرشاہ کا اثر ونفوذ بہت بڑھ گیا اور تمام اختیارات اسی کی ذات میں مرکوز ہو گئے۔شاہ عباس کے بعد تمام امراء میں صرف وہی حکومت سنبھالنے کا اہل تھا۔ان تمام امراء نے متفقہ طور پر اسے حکومت سنبھالنے کی دعوت دی۔

پنجاب پر حملہ کی وجوہات

پنجاب پر نادری حملے کی وجوہ کے بارے میں مؤرخین مختلف آراء رکھتے ہیں۔
بعض کا خیال ہے کہ نادرشاہ نے شمالی پاک وہند پر حملہ محض لوٹ مار کی غرض سے کیا تھا لیکن تمام مؤرخین کا دوسرا گروہ اس رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے حملہ کی متعدد وجوہات بیان کرتا ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ نادرشاہ نے افغانوں، خلجیوں، بلوچوں، ترکوں، روسیوں، عربوں اور رومیوں وغیرہ سبھی غیر ملکیوں کو ایران کے علاقوں سے مار بھگایا تھا لیکن ان میں سے اکثر لوگ پنجاب اور دہلی دربار سے وابستہ ہو گئے تھے۔اور جو لوگ پنجاب میں آباد ہوئے تھے وہ سرحدی علاقوں میں آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کر دیتے جس سے نادرشاہ کو اندرونی امن وامان اور نظم ونسق کو مستحکم کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔اس کے علاوہ نادری حکومت کو شاہِ ہندوستان نے تسلیم بھی نہ کیا تھا۔

۲۔ جب نادرشاہ نے کابل کو فتح کیا تھا تو اس وقت بھی ہندوستان کی حکومت کی طرف سے معاندانہ رویے کا اظہار ہوا تھا۔

۳۔ دہلی دربار میں چند امراء ایسے بھی تھے جو نادرشاہ کو اپنے تعاون کا یقین دلا کر برصغیر پر حملے کے لئے اکسا رہے تھے۔

۴۔ برصغیر پر ان دنوں محمد شاہ رنگیلے جیسا نااہل بادشاہ حکمران تھا۔مغلیہ دربار سازشوں کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔تمام امراء تین گروہوں میں بٹے ہوئے تھے، جو ایرانی، تورانی اور مقامی باشندوں پر مشتمل تھے۔اور حصولِ اقتدار کی دوڑ

میں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بادشاہ بذاتِ خود نااہل، عاقبت نااندیش اور عیش وعشرت کا دلدادہ تھا۔ نادر شاہ نے محمد شاہ رنگیلے کے دربار میں اپنا ایک ایلچی محض اس لئے روانہ کیا تھا کہ وہ بات چیت کے ذریعے اس سے کوئی معاہدہ کرے۔ چنانچہ جب نادر شاہ کا ایلچی دہلی آیا تو اس نے محمد شاہ سے مطالبہ کیا کہ ایرانی سلطنت کے جو مخالف پنجاب اور برصغیر کے دیگر علاقوں میں آباد ہو گئے ہیں بادشاہِ دہلی انہیں اپنے علاقوں سے نکال دے۔ یا انہیں ایرانی حکومت کے حوالے کر دے۔ لیکن محمد شاہ نے نادری ایلچی کو کوئی مثبت جواب نہ دیا اور ایلچی واپس آ گیا۔ نادر شاہ نے ایک اور وفد بادشاہ سے بات چیت کے لئے محمد خان ترکمان کی قیادت میں دہلی روانہ کیا۔ اس وفد نے بھی بادشاہ سے یہی مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے علاقوں میں آباد، افغان، ترک خلجی اور بلوچ وغیرہ ایرانی سرحدوں پر فتنہ و فساد برپا کر رہے ہیں لیکن ہندوستان کی حکومت نے اس ضمن میں کوئی مناسب قدم نہیں اٹھایا اور نہ ہی وہ ایرانی حکومت سے کوئی تسلی بخش معاہدہ یا بات چیت کرنے کے لئے تیار ہوتی ہے۔ یہ دوسرا وفد بھی کوئی واضح جواب لے کر واپس نہ لوٹا۔ اس کے بعد نادر شاہ نے تیسرا وفد روانہ کیا۔ نادر شاہ نے شہنشاہ محمد شاہ کو کہلا بھیجا کہ اس وفد کو چالیس روز کے اندر اندر فارغ کر دیا جائے، لیکن دربارِ دہلی نے ایرانی وفد کو مکمل ایک سال تک محض باتوں میں الجھائے رکھا اور بالآخر تیسری بار بھی وفد دہلی دربار سے مایوس ہو کر لوٹا۔

۵۔ شہنشاہ ہند محمد شاہ رنگیلا نادر شاہ ایرانی کو معمولی گڈریا اور ہیچ خیال کرتا تھا اور اسے ایک غاصب اور ناجائز حکمران سمجھتا تھا۔ دہلی کے اس رویے کو نادر شاہ نے اپنی بڑی توہین سمجھا اور اب اس نے مصالحت کا راستہ چھوڑ کر جارحیت کا راستہ اختیار کرنا ہی مناسب خیال کیا۔

مذکورہ بالا حقائق کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ نادر شاہ نے محض لوٹ مار کی غرض

سے ہند پر فوج کشی نہیں کی تھی۔ اگر حملے کی واحد وجہ برصغیر کی دولت ہی تھی تو اسے تین سال تک شہنشاہ ہند سے گفت وشنید میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ نادر شاہ کا تو صرف یہ مطالبہ تھا کہ ایرانی حکومت کے مخالف عناصر کو ہند کے علاقوں سے نکال دیا جائے۔ لیکن شاہ دہلی نے اس کی ان باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی۔

جب نادر شاہ کابل میں تھا تو اس نے وہاں سے چوتھی بار ایک اور وفد روانہ کیا تھا اور بذاتِ خود سات ماہ تک کابل میں مقیم رہا۔ لیکن راستے میں جلال آباد کے مغل حکمران نے وفد کے قائد کو قتل کر کے باقی چند افراد کو واپس نادر شاہ کے پاس کابل بھگا دیا۔ جب جلال آباد کے حکمران کی اس جسارت کا علم نادر شاہ کو ہوا تو وہ آگ بھگولا ہو گیا اور اس نے مغلیہ سلطنت کے خلاف سخت اقدام کرنے کا تہیہ کر لیا۔

پنجاب پر فوج کشی

نادر شاہ نے محمد شاہ کے رویے سے مایوس ہو کر برصغیر پر حملہ کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک لاکھ پچیس ہزار کا لشکر لے کر مئی ۱۷۳۸ء میں ایران سے روانہ ہوا۔ اس نے جون ۱۷۳۸ء میں کابل کا محاصرہ کر لیا۔ ان دنوں کابل پر ستر سالہ مغل گورنر شیر دل حکمران تھا۔ اس معرکہ میں شیر دل اور اس کے دونوں بیٹے مارے گئے۔ اور قلعہ پر ۳۰ جون ۱۷۳۸ء کو نادری فوجیں قابض ہو گئی تھیں۔ نادر شاہ نے خود کابل میں قیام کر کے تمام شمال مغربی سرحدی علاقوں کو جن میں جمرود اور پشاور تک کا علاقہ شامل تھا فتح کر لیا اور ان علاقوں سے اسے دو کروڑ پانچ لاکھ روپیہ، چار ہزار تلواریں مع ڈھالوں کے اور اتنی ہی تعداد میں زرہ بکتر دستیاب ہوئے۔ نادر شاہ نے افغانستان اور پشاور وغیرہ کے علاقوں سے مزید فوج اپنے ساتھ لی تھی اور وہ ۲۷ ستمبر ۱۷۳۸ء کو دریائے سندھ عبور کر کے پنجاب کی سرزمین میں داخل ہوا۔

نادر شاہ دریائے جہلم اور چناب کو عبور کر کے بڑی سرعت سے ایمن آباد پہنچا۔ وہاں کے قلعدار کو شکست دی اور قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ بعد ازاں اس نے شہر کو آگ لگا

دی۔ اس سے تمام پنجاب میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ پنجاب کا گورنر زکریا خان بھی بیس ہزار سواروں کے ہمراہ لاہور سے ایمن آباد کے قلعدار کی مدد کے لئے روانہ ہوا۔ دریائے راوی کے دوسرے کنارے پر زکریا خان اور نادر شاہ کی فوجوں میں تین دن تک جنگ ہوئی جس میں نادر شاہ نے فتح پائی۔ زکریا خان پسپا ہو گیا۔ نادر شاہ نے دریا عبور کیا اور شالامار باغ میں آکر مقیم ہو گیا۔ زکریا خان نے مقدور بھر مزاحمت کی، لیکن جب دربار دہلی سے کوئی کمک نہ آئی تو زکریا خان نے لاہور کو قتل و غارت اور آتش زنی سے بچانے کے لئے صلح کی پیشکش کی۔ نادر شاہ کے ایک سردار کفایت اللہ خان کی وساطت سے دونوں حکمرانوں کے درمیان ملاقات کا بندوبست ہوا۔ جب زکریا خان شالامار باغ میں نادر شاہ سے صلح کی گفت و شنید کرنے کی غرض سے حاضر ہوا تو نادر شاہ نے کھڑے ہو کر بڑے اخلاق سے اس کا استقبال کیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تحائف پیش کئے اور مذاکرات کے بعد دونوں میں مندرجہ ذیل سمجھوتہ ہوا۔

> ”گورنر پنجاب بیس لاکھ روپیہ اور ہاتھیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے علاوہ پانچ ہزار گھوڑ سوار فوج مہیا کرے گا جو دہلی کی فتح میں نادر شاہ کی مدد کرے گی۔“

زکریا خان کے بھائی حیات اللہ خان کو پانچ ہزار گھوڑ سوار فوج کا کمانڈر مقرر کر کے نادر شاہ نے اپنی ملازمت میں لے لیا۔ یوں زکریا خان نے نادر شاہ سے معاہدہ کر کے لاہور کو نادری تباہ کاری اور قتل و غارت سے محفوظ کر لیا تھا۔ نادر شاہ نے لاہور فتح کر کے چند احکامات جاری کئے جن کے مطابق نادر شاہ نے فخر الدولہ امین الدین خان کو کشمیر کا گورنر مقرر کیا اور لاہور میں فی الفور ایک ٹیکسال قائم کرنے کا حکم دیا اور وہاں اپنے نام کا سونے کا سکہ جاری کرنے کا حکم دی۔

جنگِ کرنال

پنجاب کا مکمل بندوبست کرنے کے بعد نادر شاہ دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ نادر

شاہ نے جن لوگوں کو کابل، پشاور، جمرود، جلال آباد اور لاہور کے معرکہ میں گرفتار کیا تھا، انہیں دریائے بیاس پر انسانیت سوز طریقہ سے قتل کروا کر لاشوں کو دریا برد کر دیا۔ ان مقتولین کی تعداد کئی ہزار تھی۔ زکریا خان کو اس نے لاہور کا گورنر مقرر کیا۔ لاہور سے اس نے پانچ لاکھ روپیہ صرف نذرانوں کے طور پر وصول کیا۔ وہ لاہور سے روانہ ہو کر ۱۴ فروری ۱۷۳۹ء کو کرنال کے قریب خیمہ زن ہوا۔ دوسری طرف محمد شاہ صمصام الدین، برہان الملک سعادت خان، نظام الملک آصف خان اور قمر الدین جیسے نامور سرداروں کے علاوہ دو لاکھ فوج کے ہمراہ دو روز قبل ہی میدانِ کرنال میں پہنچ چکا تھا۔ دہلی کی فوج ایک لاکھ پچاس ہزار گھوڑا سواروں، بہت بڑی تعداد میں جنگی ہاتھیوں اور بھاری توپخانہ پر مشتمل تھی۔ پیادہ فوج اس کے علاوہ تھی۔

نادر شاہ کی فوج اگرچہ تعداد میں بہت کم تھی لیکن پوری طرح تربیت یافتہ اور سخت نظم و ضبط کی حامل تھی۔ اس کے برعکس کی فوج غیر تربیت یافتہ اور غیر منظم ہونے کے علاوہ اپنے بادشاہ کی طرح پرلے درجے کی کاہل الوجود بھی تھی۔ چنانچہ جب جنگ شروع ہوئی تو اکثر امراء فوراً ہی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ صرف خان دوران کا بھائی مظفر خان اپنی جمعیت کے ساتھ ثابت قدم رہا۔ مگر جب اس کے دس ہزار سپاہی مارے گئے تو وہ بھی پسپا ہو گیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں جو صرف تین دن جاری رہی مغلوں کے کئی بہترین جرنیل یا تو قتل ہوئے یا گرفتار ہو گئے۔ ان گرفتار شدگان میں برہان الملک سعادت خان، راجا جھجھر مل اور خانِ دوران وغیرہ شامل تھے۔ خانِ دوران اِس قدر شدید زخمی ہوا کہ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے کیمپ میں پہنچتے ہی فوت ہو گیا۔ خانِ دوران نے دم توڑتے وقت اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ نادر شاہ اور محمد شاہ کی ملاقات ہرگز نہ ہونے دینا۔ اور نہ ہی اسے شہر دہلی میں مدعو کرنا اور کسی نہ کسی طرح اس ایرانی لٹیرے کو اسی میدانِ جنگ سے واپس کر دینا۔ یہ جنگ مغلوں کی تاریخ میں سب سے کم وقت میں سب سے زیادہ جانی نقصان کی حامل ہے۔ اس جنگ میں تیس ہزار سپاہی، دس سربرآوردہ شہزادے اور ایک سو نامی گرامی امراء اور فوجی جرنیل کام آئے۔

نادر شاہ نے قیدی امراء کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ اس نے برہان الملک خان کو اپنے ساتھ بٹھایا اور اس کی ہر طرح خاطر داری کی۔ برہان الملک نے اس رویے سے فائدہ اٹھا کر نادر شاہ کو خون ریزی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اور اس کو دو کروڑ روپے تاوان لے کر واپس چلے جانے پر آمادہ کر لیا۔ برہان الملک نے سوچا کہ اس نے محمد شاہ کے لئے اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ اس کو اس صلے میں ضرور وزیر اعظم مقرر کر دے گا۔ لہذا اس نے ساری تفصیل سے بادشاہ کو مطلع کرا دیا۔ بادشاہ نے مزید بات چیت کے لئے نظام الملک کو بھیجا۔ اس نے تفصیلات طے کرنے کے بعد واپس جا کر محمد شاہ کو ساری روداد اس طرح سنائی جیسے یہ صرف اسی کا کارنامہ ہو۔ بادشاہ نے خوش ہو کر نظام الملک کو وزیر اعظم بنا دیا۔ جب برہان الملک نے یہ صورتِ حال دیکھی تو وہ آتشِ انتقام میں جلنے لگا۔ اور اب اس نے نادر شاہ کو الٹی پٹی پڑھانی شروع کر دی۔

دہلی کا رخ

سعادت خان، آصف خان کا سخت مخالف تھا۔ اس نے نادر شاہ کو اس امر پر راضی کر لیا کہ وہ شہر دہلی میں داخل ہو کر چند روز قیام کرے اور زیادہ سے زیادہ روپے کا مطالبہ کرے۔ علاوہ ازیں سعادت خان (برہان الملک) نے اسے اس امر پر بھی اکسایا کہ بادشاہ اور آصف خان کو گرفتار کر لے۔ لہذا نادر شاہ نے محمد شاہ رنگیلا سے ملاقات کرنے پر اصرار کیا۔ سعادت خان برہان الملک نے نادر شاہ سے کہا کہ تم صرف دو کروڑ روپے پر ہی ریجھ گئے ہو۔ یہ حقیر اور معمولی رقم تو میرے جیسے غریب بھی اپنی جیب سے نکال کر ادا کر سکتے ہیں۔ آپ کے لئے تو دہلی میں بے انداز خزانے موجود ہیں۔ اور ان خزانوں میں ایسے ایسے قیمتی جواہرات اور ہیرے پڑے ہیں جو آپ نے اس سے قبل نہ دیکھے ہوں گے اور نہ ہی آئندہ دیکھنے کا اتفاق ہو گا۔

نادر شاہ لالچ کے پھندے میں گرفتار ہو گیا تھا اور سعادت خان کی باتوں میں آ کر اپنے وعدہ سے پھر گیا تھا۔ لہذا نادر شاہ نے اپنے ایلچی کو مغلیہ کیمپ میں روانہ کیا اور

بادشاہ اور نظام الملک کو ایرانی کیمپ میں فی الفور طلب کیا۔ چنانچہ نادر شاہ کے پیغام پر بادشاہ اور آصف جاہ دونوں حاضر ہوئے تو اس نے ان دونوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا چنانچہ بادشاہ محمد شاہ اور نظام الملک آصف خان کو گرفتار کر لیا گیا۔ نادر شاہ نے محمد شاہ سے کہا کہ وہ اپنے حرم اور دیگر امراء کو بھی یہیں بلا لے۔ محمد شاہ نے تعمیل کی۔ اس سے قبل برہان الملک نادر شاہ کو سمجھا چکا تھا کہ اسے بیس کروڑ روپے کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ نادر شاہ نے محمد شاہ سے خزانوں کی چابیاں وغیرہ لے لیں اور اسے کہا کہ میں تمہارا مہمان ہوں مجھے اپنے شہر لے چلو۔ یاد رہے کہ اگرچہ نادر شاہ نے محمد شاہ کو قید کر رکھا تھا مگر اس کا سلوک بالکل شایانِ شان تھا۔ آصف خان اور بادشاہ محمد شاہ نے مجبوراً نادر شاہ کو شہر میں اپنے ساتھ لے جانے پر رضامندی کا اظہار کر دیا اور اس کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر سے باہر آکر نادر شاہ رک گیا اور محمد شاہ نادر شاہ کے استقبال کی تیاری کیلئے شہر میں چلا گیا۔ جہاں اس نے ایک محل نادر شاہ کے لئے آراستہ کیا۔ دوسرے دِن نادر شاہ اپنے مخصوص بارہ ہزار گھوڑ سوار قزلباشوں کے ہمراہ ۲۰ مارچ ۱۷۳۹ء کو شہر دہلی میں داخل ہوا اور اپنی فوج کو قلعے کے اندر باہر اور شہر کے تمام اہم مقامات پر متعین کر کے دہلی کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا۔ لیکن اپنے سپاہیوں کو سختی سے منع کر دیا کہ کسی مقامی باشندے کو تنگ نہ کریں۔

دہلی کی تباہی

انہیں دنوں ۳۰ مارچ ۱۷۳۹ء کو عید آئی اور نادر شاہ نے جامع مسجد دہلی میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ نادر شاہ نے پچیس کروڑ روپے تاوانِ جنگ کا مطالبہ کیا۔ اس کے فوجی شہریوں سے تاوان وصول کر رہے تھے کہ کسی نے افواہ اڑا دی کہ نادر شاہ کو محمد شاہ نے قتل کر دیا ہے۔ اس افواہ کے پھیلتے ہی دہلی کے باشندے ایرانی فوج پر ٹوٹ پڑے اور تھوڑی ہی دیر میں ایرانیوں کی کثیر تعداد قتل ہو گئی۔ شہر میں ہنگامے کی اطلاع ملنے پر جب نادر شاہ محل سے باہر آیا تو اس پر بھی پتھراؤ کیا گیا۔ اس پر اسے بے حد غصہ آیا اور اس نے

اپنی فوج کو قتلِ عام کی اجازت دے دی۔ ایرانی سپاہی دہلی کے عوام کا پورے نو گھنٹے تک قتلِ عام کرتے رہے۔ ایرانیوں نے خون کی ندیاں بہادیں اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ ہر طرف آگ لگا دی گئی۔ شہر میں چاروں طرف سے چیخ و پکار اور رحم! رحم! کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ شہر کے تمام امراء، وزراء اور بذاتِ خود بادشاہ ایک وفد کی صورت میں روشن الدولہ کی مسجد میں نادر شاہ کے پاس رحم کی درخواست لے کر گئے۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ نادر شاہ کے پاس مسجد میں جا کر درخواست پیش کر سکیں، کیونکہ وہ ہاتھ میں برہنہ تلوار لئے کھڑا تھا اور غصہ میں بھوکے شیر کی مانند غرا رہا تھا۔ بالآخر نظام الملک ہی اپنی دستار اپنے گلے میں ڈالے ننگے سر روشن الدولہ کی مسجد میں نادر شاہ کے پاس حاضر ہوا اور اس نے سامنے جاتے ہی درج ذیل شعر پڑھا:

کسے نماند کہ او را بہ تیغِ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

نادر شاہ پر اس شعر کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے تلوار نیام میں ڈال لی اور قتل عام بند کرنے کا حکم دے دیا۔ اس ایک دِن کے ہنگامے میں آٹھ، نو سو ایرانی فوجی قتل ہوئے۔ جبکہ ہندوستانی مقتولین کی تعداد اندازاً ڈیڑھ لاکھ بتائی جاتی ہے۔ ان میں عورتیں، بچے اور بوڑھے سب شامل تھے۔ کسی کو بھی بخشا نہ گیا۔ جو سامنے آیا موت کے گھاٹ اترا۔ ہندوستانی باشندوں پر ایرانیوں کی اس قدر دہشت بیٹھ گئی کہ اکیلے ایرانی کے سامنے دس دس مقامی باشندے بے بس ہو کر کھڑے ہو جاتے اور وہ انہیں آسانی سے قتل کر دیتا۔ غرض مقامی باشندوں نے کوئی مدافعت نہ کی اور بڑی تعداد میں قتل ہوئے۔ اور بری طرح لوٹے گئے۔

اس قتلِ عام کے بعد نادر شاہ نے دہلی میں اپنی فوج کے ساتھ خوب لوٹ مار مچائی۔ جو کچھ نظر آیا اٹھا کر لے گئے۔ دہلی سے جسقدر نقد، ہیرے، جواہرات اور سامان وغیرہ ہاتھ آیا اس کی مالیت ایک اندازے کے مطابق پچاس کروڑ پونڈ سٹرلنگ کے برابر تھی۔ اس لوٹ میں مشہور ہیرا ''کوہ نور'' اور عہدِ شاہجہانی کا یادگار شاہکار ''تختِ

طاؤس'' بھی شامل تھے۔ دہلی کے علاوہ دوسرے علاقوں سے جو مالِ غنیمت ملا وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس بارے میں بھی مختلف روایات ہیں۔ لاہور سے بیس لاکھ روپے تاوانِ جنگ اور پانچ لاکھ روپے نذرانے کے طور پر حاصل کیے۔ اس کے علاوہ پانچ سو سے زائد ہاتھی اور پانچ ہزار گھوڑے بھی تھے۔ اس سے قبل کابل سے اڑھائی کروڑ روپے نقد کے علاوہ چار ہزار تلواریں، اتنی ہی تعداد میں ڈھالیں، پانچ ہزار زرہیں اور بہت بڑی تعداد میں گرم کپڑا اسے حاصل ہو چکا تھا۔ دہلی سے اسے پچاس کروڑ نقد اور سازوسامان کے علاوہ ایک ہزار ہاتھی سات ہزار گھوڑے اور دس ہزار اونٹ حاصل ہوئے۔ علاوہ ازیں اس نے ہر پیشے کے افراد کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ ان میں دو سو لوہار، دو سو بڑھئی، ایک سو سنگتراش، ایک سو تیس ادیب اور مصور اور ایک سو خواجہ سرا شامل تھے۔ ان کے علاوہ موسیقاروں، سازندوں اور رقاصاؤں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔

نادر شاہ دہلی میں دو ماہ قیام کرنے کے بعد ۱۶ مئی ۱۷۳۹ء کو واپس وطن کے لئے روانہ ہوا۔ دہلی سے لاہور، پسرور، سیالکوٹ اور گجرات ہوتے ہوئے اس نے کلووال کے مقام سے دریائے چناب کو عبور کیا۔ اس تمام سفر کے دوران پنجاب کا گورنر زکریا خان نادر شاہ کے ہمراہ رہا۔ چناب عبور کرنے کے بعد نادر شاہ نے تمام قیدی زکریا خان کے حوالے کر دیئے تاکہ وہ ان کے گھروں کو جانے کا بندوبست کر دے۔ دریا عبور کرنے کے بعد محمد شاہ کا تمام توپخانہ نادر نے واپس کر دیا۔ راولپنڈی اور حسن ابدال سے ہوتا ہوا ۲۰ نومبر ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ کابل پہنچ گیا۔

اسی سال نادر شاہ سندھ پر حملہ آور ہوا اور وہاں کے گورنر خدایار خان کو شکست دی۔ بعد ازاں سندھ اور بلوچستان کے قبائل نے نادر شاہ کو گھیر لیا تو اس نے پنجاب کے گورنر زکریا خان کو مدد کے لئے بلایا۔ اس کی مدد ہی سے نادر نے سندھیوں اور بلوچیوں سے نجات حاصل کی۔ زکریا خان کی مدد سے سندھی اور بلوچی امیروں سے مطمئن ہو کر نادر شاہ نے لاڑکانہ کے مقام پر جشن نوروز منایا اور یہیں ہندوستان کے موسیقاروں نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ بعد ازاں نادر شاہ نے اپنی فوج اور دیگر رضا کاروں کو انعامات

تقسیم کیئے۔ نادر شاہ نے اعلیٰ فوجی افسروں کو پانچ سو مہریں عطا کیں۔ دوسرے درجے کے افسران کو تین سو مہریں، با قاعدہ فوج کے ہر سپاہی کو ایک سو مہریں اور ان سپاہیوں کو جو صرف مالِ غنیمت حاصل کرنے کی غرض سے فوج میں شامل تھے، صرف دو مہریں ملیں۔ مہر کی مالیت چوبیس روپے تھے۔ اس جشن کے بعد نادر شاہ سندھ سے روانہ ہوا۔ اور قندھار و ہرات سے ہوتا ہوا تہران چلا گیا۔

نادر شاہ کی ہلاکت

نادر شاہ اپنے آخری ایام میں دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ لہذا اس کے پاس سے حرم کی تمام عورتوں کو تحفظ کی غرض سے ہرات کے قلعہ میں بھجوا دیا گیا۔ اس کی عمر ابھی پچاس سال تھی لیکن بہت جلد بوڑھا ہو گیا تھا۔ اور سلطنت کے معاملات پر اس کی گرفت کمزور ہو گئی۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نادر شاہ کے بھتیجے علی قلی خان نے نادر کے محافظ دستے کے کمانداراور چند نامور سپاہیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس نے اس سردار سے وعدہ کیا، کہ تخت پر قبضہ ہو جانے کی صورت میں وہ اسکو اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کر دے گا۔ محافظ دستے کے کماندار نے نادر شاہ کو قتل کرنے کے منصوبے کے مطابق ستر آدمیوں کو اس کام کی انجام دہی کے لئے مقرر کیا۔ نادر شاہ اس وقت مشہد کے قریب فتح آباد نامی ایک مقام پر خیمہ زن تھا۔ یہ لوگ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس طرف روانہ ہوئے۔ رات کے وقت شاہی خیمے کو گھیر لیا۔ لیکن عین وقت پر ستاون سپاہی ہمت ہار گئے اور اس اقدام میں شرکت سے انکار کر دیا۔ جبکہ بقیہ تیرہ آدمی ثابت قدم رہے۔ وہاں ایک محافظ نے مزاحمت کی جسے فوراً ہی قتل کر دیا گیا۔ نادر شاہ ہنگامہ سن کر بیدار ہوا۔ اس کی گرجدار آواز سن کر حملہ آور ایک دفعہ تو دہل گئے مگر پھر جرأت کر کے بادشاہ پر ٹوٹ پڑے اور اسے قتل کر دیا۔ یہ واقعہ ۸ جون ۱۷۴۷ء کی رات کو وقوع پذیر ہوا۔ اور یوں وہ نادر شاہ جو ساری عمر دوسروں کے خون سے ہولی کھیلتا رہا تھا اپنے انجام کو پہنچا۔

نادر شاہ کے حملے کا اثر

نادر شاہ کے حملے سے قبل دہلی دربار کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ اور اب اس کے حملے سے رہی سہی آبرو بھی خاک میں مل گئی تھی۔ خانہ اور خزانہ دونوں خالی ہو گئے۔ کیونکہ نادر شاہ محل کا تمام ساز و سامان اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ مغلیہ فوج منتشر ہو گئی تھی۔ تمام خراج اور محصولات بند ہو گئے۔ اس صورت میں مغلیہ دربار ایرانی، تورانی اور پاک و ہند کے امراء کے جھگڑوں اور سیاسی عداوتوں کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔ تمام برصغیر جسے اورنگ زیب نے کابل سے آسام تک متحد کر کے اپنے جانشینوں کے لئے چھوڑا تھا، ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ بنگال بہار اور اڑیسہ عملاً مرکز سے کٹ گئے تھے۔ روہیل کھنڈ میں روہیلہ قبائل برسرِ اقتدار آ گئے۔ گجرات اور مالوہ پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا۔ اکبر آباد اور دہلی کے درمیان جاٹوں نے اقتدار حاصل کر لیا تھا۔

دکن کے چھ صوبے نظام الملک آصف جاہ کے زیر اقتدار خود مختاری حاصل کر چکے تھے۔ پنجاب ایرانیوں اور افغانوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا اور محمد شاہ رنگیلا صرف محل سرا کے شہنشاہ رہ گئے تھے۔ نادر شاہ ایرانی کے پلٹتے ہی ہر ایک نے اپنے اپنے بلوں سے سر نکالنے شروع کئے۔ محمد شاہ نے پورے تیس سال حکومت کی لیکن صرف نظام الملک آصف جاہ کے تدبر اور عقل و دانش کے بل بوتے پر تھوڑا بہت شاہی وقار قائم ہوا۔ جونہی وہ دکن چلا گیا، مغلیہ سلطنت بھی ختم ہو گئی۔

پنجاب کی حالتِ زار

برصغیر ہند میں پنجاب ایک ایسا خطہ ہے جو ہمیشہ سے ہی بیرونی حملہ آوروں کا براہِ راست نشانہ بنتا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اس خطہ کے عوام کو متعدد مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ کافی عرصہ تک بندہ بیراگی کے مظالم اور قتل و غارت کی کاروائیاں برداشت کرتا رہا۔ بندہ بیراگی کے خاتمے کے بعد زکریا خان نے پنجاب کے حالات کو سنبھالا۔ اس کے دورِ حکومت میں کچھ امن و امان رہا۔ اور لاہور کے نواح میں بیگم پورہ کے علاقہ میں پھر

سے کچھ عمارتیں بھی تعمیر ہوئیں۔ لیکن اس صورتِ حال کو ابھی چند سال بھی نہ گزرے تھے کہ نادر شاہ پنجاب پر بلائے بے درمان بن کر نازل ہوا۔ نادر شاہ کی قتل و غارتگری سے پنجاب ابھی بمشکل سنبھلا ہی تھا کہ ۱۷۵۴ء میں ایک خوفناک قحط پھوٹ پڑا۔ اس میں لاکھوں کی تعداد میں انسانی جانیں ضائع ہوگئیں اور ہزاروں گاؤں ویران ہو گئے۔

اس طوائف الملوکی کے زمانے میں پنجاب قطعی طور پر دہلی سے جدا ہو گیا تھا کیونکہ مغلیہ سلطنت کمزور سے کمزور تر ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں پنجابی عوام پر بیک وقت دو مصائب ٹوٹ پڑے تھے۔ اول تو افغانوں کے حوصلے اس قدر بلند ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے پے در پے حملوں سے مغربی پنجاب کی معیشت اور ترقی کو نہ صرف تباہ کر کے رکھ دیا تھا بلکہ یہاں زبردست بدامنی اور بے چینی بھی پھیل گئی تھی۔ دوسرے سکھ جنہوں نے گزشتہ چالیس سال سے پنجاب میں ادھم مچا رکھا تھا، انہوں نے پھر اپنی خون آشام سرگرمیاں شروع کر دیں۔ سکھ جو پہلے بھیس بدل کر امرتسر میں آیا کرتے تھے اب کھلے بندوں ہر طرف دندنانے لگے۔ انہوں نے دریائے راوی کے کنارے ڈالوال کے مقام پر ایک قلعہ بھی تعمیر کر لیا اور آئے دن ان کی جمعیت میں اضافہ ہونے لگا۔ انہی دنوں پنجاب کا گورنر خان بہادر نواب زکریا خان فوت ہو گیا تو سکھوں کی سرگرمیوں میں تیزی آگئی اور انہوں نے مسافروں کو لوٹنا اور قتل کرنا شروع کر دیا۔

زکریا خان کے بعد میر معین الدین خان لاہور کا حکمران ہوا مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد اپنے ماموں میر قمر الدین خان کی مدد سے زکریا خان کا بڑا بیٹا یحییٰ خان لاہور کا حاکم بن گیا جو دربار دہلی میں وزیر اعظم تھا۔ زکریا خان کے زمانے سے ہی لکھپت رائے لاہور کا دیوان تھا۔ جبکہ اس کا بھائی جسپت رائے ایمن آباد کا فوجدار تھا۔ جسپت رائے نے سکھوں کے خلاف کاروائی کی تو سکھ غالب آگئے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ لکھپت رائے نے یہ سن کر خود ان کے خلاف کاروائی کا فیصلہ کیا اور یحییٰ خان کی فوج لے کر ان کی سرزنش کے لئے روانہ ہوا۔ سکھ جموں کی جانب فرار ہو گئے لیکن اس نے تعاقب کیا اور معرکے میں ہزاروں سکھوں کو قتل کر دیا۔ ایک ہزار سکھ گرفتار کر کے لاہور لائے گئے اور

یہاں ان کو گدھوں پر سوار کرا کے سارے شہر میں پھرایا گیا۔ اور بالآخر دہلی دروازے کے باہر انہیں قتل کر دیا گیا۔ اور ایک بڑے گڑھے میں سب کو گاڑ دیا گیا۔ اِس مقام کو بعد میں سکھوں نے ان مقتولین کی یاد میں ''شہید گنج'' کا نام دیا۔ یعنی ''سکھ شہیدوں کا مدفن'' یحیٰی خان حاکمِ لاہور اس کے بعد بھی سکھوں کا استیصال کرتا رہا۔ ہر روز اس کے پاس سکھوں کے سر لائے جاتے اور وہ سر لانے والے کو انعام دیتا تھا۔

شاہنواز کا لاہور پر حملہ

نواب زکریا خان کا چھوٹا لڑکا شاہنواز خان ملتان کا حاکم تھا۔ اس نے بڑے بھائی یحیٰی خان سے لاہور کی صوبیداری بھی چھیننا چاہی اور ایک بڑی فوج لے کر لاہور کے قریب شالامار باغ میں فروکش ہوا۔ یحیٰی خان بھی مدافعت کے لئے نکلا۔ دونوں بھائیوں میں سخت جنگ ہوئی جس میں یحیٰی خان کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہوا۔ لاہور کی گورنری شاہنواز کے قبضہ میں آ گئی۔ اس نے دیوان 'کوراامل' کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ شاہنواز نے لاہور کی حاکیت سنبھالنے کے بعد اپنے نام کی ایک نئی مہر بنوائی جس پر یہ الفاظ کندہ تھے: ''فدوی جان نثار محمد شاہ''

یہ اقدام اس نے بادشاہ دہلی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا تھا۔ کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ محمد شاہ اس کے لاہور پر حملے سے ناراض ہوگا۔

احمد شاہ کا پہلا حملہ

(۱۷۴۸ء)

وجوہات

اسی اثناء میں یحییٰ خان کسی طرح شاہنواز کی قید سے فرار ہو کر دہلی پہنچ گیا۔ اس مرحلے پر مرزا آدینہ بیگ نے، جسے شاہنواز نے جالندھر کا ناظم مقرر کر رکھا تھا۔ یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اب یحییٰ خاں شاہی فوج کے ساتھ حملہ آور ہو گا۔ جس کا مقابلہ کرنا مشکل ہے۔ اس دشواری پر قابو پانے کے لئے احمد شاہ ابدالی کو اپنی مدد کے لئے بلایا جائے۔ کیونکہ یحییٰ خاں کو دربار دہلی میں اپنے ماموں اور خسر نواب میر قمر الدین کی وجہ سے بہت اثر و رسوخ حاصل تھا۔ چنانچہ شاہنواز نے فوراً احمد شاہ ابدالی کو ایک خط لکھا۔ جس میں اس نے لکھا کہ "یہاں آپ کو کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ بلا خطر چلے آیئے۔ آپ بادشاہ اور میں وزیر۔"

احمد شاہ نادر شاہ کا ایک قابل ترین اور نامور جرنیل تھا۔ وہ قبل ازیں نادر شاہ کے ہمراہ ۱۷۳۸ء میں برصغیر ہند آیا تھا۔ نادر شاہ کے قتل (۱۷۴۸ء) کے بعد وہ برسرِ اقتدار آ گیا اور پنجاب کو نادر شاہ کا ورثہ خیال کرتے ہوئے اس کے حصول سے متعلق غور و خوض کر ہی رہا تھا کہ اسی اثناء میں شاہنواز خان گورنر پنجاب کا ایلچی اس کے پاس پہنچا۔ ابدالی شاہ نے اسے نیک شگون خیال کیا اور اُسے انعام و اکرام سے نوازا۔ احمد شاہ نے ایلچی کی آمد کے چند ہفتے بعد پنجاب پر حملہ کر دیا تھا۔ لیکن اس عرصے میں شاہنواز خان کو اس کے ماموں قمر الدین نے اس سازش پر سخت ملامت کی اور کہا کہ:

"ہمارا خاندان تو ہمیشہ سے تاجِ دہلی کا وفادار ہے۔
تمہاری اس حرکت سے ہماری خاندانی نیک نامی کو بٹا لگے گا اور ہم

عوام میں نمک حرام سمجھے جائیں گے اس لئے تمہیں فوراً اپنی اس حرکت سے باز آنا چاہیے۔"

ایک شاہی فرمان کے ذریعے شاہنواز کو لاہور، کشمیر، ملتان، کابل اور سندھ کی صوبے داری عطا کی گئی۔ اس پر شاہنواز خان نے اپنا ارادہ بدل لیا اور احمد شاہ ابدالی کو روکنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

احمد شاہ نے جب شاہنواز کو وعدے کے برعکس اپنے مقابلہ پر پایا تو اس کے غیض وغضب کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ اس نے اپنے امراء، جرنیلوں اور سپاہیوں کو جن کی تعداد بارہ ہزار تھی، مخاطب کر کے کہا کہ "ہمیں دھوکا دیا گیا ہے اور ہم سے غداری کی گئی ہے لہذا پنجابیوں کو وعدہ خلافی اور غداری کا مزا چکھا دو اور ان میں سے کوئی بھی راوی کے اس پار زندہ نہ رہ جائے۔" ابدالی کے مشیروں نے مشورہ دیا کہ قبل اس کے کہ ہم جنگ کریں پہلے سفیر کی وساطت سے معلومات حاصل کرنی چاہییں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے احمد شاہ نے اپنے خاندانی پیر صابر شاہ کو روانہ کیا۔ پیر صاحب نے شاہنواز کو بہت سمجھایا بجھایا مگر جب وہ نہ مانا تو پیر صاحب کو جلال آ گیا۔ انہوں نے شاہنواز خان کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور اسے بدعہد اور بے ایمان وغیرہ کہا۔ اس پر نوجوان شاہنواز کو غصہ آ گیا اور اس نے پیر صاحب کو قتل کروا دیا۔ یہ فقیر بادشاہی مسجد کے پہلو میں مدفون ہے۔

اس واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ احمد شاہ غصہ کے مارے آگ بگولہ ہو گیا اور فوراً دریائے راوی عبور کر کے قلعہ لاہور کی فصیل کے نیچے پہنچ گیا۔ جنگ شروع ہو گئی۔ شاہنواز نے بڑی بہادری اور جرأت سے مقابلہ کیا۔ لیکن اس کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس صورت میں چار و ناچار شاہنواز کو بھی گرفتاری کے ڈر سے راہ فرار اختیار کرنا پڑی اور وہ دہلی بھاگ گیا۔ فتح کے بعد احمد شاہ نے شہر لاہور پر قبضہ کر لیا۔ احمد شاہ کے سپاہیوں نے لاہور کے نزدیک بستی مغلپورہ کو جہاں اس وقت رؤساء اور وزراء وغیرہ رہائش پزیر تھے۔ خوب جی بھر کر لوٹا اور اس لوٹ مار میں افغانوں نے ہزاروں کی تعداد میں عوام کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

مغلیہ فوجوں کو شکست دینے کے بعد احمد شاہ قلعہ لاہور میں داخل ہوا تو اسے بے شمار سونے کے نادر شاہی سکے اور مغل بادشاہوں کی اشرفیاں دستیاب ہوئیں۔ علاوہ ازیں بے شمار قیمتی ہیرے، جواہرات بھی ابدالی کے ہاتھ لگے۔ ابدالی کو سامان جنگ بھی بڑی مقدار میں دستیاب ہوا۔ چونکہ شاہنواز نے ملتان اور گردونواح کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے علاوہ زمینداروں اور جاگیرداروں سے بھی معمولی درجہ کا اسلحہ اور ہتھیار فراہم کر لئے تھے۔ اور دہلی سے وزیر قمر الدین نے بھی توپخانہ وغیرہ لاہور بھجوا دیا تھا۔ جب کہ اس نے شاہنواز کو وعدہ سے منحرف ہونے پر آمادہ کیا تھا۔

جب ابدالی نے لاہور پر قبضہ کر لیا تو اس زمانہ کے رسم و رواج کے مطابق بڑے بڑے زمیندار جاگیردار اور امراء نے نذرانے دینا شروع کر دیئے اور اس طریقہ سے اس کے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی۔ مال و دولت، اسلحہ اور ہتھیاروں کی ایک بڑی مقدار دستیاب ہونے کے بعد احمد شاہ نے دہلی کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا اور قبل ازیں وہ کابل پیغام بھجوا چکا تھا کہ ایک دوسری فوج جتنی بھی جلدی ممکن ہو بھرتی کر کے بطور کمک روانہ کر دی جائے۔ دہلی پر حملہ کرنے کے لئے خود احمد شاہ اور اس کے افغان سرداروں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ شمالی برصغیر کی طرف روانہ ہونے سے قبل احمد شاہ نے لاہور میں چند احکامات صادر کئے۔ نواب زکریا خان مرحوم کے بیٹے یحییٰ خاں سابق گورنر پنجاب کے وزیر اعظم دیوان رائے لکھپت رام کو قید سے رہائی دلا کر اُسے پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ یاد رہے کہ رائے لکھپت رام کو شاہنواز خان نے قید کر رکھا تھا۔ قصور (ضلع لاہور) کے فوجدار منعم خان جسے شاہنواز نے یحییٰ خاں کے فرار میں مدد دینے کے الزام میں قید کر دیا تھا، کو رہا کر کے احمد شاہ نے پنجاب کا دیوان مقرر کیا۔ احمد شاہ ابدالی چونکہ ایک طویل عرصہ نادر شاہ ایرانی کے ساتھ رہا تھا اس لئے اس کی حکمتہائے عملی پر نادر شاہ کا خاصا اثر تھا۔ چنانچہ احمد شاہ نے نادر شاہ کے طرز عمل کی پیروی کرتے ہوئے لاہور کی فتح کے بعد ایک شاہی مہر تیار کرنے کا حکم دیا جس کے ذریعے شاہی فرمان جاری کئے جا سکیں۔ احمد شاہ نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کرنے کا حکم دیا۔

سرہند پر قبضہ

احمد شاہ ابدالی فتح کے ایک ماہ بعد تک لاہور میں قیام پذیر رہا۔ اس دوران میں وہ نظم و نسق کے استحکام میں مصروف رہا۔ بعد ازاں وہ لاہور کے حالات سے مطمئن ہو کر دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ اور جلد ہی سرہند پہنچ گیا۔ ۱۳ مارچ ۱۷۴۸ء کو شہر سرہند پر ابدالی فوج نے قبضہ کر لیا تھا اور وہاں سے اسے کافی مقدار میں بارود اور چند بھاری توپیں بھی ہاتھ لگیں۔ شہر کو احمد شاہ نے اپنا فوجی مرکز بنا لیا۔ اس وقت مغلیہ فوجیں سرہند سے نو میل کے فاصلہ پر منارہ کے مقام پر تھیں۔ جب مغلیہ جرنیلوں کو معلوم ہوا کہ ابدالی نے سرہند پر قبضہ کر لیا ہے تو وہ احمد شاہ کی برق رفتاری اور مستعدی سے ششدر رہ گئے۔

منارہ کی لڑائی

چنانچہ مغلیہ فوج نے منارہ ہی کے مقام پر خندقیں کھود کر اپنی مورچہ بندی کر لی۔ محمد شاہ رنگیلا نے بھی متعدد جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ سادات بارہہ سے جنگ میں بادشاہ نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے اور مخالف فوج پر محمد شاہ نے تیروں کی بارش کر دی تھی۔ علاوہ ازیں نادر شاہ ایرانی کے خلاف ۱۷۳۹ء میں جنگِ کرنال ہوئی تو اس میں بھی محمد شاہ بذاتِ خود شامل تھا۔ گو اس جنگ میں مغلوں کو سخت جانی و مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن محمد شاہ بزدل نہیں تھا۔ جنگِ کرنال کی تذلیل کے بعد محمد شاہ رنگیلے نے اپنے اکلوتے بیٹے احمد شاہ کی جنگی تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی اور اسے مغلیہ افواج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اب جب اسے احمد شاہ ابدالی کی پیش قدمی کا علم ہوا تو اس نے اپنے بیٹے کو پرنم آنکھوں کے ساتھ دعائیں دیتے ہوئے افغانوں کے خلاف مزاحمت کے لئے سوئے پنجاب روانہ کیا۔ منارہ کے مقام پر جو سرہند سے نو میل دور ہے، مغلوں اور افغانوں میں جنگ کا آغاز ہوا تو مغلوں کی جانب سے برصغیر کے متعدد سرداروں، راجاؤں، نوابوں اور جاگیرداروں نے حصہ لیا۔ علاوہ ازیں جے پور کا راجا بھی اپنے بارہ ہزار راجپوت شہسواروں کیساتھ افغانوں اور درانیوں کے خلاف مغلوں کی جانب سے جنگ میں شریک ہوا۔ درانیوں اور

مغلوں میں یہ جنگ ایک ماہ تک جاری رہی لیکن کوئی فیصلہ نہ ہوا اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا تھا کہ کس فریق کا پلہ بھاری رہا۔ ایک روز نواب قمرالدین خان وزیر اعظم نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک گولہ اس پر آکر گرا اور وہ وہیں جان بحق ہو گیا۔ لیکن وزیر قمرالدین کی موت کو مخفی رکھا گیا۔ بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ اسے ایک ہاتھی کے ہودہ میں محفوظ کر کے رکھ دیا گیا تھا۔ راجا جے پور کی یونہی اچانک نواب قمرالدین وزیر کی لاش پر نظر پڑ گئی تو وہ بدحواس ہو کر میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا اور وہ بارہ ہزار راجپوت جنہوں نے قسمیں کھائی تھیں کہ ہم مر جائیں گے، لیکن میدانِ جنگ سے نہیں بھاگیں گے، وہ آنکھ جھپکنے میں میدانِ جنگ سے غائب ہو گئے۔ اس افراتفری اور بھگدڑ میں کئی راجے، سردار اور جرنیل بھی دیکھا دیکھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ابدالی فوجوں نے اس بھگدڑ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور وہ خندق عبور کر کے مغلوں پر ٹوٹ پڑے۔ اور اس طرح بقیہ مغل فوج میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ لیکن میر قمرالدین کے بیٹے میر منو اور صفدر جنگ نے ثابت قدمی اور میدان جنگ میں جمے رہنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے شدید مزاحمت کے بعد ابدالی فوجوں کو روک دیا اور جوابی حملہ کر کے انہیں پسپائی پر مجبور کر دیا۔ جب بھگوڑوں نے دیکھا کہ میر منو اور صفدر جنگ نے میدان پر قابو حاصل کر لیا ہے تو وہ بھی میدانِ جنگ کی جانب پلٹے اور ان دونوں بہادروں کے ساتھ مل کر احمد شاہ ابدالی کی فوج کے قلب پر زبردست حملہ کر دیا جس کی وہ خود قیادت کر رہا تھا اور اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ مغلیہ فوج نے دس میل تک افغانوں اور درانیوں کا تعاقب کیا۔ مغلوں نے احمد شاہ درانی پر ایسا خوف طاری کر دیا تھا کہ وہ بغیر رکے مسلسل سفر کرتا ہوا ۱۷۴۸ء کے وسط میں واپس کابل پہنچ گیا۔

اس جنگ نے ثابت کر دیا کہ مغلوں میں ابھی جنگ کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور وہ جوہر بھی باقی ہیں جن کے ذریعے مغلوں نے لاتعداد لڑائیوں میں فتح حاصل کی تھی۔ اکثر مؤرخین لکھتے ہیں کہ اگر وہ زوال پذیر تھے تو محض اپنی عیش و عشرت کی بنا پر اور باہمی چپقلش سے انہیں بُرے دنوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بقول علامہ ابن خلدون رعایا اپنے حکمرانوں کے سے طور طریقے اور عادات اختیار کر لیتی ہے۔ لہٰذا جب مغل بادشاہ

بذاتِ خود عیش و عشرت کے دلدادہ بن گئے تو مغلیہ فوج جس کے بل بوتے پر مغلیہ سلطنت اور جاہ و جلال قائم تھا وہ بھی کاہلی کا شکار ہو گئی تھی۔ بقول سر ولز لے ہیگ، مغلوں کے زوال اور تذلیل کا باعث ان کی فوجی بداخلاقی و بدنظمی تھا۔

جنگ منارہ ۱۷۴۸ء سے جنگ کرنال ۱۷۳۷ء کی تذلیل کا ازالہ ہو گیا تھا اور مغلوں کے متعلق جو نظریات اغیار نے قائم کر لئے تھے ان کی تردید ہو گئی اور ان پر واضح ہو گیا کہ ابھی مغل حکومت برصغیر میں قائم رہے گی۔ جنگِ منارہ میں مغلوں نے تیموری اور بابری شجاعت اور جوہر دکھائے۔

محمد شاہ کا آخری سفر

بادشاہ محمد شاہ رنگیلا دل کا مریض تھا اور متعدد بار اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ لیکن آخری بار جو عارضہ قلب کا دورہ پڑا تو وہ جانبر نہ ہو سکا لیکن خافی خان کے بقول اسہال کے مرض سے بادشاہ محمد شاہ ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۶۱ ہجری بمطابق ۱۶ اپریل ۱۷۴۸ء کو اس وقت فوت ہوا جب شاہی لشکر فتح کے نقارے بجاتا ہوا واپس دہلی آ رہا تھا۔ بادشاہ کی روح فتح کی خوشخبری سن چکی تھی۔

محمد شاہ کا کردار اور شخصیت

محمد شاہ (رنگیلا) کو رفیع الدولہ کی وفات کے بعد سادات بارہہ نے ستمبر ۱۷۱۹ء میں تخت نشین کیا تھا۔ اس نے اپنی ہمت اور چالاکی سے سادات بارہہ (سیّد برادران) سے ۱۷۲۲ء میں گلو خلاصی کر لی تھی۔ محمد شاہ عیش و نشاط کا بندہ تھا۔ وہ اپنے حقیقی فرائض اور ذمہ داریوں کو نظرانداز کر کے رقص و رامش کی محفلوں میں مشغول ہو گیا۔ اُسے اپنے عوام اور رعایا کے متعلق کوئی خبر نہ تھی۔ نادر شاہ مار دھاڑ کرتا ہوا دہلی کے بالکل قریب آ پہنچا، مگر محمد شاہ اس وقت بھی اپنی رنگ رلیوں میں ہی مصروف رہا۔ وہ سلطنت مغلیہ کا شہنشاہ تھا۔ لیکن امورِ سلطنت کی جملہ ذمہ داریاں آصف جاہ نظام الملک اور اس کے بیٹوں کے کندھوں پر تھیں۔ زوال پذیر اور ڈگمگاتی ہوئی مغلیہ سلطنت آصف جاہ نظام الملک اور اس

کی اولاد کی جرأت وشجاعت اور عقل ودانش کے سہارے ہی زندہ تھی۔ اگر نظام الملک آصف جاہ کا خاندان اس کے آڑے نہ آتا، جس کی گھٹی میں غالب عنصر جاں نثاری اور وفاداری کا تھا، تو محمد شاہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو مظلوم فرخ سیر کا سید برادران کے ہاتھوں ہوا تھا۔

اروِن (Irvin) لکھتا ہے کہ بادشاہ محمد شاہ مذہبی واخلاقی اقدار اور مغلیہ روایات کو بھی کھو بیٹھا تھا۔ وہ نادر شاہ سے وعدہ کر کے بعدازاں اس سے منحرف ہو گیا جو مغلیہ شہنشاہوں کی روایت کے منافی تھا۔ اور اس طرح اس نے لاکھوں انسانوں کا قتلِ عام کروا دیا۔ سیّد محمد لطیف رقمطراز ہیں کہ بادشاہ محمد شاہ ایامِ شباب میں خوبصورت وجیہہ و شکیل، دانا، دلیر، شکار کھیلنے کا دلدادہ اور پولو کا بہت شوقین تھا۔

احمد شاہ بن محمد شاہ

(۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء)

شہزادہ احمد شاہ ابھی احمد شاہ ابدالی کے خلاف جنگ میں فتح کے نقارے بجاتا ہوا رستے ہی میں تھا کہ اسے بادشاہ محمد شاہ کے مرنے کی خبر ملی۔ احمد شاہ دہلی پہنچا تو باپ کی تجہیز و تکفین کے بعد ایک ہفتہ رسومِ تعزیت میں گزارا۔ بعد ازاں ۱۸ اپریل ۱۷۴۸ء کو ''مجاہد الدین ابوالناصر احمد شاہ غازی'' کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۱ سال تھی۔ احمد شاہ نے تخت نشینی کے وقت جاوید خان کو نواب بہادر کا خطاب دیا۔ اور چھ ہزار کا منصب عطا کا۔ نواب قمر الدین بہادر مرحوم کے بیٹے میر منو کو معین الملک کا خطاب دے کر پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ تاہم دربار میں سب سے زیادہ اثر و رسوخ جاوید خان کو حاصل تھا۔

احمد شاہ ابدالی کے مقابلے میں مغلوں کی حالیہ فتح سے لوگوں کو یہ امید پیدا ہو گئی کہ شاید یہ زوال پذیر سلطنت دوبارہ سنبھل جائے۔ اور اس کی عظمت رفتہ پھر لوٹ آئے۔ لیکن بہت جلد ان کی یہ امید احمد شاہ کے طرزِ عمل کی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ کیونکہ احمد شاہ نہ صرف محمد شاہ بادشاہ ہی کا نائب تھا بلکہ وہ محمد شاہ رنگیلے کا بھی حقیقی جانشین تھا۔ احمد شاہ نے تخت نشینی کے بعد اپنے آپ کو عیش و عشرت میں غرق کر لیا تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت حرم ہی میں گزارتا۔ کئی کئی ماہ تک دربار میں نہ آتا۔ احمد شاہ کا زنانہ محل چار مربع میل پر پھیلا ہوا تھا۔ جس میں بے شمار حسین و جمیل عورتیں موجود تھیں۔ اور وہ کئی ماہ تک کسی مرد کا چہرہ نہیں دیکھتا تھا۔ مردانہ کھیلیں جو کھلے میدان میں کھیلی جاتی تھیں وہ زنان خانہ ہی میں کھیلا کرتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ان کھیلوں میں برائے نام لباس میں ملبوس عورتیں شامل ہوتی تھیں۔

احمد شاہ کی ان حرکتوں کی وجہ سے مغلیہ سلطنت مزید کمزور ہو گئی اور مغل تاج کی

عملداری صرف دہلی کے آس پاس کے علاقوں تک ہی محدود ہو گئی۔ مرکز کے عدم استحکام کی وجہ سے تمام صوبے خود مختار ہو گئے۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ میں نواب علی وردی خان نے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ گجرات میں مرہٹوں نے لوٹ مار شروع کر دی اور وہاں مغلیہ اقتدار ختم ہو گیا۔ اودھ میں نواب صفدر جنگ مرکز سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ روہیل کھنڈ میں روہیلوں نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ دکن میں نظام الملک آصف خان کی اولاد مرکز کی اطاعت سے روگردان ہو چکی تھی۔ دوآبہ کے وسطی علاقوں میں بنگش برسرِ اقتدار آ گئے تھے اور پنجاب کا امن احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے تہ و بالا کر رکھا تھا۔ پورے ہند میں افراتفری اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا اور بادشاہ انتظامِ سلطنت سے قطعاً بے نیاز محل کی رنگینیوں میں محو تھا۔

میر منو حاکم پنجاب

احمد شاہ کے ابتدائی زمانہ حکومت میں نواب میر قمر الدین کا لائق لڑکا معین الملک میر منو پنجاب کا گورنر تھا۔ اس کے عہد میں اِس علاقے میں کافی حد تک امن و امان قائم رہا اور خوشحالی کا دور دورہ شروع ہوا۔ شاہنواز خان سابق گورنر پنجاب کا جرنیل کوڑا مل ملتان کا نائب گورنر تھا۔ میر منو نے بھی اس کے حسنِ انتظام، نظم و نسق کی اعلیٰ صلاحیت اور تدبر سے متاثر ہو کر اس کو اس عہدے پر برقرار رہنے دیا۔ کوڑا مل نے سرکاری آمدنی میں بہت اضافہ کیا۔ اس نے منظم طریقہ سے زمینداروں اور عوام سے محصولات وصول کئے اور بد دیانتی اور رشوت ستانی کی لعنت کو دور کرنے کے لئے ایماندار مخلص اور محنتی عامل مقرر کئے۔

سکھوں کے خلاف میر منو کی کارروائی

دیوان لکھپت رائے زکریا خاں اور بعد ازاں اس کے بیٹے یحییٰ خان کے عہد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا تھا۔ اس نے سکھوں کی سرکوبی کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اور اس نے خود ایک ہزار سکھوں کو ایمن آباد (ضلع گوجرانوالہ) سے گرفتار کر کے لاہور

میں دہلی دروازے کے باہر قتل کروایا تھا۔ علاوہ ازیں لکھپت رائے نے سکھوں کے استیصال کے لئے سخت احکامات جاری کئے۔ یحیٰی خان اور لکھپت رائے اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ لیکن اس کے بعد لکھپت رائے بذاتِ خود جیل میں بند ہو گیا اور احمد شاہ نے پنجاب پر حملہ کر دیا۔ اس انتشار اور بدامنی کے دور میں سکھوں نے پھر طاقت حاصل کر لی اور احمد شاہ ابدالی کی شکست کے بعد میر منو کے گورنر پنجاب مقرر ہونے کے چند ماہ بعد دوبارہ لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کر دی۔ سکھ امرتسر کے مقدس تالاب پر اکثر آتے تھے اور اسی مقام پر سکھوں کا ہر چھ ماہ بعد اجلاس ہوتا تھا اور اس میں شمولیت کے لئے سکھ پنجاب کے تمام علاقوں سے جمع ہوتے تھے۔ سکھ جس راستے سے بھی گزرتے تھے قتل و غارت، آتش زنی اور لوٹ مار کرتے جاتے تھے۔ یہ لوگ قتل و غارت گری ثواب حاصل کرنے کے لئے کرتے تھے۔ سکھوں نے لوٹ مار سے حاصل کردہ مال و اسباب جمع کرنے اور دفاعی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پنجاب میں جگہ جگہ قلعے تعمیر کرنے شروع کر دیئے تھے۔

۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی کے حملے سے سکھوں کو ایک سنہری موقع ہاتھ آ گیا۔ اور انہوں نے قلعوں کی تعمیر کا سلسلہ تیز کر دیا اور لاہور کے گرد و نواح میں کئی قلعے بن گئے تھے۔ لہذا میر منو نے سکھوں کے خلاف کاروائی کرنے سے پہلے ان قلعوں کو مسمار کرنے کا فیصلہ کیا۔ جو ان کی سماج دشمن سرگرمیوں کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ لہذا گورنر پنجاب نے عملی قدم اٹھاتے ہوئے سب سے پہلے سکھوں کے اس قلعہ پر حملہ کیا جو انہوں نے امرتسر میں مٹی اور گارے سے تعمیر کیا تھا۔ اس قلعے کا نام گلی رام رتنی تھا اور سکھ اسے مقدس خیال کرتے تھے۔ میر منو نے سب سے پہلے اس قلعے پر حملہ کیا اور کئی ہزار سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار کر قلعہ مسمار کر دیا۔ میر منو نے بھی سابقہ گورنر کے وزیر رائے لکھپت رام کی طرح حکم جاری کیا کہ تمام سکھ اپنے بال اور داڑھی وغیرہ منڈوائیں۔ علاوہ ازیں میر منو کی طرف سے عوام کے نام ایک اپیل جاری کی گئی کہ وہ جس شخص کو بھی سکھوں کے لباس میں پائیں یا اس حلیہ میں دیکھیں اسے گرفتار کر لیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔ اس ضمن میں میر منو

کو سکھوں کے خلاف نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ ہزاروں سکھوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور باقی ماندہ سکھ پہاڑوں اور جنگلوں میں جہاں مرہٹوں نے اپنی کمین گاہیں بنا رکھی تھیں، روپوش ہو گئے۔ میر منو نے اپنے ماتحت تمام راجاؤں اور نوابوں کے نام احکامات جاری کر دیئے کہ وہ یا تو اپنے اپنے علاقوں میں سکھوں کا صفایا کر دیں یا انہیں گرفتار کر کے پابہ زنجیر لاہور روانہ کر دیں۔ چنانچہ ان ماتحت راجاؤں، نوابوں اور جاگیرداروں وغیرہ نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً سکھوں کے خلاف کاروائی شروع کر دی اور ہزاروں کو موت کی نیند سلا دیا۔ اور بڑی تعداد میں گرفتار کر کے لاہور بھیجے اور یوں بیرون دہلی گیٹ لاہور روزانہ سینکڑوں سکھ قتل کئے جانے لگے۔

سکھوں نے بعد میں اس جگہ کا نام "شہید گنج" رکھ دیا۔ میر منو کے مقرر کردہ ملتان کے ہندو نژاد نائب گورنر راجا کوڑا مل نے اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال کر کے سکھوں کے تحفظ کا منصوبہ بنایا۔ اس نے جالندھر دوآب کے گورنر آدینہ بیگ کو اپنے ساتھ ملایا۔ اس نے راجا کوڑا مل کو کہا کہ سکھوں کو مذہبی و سیاسی تحفظ مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ باقی ماندہ رعایا کی طرح حکومت کو محصولات آبیانہ اور مالیہ وغیرہ ادا کریں اور حکومت کے خلاف معاندانہ سرگرمیاں اور رعایا کے خلاف اپنی قتل و غارت کی کاروائیاں ختم کر دیں۔ لیکن جب اس قسم کے احکامات جاری ہوئے تو سکھوں نے اس کے یہ معنی اخذ کئے کہ حکومت پنجاب ان سے مرعوب ہو گئی ہے۔ لہذا انہوں نے لوٹ مار کا سلسلہ تیز تر کر دیا۔ امرتسر کے مقام پر سکھوں کا تہوار تھا۔ آدینہ بیگ نے اپنی محدود فوجی قوت کے ساتھ سکھوں کو گھیر کر گرفتار کر لیا۔ انہیں اندرونی تحفظ دیا گیا لیکن وہ اِس پر مطمئن نہ ہوئے۔ میر منو نے ان تمام گرفتار شدہ سکھوں کو قتل کر دیا۔ اس سختی کی بنا پر سکھ اور زیادہ مشتعل ہو گئے۔ اس طرح گورنر پنجاب سکھوں کی وحشت و بربریت میں کوئی کمی نہ کر سکا۔ جتنی زیادہ سختی گورنر پنجاب نے سکھوں پر کی سکھ اتنے ہی زیادہ متحد ہوتے گئے۔ اور ان کی تاخت و تاراج میں اضافہ ہوتا گیا۔ سکھوں نے اپنے مختلف گروہ بنا لئے جنہیں وہ دَل کہتے تھے۔ یہ لوگ مسافروں وغیرہ کو لوٹتے اور بعد میں قتل کر دیتے۔

سکھوں نے گورنر پنجاب کو امرتسر کے سالانہ اجلاس میں اپنا دشمن اول قرار دیا اور اُسے جلاد کے نام سے پکارنے لگے۔ سکھوں کی تعداد دن بدن بڑھتی گئی۔ مذہبی جوش واتحاد اور باہمی محبت اور بھائی چارے کی وجہ سے سکھوں کی سیاسی اور فوجی طاقت میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تمام سکھ اپنے مذہبی عقائد کے تحفظ کے لئے گرو کے نام پر سلطنت قائم کرنے کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر قربانی پر تیار ہو گئے۔ سکھوں نے صرف مسلمانوں کو قتل کرنے کا عہد کر لیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے مسلمانوں سے متعلق تمام املاک بھی تباہ و برباد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ سکھوں نے مسلمانوں کو نہ صرف پنجاب بلکہ پورے برصغیر سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔

زمیندار طبقے کی بغاوت

پنجاب کے زمینداروں نے سکھوں کے اکسانے اور چند دیگر پوشیدہ عناصر کے اشارے پر میر منو کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ یہ بغاوت نہ صرف میر منو کے خلاف تھی بلکہ اس کے ماتحت تمام گورنروں کے خلاف بھی تھی۔ یہ بغاوت ۱۷۴۸ء میں ملتان کے نائب گورنر راجا کوڑا مل کے اشارے پر ہوئی تھی کیونکہ وہ میر منو کی سکھ دشمنی سے متنفر تھا۔ آدینہ بیگ کو وہ پہلے ہی اپنے ساتھ ملا چکا تھا۔ زمینداروں سے جب دریافت کیا گیا کہ گورنر سے ان کو کیا شکائیت ہے تو انہوں نے کہا کہ وہ سرکاری حکام کی بداخلاقی سے نالاں ہیں۔ دوسرے سکھ آئے دِن لوٹ مار کرتے ہیں اور ہمارا تمام غلہ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

ایک طرف تو یہ زمیندار سکھوں کے خلاف شکایت کرتے تھے اور دوسری طرف خود سکھوں سے ہر ممکن امداد لے کر حکومت کو تنگ کرتے تھے۔ ان کے اس رویے سے تنگ آکر میر منو نے ان کی بغاوت کو سختی سے کچلنے کا فیصلہ کیا اور وہ ابھی اسے فرو کرنے ہی میں مصروف تھا کہ احمد شاہ ابدالی کے پنجاب پر دوسرے حملہ کی افواہیں ملنا شروع ہوئیں۔ کیونکہ ایک تو وہ اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور دوسرے اس سرزمین کی دولت وثروت میں بڑی کشش تھی۔

احمد شاہ ابدالی کا دُوسرا حملہ

ابدالی کے لاہور پہنچنے سے قبل میر منو نے اپنے تمام نائب گورنروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کو حکم دیا کہ وہ اپنی ممکنہ طاقت کے ہمراہ فوراً لاہور پہنچ جائیں۔ لہذا راجا کوڑا مل نائب گورنر ملتان اور آدینہ بیگ نائب گورنر جالندھر دوآب اپنی اپنی فوجوں کے ہمراہ لاہور پہنچ گئے۔ گورنر میر منو اپنی مقدور بھر جنگی قوت کے ہمراہ لاہور سے روانہ ہوا اور دریائے چناب کے شمالی کنارے وزیر آباد کے مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ میر منو نے دہلی دربار کو بھی تیز رفتار قاصد روانہ کئے کہ جتنی جلدی ہو فوج اور توپخانہ روانہ کر دیں۔

احمد شاہ ابدالی نے بڑی سرعت سے دریائے سندھ اور جہلم کو عبور کر کے میر منو کی فوج کے بالمقابل چھ میل کے فاصلے پر دریائے چناب کے شمالی کنارے پر ڈیرے ڈال دیئے۔ گورنر کے جاسوسوں نے احمد شاہ ابدالی کی فوجی قوت کے متعلق میر منو کو مطلع کیا جو پنجابی فوجوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ علاوہ ازیں گورنر دہلی دربار سے مایوس ہو گیا۔ اور عوام نے بھی بے رُخی کا مظاہرہ کیا۔ لہذا میر منو اپنے مشیروں اور فوجی جرنیلوں سے صلاح مشورے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ابدالی کو کچھ دے کر ٹال دیا جائے۔ اور اس سے کوئی معاہدہ کر لیا جائے۔ اس پر گورنر نے احمد شاہ ابدالی کے پاس اپنا ایک سفیر صلح کے لئے روانہ کیا۔ ابدالی صلح پر فوراً تیار ہو گیا۔ کیونکہ وہ بھی جنگِ منارہ میں میر منو کے ہاتھ دیکھ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مجھے شکست میر منو کی وجہ سے ہوئی تھی۔

جب دونوں جانب کے نمائندوں کے مذاکرات ہوئے، تو اس کے بعد حکمرانوں کی ملاقات ہوئی اور مندرجہ ذیل شرط پر صلح ہوئی:

> ''گورنر پنجاب پچاس لاکھ روپیہ تاوانِ جنگ فی الفور ادا کرے گا۔ اس کے علاوہ پسرور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ اور گجرات وغیرہ کا لگان اور آبیانہ بھی ہر سال بصورتِ خراج ادا

کیا کرے گا۔"

اس کے علاوہ میر منو نے احمد شاہ ابدالی کی یہ شرط بھی منظور کر لی کہ احمد شاہ ابدالی کی افغان اور درانی سپاہیوں پر مشتمل کچھ فوج پنجاب میں رہے گی۔ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ فوج کو پنجاب میں چھوڑ جانے کی درخواست خود میر منو نے کی تھی۔ جسے احمد شاہ ابدالی نے قبول کر لیا تھا۔ چونکہ اس نے دہلی دربار کی اجازت کے بغیر احمد شاہ ابدالی سے معاہدہ کیا تھا لہذا اسے خدشہ تھا کہ دربار میں موجود اس کا مخالف عنصر بادشاہ کو مجبور کرے گا کہ وہ اس کے خلاف کاروائی کرے۔ اس خطرہ کے پیشِ نظر اس نے ابدالی سے فوجی دستوں کو پنجاب میں متعین کرنے کی درخواست کی تھی۔

اس طرح احمد شاہ ابدالی گورنر پنجاب سے معاہدہ کر کے واپس قندھار چلا گیا۔

میر منو اور دربار دہلی

منو ابدالی معاہدہ کی خبر جونہی دہلی پہنچی۔ دربار میں میر منو کے مخالف وزیر صفدر جنگ نے اس کے خلاف بادشاہ کے کان بھرے کہ میر منو نے بادشاہ کی منظوری کے بغیر دشمن سے معاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے میر منو کے چچا زاد بھائی اور لاہور کے سابق گورنر شاہنواز خان کو ملتان کا گورنر نامزد کر کے بھیج دیا۔ اس وقت کوڑا مل میر منو کی طرف سے ملتان کا ناظم تھا۔ شاہنواز فوج لے کر ملتان پر قبضہ کرنے کی غرض سے بڑھا۔ میر منو نے کوڑا مل کو مزاحمت کے لئے بھیجا اور آخری دم تک مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ غرض شاہنواز اور کوڑا مل کے لشکر کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ ابتداء میں شاہنواز کا پلہ بھاری رہا لیکن بعد میں کوڑا مل نے بھرپور حملہ کیا جس میں شاہنواز خان سمیت اس کے بہت سے سپاہی ہلاک ہوئے اور باقی راہِ فرار اختیار کر گئے۔ میر منو نے اس کامیابی سے خوش ہو کر کوڑا مل کو 'راجا' کا خطاب دیا۔ اور ملتان کی گورنری کے عہدے پر فائز کر دیا۔ گویا میر منو اب دربار دہلی کے احکامات کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اور جس کو چاہتا خطاب بخشتا۔ اس سے مرکز کی کسمپرسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ میر منو نے تاوانِ جنگ ادا کر کے اور آئندہ خراج وغیرہ

کا وعدہ کر کے احمد شاہ ابدالی سے وقتی طور پر گلو خلاصی کرائی تھی۔ اور اپنی فوجی قوت میں زبردست اضافہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس فوجی قوت کے بل بوتے پر اس نے دہلی سے فرستادہ فوج کو بھگا دیا تھا۔ جو ہر قسم کے ہتھیاروں اور بھاری توپخانہ سے لیس ہو کر ملتان آئی تھی۔ دوسرے اب مغلیہ حکومت میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ فوجی قوت کے بل پر میر منو جیسے بہادر اور مدبر جرنیل کو اطاعت کے لئے مجبور کر سکے۔ اب دہلی دربار کا خوف میر منو کے دِل سے دُور ہو چکا تھا۔ چنانچہ جب اس نے اپنی فوجی قوت بہت بڑھا لی تو اس نے اپنی اس طاقت کے زعم میں احمد شاہ ابدالی کو خراج کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ اور کہلا بھیجا کہ ابدالی فوجوں کی آمد کی وجہ سے کاشت وغیرہ نہیں ہو سکی اور فصل نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لئے درانی فوج یہاں سے واپس چلی جائے۔ اور اگلے موسم میں اگر فصل اچھی ہوئی تو خراج ادا کر دیا جائے گا۔ احمد شاہ ابدالی کو یہ سن کر بہت غصہ آیا اور اس کو وعدہ خلافی کی سزا دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

احمد شاہ ابدالی کا تیسرا حملہ

میر منو کی وعدہ خلافی کے بعد احمد شاہ ابدالی اِس کی سرزنش کے لئے ۱۷۵۱ء میں تیسری بار پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ دریائے چناب عبور کر کے سوہدرہ کے مقام پر ڈیرے ڈال دیئے اور اپنے ایک وزیر سکھ جیون مل کو میر منو سے گفت و شنید کے لئے لاہور روانہ کیا۔ ملاقات ہونے پر گورنر نے کہا کہ قبل ازیں پنجاب کے تمام زمینداروں اور کسانوں نے بغاوت کر دی ہے اور فصلیں وغیرہ تباہ ہو گئی تھیں۔ دوسرے درانی فوج کی موجودگی میں زمینداروں نے مالیہ و آبیانہ وغیرہ ادا کرنے سے انکار کر دیا اور جب ان پر سختی کی گئی تو وہ بغاوت پر تل گئے۔ میر منو نے دیوان سکھ جیون مل کو مزید بتایا کہ جونہی ابدالی فوجوں کی آمد کا ان کسانوں اور زمینداروں نے سُنا تو وہ تمام اپنے گھربار چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس صورت میں کس سے مالیہ اور آبیانہ وصول کیا جائے۔ اگر ابدالی فوجیں واپس چلی جائیں تو عوام اپنے گھروں میں واپس آجائیں گے اور بعد میں ہمارے

کارندے ان سے واجبات وصول کرلیں گے۔ اس گفت وشنید کے بعد دیوان سکھ جیون مل احمد شاہ ابدالی کے پاس سوہدرہ کے کیمپ میں واپس چلا آیا۔ اور اس نے اسے اپنے مذاکرات کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ لیکن احمد شاہ پر ان دلائل کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ وزیر آباد سے پیش قدمی کر کے کالا شاہ کاکو میں آکر خیمہ زن ہو گیا۔

ابدالیوں اور پنجابیوں میں جنگ

میر منو نے احمد شاہ ابدالی کے حملے کی مدافعت کے لئے انتظامات شروع کر دیئے۔ قلعہ کی فصیل، برج اور دروازوں وغیرہ کی مرمت کروا کر گولہ بارود جمع کرنا شروع کر دیا۔ میر منو نے اپنی والدہ اور دیگر اہلِ خانہ کو جموں منتقل کر دیا تھا تاکہ وہ بُرے وقت سے محفوظ رہ سکیں۔ میر منو نے اپنے تمام اتحادیوں کے علاوہ گورنر ملتان راجا کوڑا مل، جالندھر دوآب کے حاکم آدینہ بیگ اور کشمیر کے گورنر کو پروانے جاری کر دیئے۔ کہ وہ اپنی فوج اور جنگی ساز وسامان کے ساتھ فوراً لاہور آجائیں۔

جب احمد شاہ ابدالی کالا شاہ کاکو کے مقام پر خیمہ زن تھا تو میر منو نے بھی دریائے راوی کو عبور کر کے شاہدرہ کے مقام پر ڈیرے ڈال دیئے اور دریا پر کشتیوں کا پل تعمیر کر دیا۔ اس نے دریائے راوی کو اپنے عقب میں رکھ کر سامنے خندقیں کھودلیں اور اپنی دفاعی پوزیشن کو مضبوط کر کے بیٹھ گیا۔ جونہی احمد شاہ ابدالی نمودار ہوا تو لاہوری توپخانے نے گولہ باری شروع کر دی۔ احمد شاہ ابدالی نے بھی اسی شدت سے جواب دیا۔ کئی دن تک اسی طرح آگ برستی رہی لیکن کوئی فوج پیش قدمی نہ کر سکی۔ اس عرصہ میں درانیوں نے اپنے عقبی علاقے کو بالکل تباہ و برباد کر دیا۔ ایک روز اچانک درانیوں نے کالا شاہ کاکو سے اپنے خیمے اکھاڑنے شروع کئے۔ انہوں نے شمال جنوب سے راوی کو عبور کر کے شالا مار کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ لہذا اس صورتِ حال کے پیشِ نظر میر منو نے بھی اپنی پوزیشنیں بدلیں اور شہر کو عقب میں رکھ کر سامنے خندقیں کھودلیں۔ پنجابیوں اور ابدالیوں میں چار ماہ تک مسلسل جھڑپیں ہوتی رہیں۔ لیکن کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس کا پلّہ

بھاری رہا۔ اس محاصرے کی وجہ سے اہل لاہور کی حالت بہت دگرگوں ہو گئی۔ اشیائے خوردنی کا قحط پڑ گیا۔ جانوروں کے لئے چارہ ختم ہو گیا۔ فوج سامانِ رسد سے محروم تھی۔ اس عالم میں میر منو نے اپنے جرنیلوں کو صلاح مشورے کے لئے بلایا۔ جن میں سے اکثر نے صلح کی تجویز پیش کی، لیکن راجا کوڑا مل حاکمِ ملتان نے اس تجویز کی مخالفت کی اور دلیل یہ دی کی مخالف فوج کے سپاہی برفانی علاقوں کے باشندے ہیں لہذا وہ برصغیر کی گرمی کا مقابلہ خندقوں میں بیٹھ کر نہیں کر سکتے۔ دوسری دلیل یہ تھی کہ درانیوں کا بھی سامانِ رسد ختم ہو گیا ہے۔ ان کی حالت ہم سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ گردونواح کا علاقہ تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ ان کے مقابلے میں ہماری پوزیشن مضبوط اور بہتر ہے۔ اگر ابدالی حالات سے مجبور ہو کر بڑا حملہ کرنے کے لئے خندقوں سے نکلے گا تو ہماری گولہ باری سے نہ صرف اسے شکست ہو گی بلکہ اس کا سارا لشکر بھی تباہ و برباد ہو جائے گا اور ایک بھی ابدالی سپاہی زندہ بچ کر واپس نہیں جا سکے گا۔ اگر وہ حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا تو اسے محاصرہ اٹھا کر واپس جانا پڑے گا۔ تمام امراء نے اس سے اتفاق کیا اور بذاتِ خود پنجابیوں نے احمد شاہ ابدالی پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔

معرکہ آرائی

۱۲ اپریل ۱۷۵۲ء کو پنجابیوں نے دشمن کی کمزور پوزیشن پر سخت اور شدید حملہ اپنے تیار شدہ پروگرام کے مطابق کیا۔ میر منو بذاتِ خود ابدالیوں کے قلب پر اور راجا کوڑا مل آدینہ بیگ میمنہ و میسرہ پر حملہ آور ہوئے۔ دن کے بارہ بجے تک سخت معرکہ آرائی ہوتی رہی آخر کار ابدالیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ احمد شاہ ابدالی نے بذاتِ خود اپنے گھوڑ سوار دستوں سے جوابی حملہ کیا لیکن پنجابیوں نے اس حملے کو روک کر اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور اسے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ درانی توپخانہ بھی دوپہر تک متواتر آگ برساتا رہا۔ پنجابی فوجوں نے بار بار اس قدر شدید حملے کئے کہ ابدالیوں کی شکست کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ حالات سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ پنجابیوں کو فتح حاصل

ہونے والی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے راجا کوڑا مل کے ہاتھی کا پاؤں ایک پرانی قبر پر جا پڑا۔ اور وہ بھاری بھرکم جانور سنبھل نہ سکا۔ راجا کوڑا مل ہاتھی کے ہودے سے نکل کر دور جا گرا۔ ایک افغان سپاہی نے بڑی ہی پھرتی سے آگے بڑھ کر راجا کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اور اسے اوپر اٹھا لیا۔ راجا کوڑا مل کی موت کی خبر لشکر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی جس سے پنجابی فوج میں بددلی اور انتشار پیدا ہو گیا۔ لیکن پھر بھی پنجابی میدانِ جنگ میں ڈٹے رہے اور مقابلہ جاری کیا۔ اس کے چند گھنٹوں کے بعد میر منو کا ایک اور جرنیل عزیز بیگ اپنے پانچ بیٹوں کے ہمراہ محمود بوٹی گاؤں کے پاس مارا گیا۔ یہ خبر بھی پنجابی فوجیوں کے لئے حوصلہ شکنی کا باعث بنی اور ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ جونہی میر منو نے اپنی فوج کی یہ حالت دیکھی تو اس نے فوج کو واپسی کا حکم دیا اور شہر اور قلعہ کے گرد کھدی ہوئی خندقوں کے پیچھے جا کر دفاعی پوزیشن اختیار کر لی۔ اور اس طرح دو ماہ تک مزید جنگ جاری رہی، لیکن پھر بھی کوئی فیصلہ کن بات ظاہر نہ ہوئی۔ اس پر گورنر پنجاب میر منو نے احمد شاہ ابدالی کے وزیر کی وساطت سے صلح کی درخواست کی۔ جونہی میر منو کی صلح کی درخواست ابدالی کو پہنچی اس نے اسے فوراً قبول کر لیا۔ چونکہ احمد شاہ ابدالی بھی چھ ماہ کے عرصے میں پنجابیوں کے ہاتھوں اپنے کئی ہزار فوجی مروا چکا تھا۔ اور طویل جنگ سے تنگ آ چکا تھا۔ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ اگر چند دن تک میر منو صلح کی درخواست نہ کرتا تو احمد شاہ خود ہی محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو جاتا۔ چونکہ سامانِ رسد کی شدید قلت تھی۔ علاوہ ازیں گرمی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ دوسرے پنجابیوں کی جرأت مندانہ مدافعت کا دبدبہ ابدالیوں کے دلوں پر طاری ہو چکا تھا۔ پنجابیوں نے اپنی جیتی ہوئی جنگ محض اپنی جلد بازی سے ہار دی۔ چونکہ راجا کوڑا مل جس نے جنگ کرنے کے لئے تمام امراء کو قائل کیا تھا مارا جا چکا تھا اور اب اکثریت ان لوگوں کی تھی جو صلح کے حق میں تھے۔

میر منو اور ابدالی میں معاہدہ

جب میر منو کی صلح کی درخواست منظور ہو گئی تو منو ابدالی ملاقات کا بندوبست کیا

گیا۔ شالامار باغ میں دونوں حکمرانوں کی ملاقات ہوئی۔ گورنر پنجاب جو تقریباً خودمختار ہو چکا تھا جب بادشاہ احمد شاہ ابدالی کے سامنے پیش ہوا تو بادشاہ نے اسے مخاطب کر کے پوچھا: ''تم پہلے اتنی دیر تک کہاں تھے؟ جو اپنے آقا کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔'' تو گورنر میر منو نے جواب دیا: ''میرا ایک اور آقا ہے۔ میں اب تک اسی کی خدمت میں تھا۔'' احمد شاہ ابدالی نے پھر سوال کیا: تمہارے اس آقا نے تمہیں اِس عظیم تباہی سے کیوں نہ بچایا؟'' میر منو نے بڑی جرأت سے جواب دیا'' میرے آقا کو یقین تھا کہ اُس کا خادم اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے۔'' اس پر احمد شاہ ابدالی نے پھر سوال کیا'' فرض کرو کہ اگر میں تمہارے سامنے گرفتار ہو کر پیش کیا جاتا تو تم میرے بارے میں کیا حکم صادر کرتے؟''

میر منو نے بہادرانہ لہجے میں جواب دیا'' میں تمہیں لوہے کے پنجرے میں بند کر کے اپنے آقا کے پاس بھیج دیتا۔'' احمد شاہ ابدالی نے پھر سوال کیا'' اب جب کہ تم میرے رحم و کرم پر ہو، تم مجھ سے کس قسم کے سلوک کی امید رکھتے ہو؟'' اس پر پنجاب کے نوجوان گورنر میر منو نے بڑی جرأت سے جواب دیا'' اگر تم سوداگر ہو تو مجھے بیچ دو! اگر تم جلاد ہو تو مجھے قتل کر دو! اگر بادشاہ ہو تو شاہانہ فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے معاف کر دو۔''

میر منو کے مذکورہ جواب پر احمد شاہ ابدالی بہت خوش ہوا۔ اسے بڑھ کر اپنے گلے سے لگایا اور اسے ''فرزند خان بہادر رستم ہند'' کا خطاب دیا۔ میر منو نے گیارہ گھوڑے مع زین اور دو ہاتھی مع ہودہ احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں بطورِ نذرانہ پیش کئے۔ علاوہ ازیں پچاس لاکھ روپیہ تاوان ادا کیا۔ سرہند کا علاقہ افغانستان میں شامل کر کے ابدالی نے میر منو کو دوبارہ گورنر مقرر کیا اور خود کشمیر کی جانب واپس چلا گیا۔

ابدالی کے بعد پنجاب کی حالت

پنجابیوں اور افغانوں میں چھ ماہ سے جنگ جاری تھی، جس کا اِس صلح کے بعد خاتمہ ہو گیا، لیکن اِس دوران میں تمام پنجاب میں سکھوں نے پھر سے تباہی و بربادی کا سلسلہ شروع کر کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ میر منو گورنر پنجاب نے جالندھر

دوآبہ کے حاکم آدینہ بیگ کو حکم دیا کہ وہ سکھوں کا سختی سے محاسبہ کرے۔ سکھ ''مکھووالی'' کے مقام پر اپنا مقدس تہوار منا رہے تھے کہ آدینہ بیگ نے ان پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے کی وجہ سے کئی ہزار سکھ موت کے گھاٹ اتر گئے۔ آدینہ بیگ کی فوج میں کچھ سکھ افسر بھی تھے۔ جن میں جسا سنگھ کلال زیادہ اہم ہے۔ جسا سنگھ اور آدینہ بیگ کے درمیان سکھوں کے متعلق گفتگو ہوئی۔ آدینہ بیگ نے جسا سنگھ سے کہا کہ سکھوں کو چاہیے کہ وہ حکومت کو دیگر عوام کی طرح ٹیکس ادا کر کے امن و امان سے زندگی بسر کریں۔ حکومت اس کے صلہ میں انہیں مذہبی آزادی دے گی۔ یعنی دونوں طرف سے تشدد کا استعمال ختم کر دینا چاہیے۔ جسا سنگھ کلال نے سکھوں سے گفت وشنید کی اور تمام گروہوں سے ذاتی ملاقاتیں کر کے انہیں پرامن رہنے کی تلقین کی۔ وہ ان کے متعدد اجتماعوں میں شریک ہوا اور وہاں سکھوں سے خطاب بھی کیا۔ اسے سکھوں میں اتنی مقبولیت ہوئی کہ وہ سکھوں کا رہنما بن گیا۔

احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت میر منو کو دہلی دربار سے کسی قسم کی کوئی مدد نہ ملی تھی۔ اور نہ ہی مغلیہ بادشاہ نے اس جنگ میں کوئی مداخلت کی تھی۔ چونکہ بادشاہ کو ملکی امور سے نہ کوئی لگاؤ تھا اور نہ کوئی دلچسپی تھی۔ وہ ہمہ وقت عورتوں کے جھرمٹ میں رہتا تھا۔ علاوہ ازیں دربار دہلی میں امراء کی باہمی چپقلش اور ریشہ دوانیاں ہو رہی تھیں۔ احمد شاہ نے اپنی تخت نشینی کے وقت جاوید خان کو مغلیہ دربار میں سب سے اعلیٰ منصب پر فائز کیا تھا۔ اور بعد ازاں اسے ''نواب بہادر'' کا خطاب بھی دیا۔ قلیچ خان کا پوتا غازی الدین، سپہ سالار کے عہدہ پر فائز تھا۔ لہٰذا صفدر جنگ ان دونوں یعنی غازی الدین اور جاوید خان کے دربار میں اثر ونفوذ اور روز افزاں ترقیوں سے حسد کرنے لگا۔ اس نے بادشاہ اور اس کی والدہ کو اعتماد میں لے کر جاوید خان کے خلاف نفرت کا اظہار کیا لیکن صفدر جنگ کے خیالات کو احمد شاہ اور اس کی والدہ نے پسند نہ کیا۔ جب اس کا علم جاوید خان کو ہوا تو اس نے صفدر جنگ کے خلاف جوابی سازش کی۔ امراء کی اس کشمکش سے دہلی سلطنت کا نظم ونسق نہ صرف درہم برہم ہو گیا تھا بلکہ مغلیہ سلطنت کا رہا سہا وقار بھی ختم ہو گیا۔ احمد شاہ درباری امراء کے جھگڑوں سے تنگ آ گیا تھا اور وہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے چند امراء کو اپنے اعتماد میں لیا اور دوسرے امراء کے خلاف اس مہم کا آغاز کیا۔ جس کے نتیجے میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جو چھ ماہ تک جاری رہی۔ غازی الدّین نے مرہٹوں کو اپنی مدد کے لئے بلا لیا۔ اس نے صفدر جنگ کو شکست دی جو شکست کے بعد اودھ کی طرف بھاگ گیا۔ اس پر بادشاہ احمد شاہ ایک بڑی فوج لے کر غازی الدّین کی سرزنش کے لئے میدانِ جنگ میں نکل آیا اور سکندر آباد میں خیمہ زن ہو گیا۔ دوسری طرف مغل افواج کے سپہ سالار غازی الدین نے مرہٹوں کی فوج کے ہمراہ شاہی فوج پر زبردست حملہ کیا۔ اس جنگ میں مرہٹہ فوج نے بادشاہ احمد شاہ کے مغلیہ لشکر کو چند گھنٹوں میں تتر بتر کر دیا اور بادشاہ اپنی بیگمات کو بھی میدانِ جنگ میں چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ مرہٹوں نے خاندانِ مغلیہ کی بہو بیٹیوں کی بے حرمتی کی اور ان کے تمام زیورات اور مال و اسباب لوٹ لیا۔ لیکن بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ سپہ سالار غازی الدین نے تمام مستورات کو میدانِ جنگ سے باحفاظت دہلی روانہ کر دیا تھا۔ اور بعد ازاں خود بھی دہلی کی جانب روانہ ہوا۔

سپہ سالار غازی الدین نے دہلی پہنچ کر بادشاہ احمد شاہ اور اس کی والدہ دونوں کو گرفتار کر لیا۔ ۵ جون ۱۷۵۴ء کو بادشاہ احمد شاہ کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔ بعد ازاں اسے سلیم گڑھ کے قلعہ میں قید کر دیا گیا اور وہ اس قید ہی میں ۱۷۷۵ء میں فوت ہوا اور اس کے معزولی کے بعد سپہ سالار غازی الدین نے جہاندار کے دوسرے بیٹے عز الدّین کو تخت پر بٹھایا۔

میر منو کی وفات

احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد گورنر پنجاب میر منو زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا۔ دراصل میر منو خاندان مغلیہ کے دگرگوں حالات کی وجہ سے دل شکستہ ہو گیا تھا۔ دوسرے اُسے احمد شاہ کی اطاعت قبول کرنے کا بھی بہت افسوس تھا۔ اگرچہ وہ ایک مدبر، بہادر اور جنگجو مغل گورنر تھا لیکن قسمت نے اسکا ساتھ نہ دیا۔

احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد سکھوں کو سر اٹھانے کی ہرگز اجازت نہ تھی۔

میر منو سکھوں کے خلاف ایک مہم پر قصور گیا۔ یہ مہم اس نے فتح کر لی۔ مہم کے بعد فراغت میں وہ اکیلا ہی کھیل رہا تھا کہ گھوڑی سیخ پا ہو کر سرپٹ دوڑنے لگی۔ یہ زین پر سنبھل نہ سکا اور اس حالت میں گرا کہ اس کا ایک پاؤں رکاب میں اٹکا رہ گیا۔ سرکش گھوڑی دوڑتی گئی اور میر منو زمین پر گھسٹتا چلا گیا۔ بالآخر اسی حالت میں فوت ہو گیا۔

میر منو کی موت کے بعد اس کی بیوہ مراد بیگم (مغلانی بیگم) نے اپنے بیٹے امین الدین خان کی جانشینی کے لئے جس کی عمر صرف تین سال تھی، کابل اور دہلی درخواستیں روانہ کیں۔ کمسن امین الدین کو میر منو کا جانشین تسلیم کر لیا گیا۔ جب میر منو کی موت کی اطلاع احمد شاہ ابدالی کو ملی تو اس نے میر منو کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ''ایران، توران اور ہندوستان کا سب سے بہترین اور بہادر جرنیل چل بسا۔'' احمد شاہ ابدالی میر منو کی وفات پر بہت رنجیدہ ہوا اس نے تعزیت کا پیغام ارسال کیا اور اس کے کمسن بیٹے امین الدین خان کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ علاوہ ازیں مراد بیگم کو ہر ممکن امداد کا یقین دلایا۔ مراد بیگم خود بھی بہت فہم و فراست والی خاتون تھی۔

ابوالعدل عزالدّین عالمگیر ثانی

(۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۹ء)

سپہ سالار غازی الدین نے احمد شاہ کی معزولی کے بعد جہاندار شاہ کے دوسرے بیٹے عزالدّین کو ''ابوالعدل عزالدین محمد عالمگیر ثانی بادشاہ غازی'' کے لقب سے ۱۷۵۴ء میں تخت نشین کیا۔ بادشاہ کی عمر تخت نشینی کے وقت پچپن سال تھی۔ عالمگیر ثانی نے تمام عمر ملک کے مختلف قید خانوں میں گزاری تھی۔ چنانچہ اسے ملکی امور، سیاسی و انتظامی معاملات سے کوئی واقفیت اور تجربہ نہ تھا۔ اس لئے وہ بھی اپنے پیش رو مغل تاجداروں کی طرح درباری امراء کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں وہ چونکہ بوڑھا ہو چکا تھا اس لئے اسے دنیاوی معاملات سے کوئی لگاؤ نہ تھا بلکہ وہ ہمہ وقت عبادتِ الٰہی اور تلاوت کلام مجید میں مصروف رہتا تھا۔ یا پھر تاریخی کتب کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ وہ ایک متقی و پرہیز گار بادشاہ تھا۔ اسے عیش و عشرت سے فطری طور پر نفرت تھی۔ جنگی قابلیت، مصائب برداشت کرنے، خودسر درباری امراء کو قابو کرنے کی صلاحیت بھی اس میں موجود نہ تھی۔ بادشاہ کی ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر امراء من مانیاں کرنے لگے۔ یہاں تک کہ بادشاہ کے ولی عہد کو قتل کر دیا گیا اور بادشاہ کچھ نہ کر سکا۔ دربار میں وزیراعظم غازی الدین چھایا ہوا تھا۔ اس کا اقتدار اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ وہ تمام سرکاری آمدنی خود ہضم کر جاتا تھا اور شاہی خاندان مالی پریشانیوں کا شکار رہتا۔ سلطنت دہلی میں انتشار کی صورتِ حال کے ماتحت صوبوں میں خودمختاری کی رو جس شدّت کے ساتھ چل رہی تھی اس کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے۔ خاص طور پر مرہٹے بہت طاقتور ہو گئے تھے اور دہلی ہمیشہ ان کی زد میں رہتا تھا۔ جب چاہتے آ کر لوٹ لیتے۔ مغلیہ سلطنت سمٹ سمٹا کر دہلی کے گرد و نواح میں صرف چند اضلاع تک ہی محدود ہو گئی تھی۔

مراد بیگم بحیثیت گورنر پنجاب

پنجاب کے مردِ آہن میر منو کی وفات کے بعد حالات مزید خراب ہو گئے۔ جالندھر دوآب کے نائب گورنر آدینہ بیگ نے سکھوں سے معاہدہ کر لیا تھا۔ اس معاہدے سے کیوجہ سے سکھوں کو کچھ اطمینان نصیب ہوا اور انہوں نے اس عرصے میں اپنی فوجی اور سیاسی قوت میں بہت زیادہ اضافہ کر لیا تھا۔ سکھوں پر سختیوں کے باوجود ان کی قوت کو مغلیہ حکومت قطعی طور پر کچل نہ سکی تھی۔ سکھوں نے گورو کے نام پر سکھ حکومت قائم کرنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ ان کی طاقت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے برعکس پنجاب کی حکومت کی حالت بہت دگرگوں تھی۔ میر منو کی وفات کے بعد اس کا کمسن لڑکا امین الدین خان اپنی ماں مراد بیگم کی سرپرستی میں حاکم لاہور مقرر ہوا۔ اسے دہلی اور کابل دونوں حکومتوں کی رضامندی حاصل تھی، لیکن بدقسمتی سے ننھا گورنر بھی صرف دس ماہ کے بعد چیچک کیوجہ سے فوت ہو گیا۔ دربارِ لاہور کے سرکردہ امراء نے اعلان کیا کہ ہم میر منو کی بیوی مراد بیگم جو ابتک ننھے گورنر کی سرپرست رہی ہے کو اپنا مستقل گورنر بنائیں گے۔ اس مرتبہ بھی یہ مسئلہ توثیق کیلئے دہلی اور کابل کی حکومتوں کو بھیجا گیا۔ جنہوں نے اِس تقرر کی منظوری دے دی۔ احمد شاہ نے مراد بیگم کو بیٹے کی وفات پر پیغامِ تعزیت بھیجا اور مستقبل میں اسے اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

مراد بیگم (مغلانی بیگم) کا تمام امرائے دربار بے احترام کرتے تھے اور اس کے تمام احکام پر دل و جان سے عمل کرتے تھے لیکن اس کے زمانے میں دربارِ لاہور دہلی اور کابل کی حکومتوں کی ریشہ دوانیوں کا اکھاڑہ بنا رہا۔ دربار میں دونوں حکومتوں کے حامی موجود تھے۔ جو اپنے اپنے آقاؤں کے مفاد کے لئے برسرکار رہتے۔ دربار پر زیادہ تر ابدالی عنصر چھایا ہوا تھا جبکہ دہلوی عنصر پنجاب کو دوبارہ اپنے قابو میں لانے کے لئے سازشیں کرتا رہتا تھا۔ مراد بیگم نے پنجاب کے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے مقدور بھر جدوجہد کی اور نظم و نسق کو برقرار رکھا لیکن کابل اور دہلی کے جاسوس اس کے راستے میں

رکاوٹ بنتے رہے اور یوں حالات خراب سے خراب تر ہونے لگے۔

روز روز کی سازشوں سے تنگ آکر مغلانی بیگم نے حالات کی درستگی کے لئے احمد شاہ ابدالی سے مداخلت کی اپیل کی۔ اس کی اپیل پر احمد شاہ ابدالی نے فوراً اپنے ایک نمائندے جہان خان درانی کو لاہور روانہ کر دیا اور اس کو ابدالی کی طرف سے یہ اختیارات حاصل تھے کہ وہ دہلی دربار کے تمام جاسوسوں اور ہوا خواہوں کو ختم کر دے اور ابدالی کی حکومت کی جانب سے پنجاب میں قانون کی حکمرانی بحال کرے۔ جونہی ابدالی شاہ کا نمائندہ لاہور پہنچا تو بادشاہ عالمگیر ثانی کے وزیر غازی الدین اعتماد الملک نے اپنے ہمنام سپہ سالار غازی الدین حیدر کو فوج دے کر لاہور روانہ کر دیا تاکہ وہ دہلی کے مفادات کو مکمل پامال سے بچائے۔ اب پنجاب دو حکومتوں کی سیاسی کشمکش کا میدان بن گیا تھا۔ ان حالات سے سکھوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں بھی مراد بیگم نے اپنی صلاحیتوں کے مطابق عوام کی بہتری اور انتظامِ حکومت کی اصلاح کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں جن کا کوئی مفید نتیجہ سامنے نہ آیا۔

مراد بیگم کا زوال

دربار لاہور میں جاسوسوں کی اس قدر اکثریت تھی کہ مراد بیگم کو ہر شخص جاسوس نظر آنے لگا حتیٰ کہ وہ ان پرانے امراء سے بھی بدظن ہو چکی تھی جنہوں نے اسے اس منصب پر فائز ہونے میں مدد دی تھی اور جن کے بل بوتے پر وہ حکومت کر رہی تھی۔ میر بخاری کا اندوہناک انجام اس کی اس بدگمانی کی انتہا ہے۔ میر بخاری، جو میر منو کا ایک قابلِ اعتماد ساتھی تھا، ان دنوں مراد بیگم کا وزیر اعظم تھا اور حکومت کے تمام انتظامات اسی کے ذمے تھے۔ ایک دن میر بخاری چند کاغذات پر احکام لینے کے لئے مراد بیگم کے پاس اس کے زنان خانے میں چلا گیا۔ اس بات پر مراد بیگم کو بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنی خاتون ملازموں کو حکم دیا کہ میر بخاری کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ تمام نوکرانیاں ڈنڈے اور جوتے لے کر اس پر پل پڑیں اور اسے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ مؤرخین اس واقعے کے

مختلف اسباب بیان کرتے ہیں۔ بعض مراد بیگم اور بعض میر بخاری کو قصوروار گردانتے ہیں۔ میر منو کے زمانہ کے پرانے امراء نے میر بخاری خاں کی موت پر مغلانی بیگم کے خلاف سخت غم وغصہ کا اظہار کیا۔ انہوں نے دہلی اور کابل کی حکومتوں سے مراد بیگم کے ظلم کے خلاف باقاعدہ احتجاج بھی کیا۔ انہوں نے دربار جانا بھی موقوف کر دیا اور دربار میں انتشار بڑھ گیا۔ دہلی میں اس کے خلاف شکایات موصول ہونے پر ایک قابل اور مدبر شخص سید جلال الدین کو اصلاح احوال کے لئے پنجاب بھیجا گیا۔ جس کا اصل مقصد مراد بیگم کی حیثیت کو مضبوط بنانا تھا۔ اس نے آ کر حالات کی بہتری کے لئے کئی اقدامات کئے۔ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے مراد بیگم حسد کرنے لگی۔ چنانچہ اس نے دہلی لکھا کر جمال الدین کو فوراً واپس بلا لیا جائے لیکن وزیر اعظم دہلی غازی الدین نے اس کی کوئی پروانہ کی۔

احمد شاہ ابدالی کا چوتھا حملہ

مراد بیگم نے ان حالات سے تنگ آ کر احمد شاہ ابدالی کو جہان خان کی وساطت سے مسلح مداخلت کے لئے پیغام بھیجا کہ وہ دوبارہ لاہور کو تاجِ دہلی کی سازشوں سے نجات دلائے۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی نے مکمل غور وخوض اور اپنے امراء سے مشورے کے بعد برصغیر پر فوج کشی کی۔ یہ برصغیر پر اس کا چوتھا حملہ تھا۔ جب احمد شاہ ابدالی کے ساتھ مراد بیگم کے اس گٹھ جوڑ کا علم وزیر اعظم دہلی غازی الدین کو ہوا تو وہ خود اس صورتِ حال سے عہدہ برا ہونے کیلئے ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوا۔ اور انتہائی سرعت کے ساتھ سرہند آ پہنچا۔ اس نے سرہند نے گورنر آدینہ بیگ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس سے وعدہ کیا کہ ابدالی کو شکست دینے کے بعد وہ اسے پنجاب کا گورنر مقرر کر دے گا۔ غازی الدین نے سرہند سے مراد بیگم کی معزولی کے احکام صادر کئے اور وہاں اپنے نمائندے سے غازی الدین حیدر کو لکھا کہ اگر مراد بیگم پس وپیش کرتے تو اس کو فوراً گرفتار کر کے یہاں بھیج دو۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میر منو نے اپنی لڑکی کا رشتہ غازی الدین کے ساتھ کر دیا تھا لیکن میر منو جلد ہی فوت ہو گیا اور یہ شادی نہ ہو سکی۔ چنانچہ اس موقعہ پر

غازی الدین نے پھر پیغام بھیجا کہ اگر مراد بیگم اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کر دے تو اس کے ساتھ کوئی تعرض نہ کرونگا۔ مگر مراد بیگم اور اس کی لڑکی دونوں نے اس کی اس خواہش کو انتہائی حقارت سے رد کر دیا۔ چنانچہ دونوں ماں بیٹی کو گرفتار کر کے سرہند میں غازی الدین کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ یہاں بھی اس نے اسی شادی والی شرط پر سودے بازی کرنا چاہی مگر مراد بیگم اور اس کی لڑکی کا عزم متزلزل نہ ہوا۔ مراد بیگم نے اس کو متنبہ کیا کہ اگر ہمیں کچھ کہا گیا تو احمد شاہ ابدالی اس کا سخت بدلہ لے گا اور وہ نادر شاہ کی طرح مکمل تباہی اور مجسم ہلاکت بن کر ہندوستان میں وارد ہوگا۔ لیکن اس کی اِس تنبیہ کا غازی الدین پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے میر منو کی لڑکی سے زبردستی شادی کر لی اور مراد بیگم کو دہلی میں نظر بند کر دیا۔

ابدالی کا لاہور پر قبضہ

احمد شاہ ابدالی تیاری مکمل کرنے کے بعد کابل سے روانہ ہوا۔ اس نے راستے کے تمام دریاؤں کو بڑی تیزی کے ساتھ عبور کیا اور اچانک لاہور پہنچ گیا۔ جب احمد شاہ ابدالی کی اچانک آمد کی اطلاع آدینہ بیگ کو ملی تو وہ ششدر رہ گیا تھا۔ اس نے لاہور کو خالی کر کے راہِ فرار اختیار کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس کے سکھ فوجی جرنیلوں اور ساتھیوں نے اُسے احمد شاہ ابدالی کا مقابلہ کرنے پر مجبور کیا۔ تو آدینہ بیگ اپنی فوج کے ہمراہ نکلا۔ آدینہ بیگ چونکہ پرانا تجربہ کار جرنیل تھا۔ وہ جانتا تھا کہ احمد شاہ ابدالی کا کھلے میدان میں یا محصور ہو کر مقابلہ کرنا اس کے بس کا روگ نہیں ہے لہذا وہ سکھوں کے اکسانے پر چند روز تک تو ابدالی کا مقابلہ کرتا رہا لیکن آخر کار میدانِ جنگ سے اپنے سپاہیوں کے ساتھ فرار ہو کر کانگڑہ کے پہاڑوں میں روپوش ہو گیا اور پہاڑی راجوں، زمینداروں اور جاگیرداروں میں گٹھ جوڑ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

احمد شاہ نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو لاہور کا گورنر مقرر کیا۔ لاہور سے آدینہ بیگ کا توپخانہ ابدالی کی قوت میں اضافہ کا باعث بنا۔ اسی طرح سرہند سے بھی اسے کافی توپیں ہاتھ لگیں، جہاں آدینہ بیگ کا نائب مقرر تھا۔ بعد ازاں وہ برق رفتاری سے دہلی کی جانب

روانہ ہوا۔

احمد شاہ دہلی میں

احمد شاہ ابدالی سرہند سے پیش قدمی کر کے کرنال پہنچ گیا تھا اور جب مغل بادشاہ عزالدین شاہ عالمگیر ثانی کو اطلاع ملی کہ احمد شاہ ابدالی کرنال پہنچ گیا ہے تو بادشاہ درباری امراء، وزراء اور شہزادوں کو ساتھ لے کر احمد شاہ کے استقبال کے لئے دہلی سے روانہ ہوا۔ دہلی کے عوام چونکہ نادر شاہ کے قتلِ عام اور لوٹ مار دیکھ چکے تھے اس لئے احمد شاہ کے آنے سے ان پر اس قدر دہشت طاری ہوئی کہ انہوں نے اپنے بال بچوں اور ساز و سامان کے ساتھ شہر سے بھاگنا شروع کر دیا۔

احمد شاہ کی آمد پر سب سے زیادہ خطرہ دہلی کے وزیرِ اعظم غازی الدین کو درپیش تھا کیونکہ اس نے مراد بیگم اور اس کی بیٹی کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔ اور احمد شاہ انہی زیادتیوں کا بدلہ لینے کے لئے برصغیر آیا تھا۔ چنانچہ غازی الدین نے مراد بیگم کی منت سماجت کر کے اپنے گناہوں کی معافی چاہی۔ مراد بیگم نے فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی خطاؤں کو بخش دیا۔ بعد میں جب احمد شاہ نے غازی الدین سے اس کے سابقہ افعال کی بنا پر باز پرس کی تو مراد بیگم نے یہاں بھی اس کی سفارش کر کے اس کی جان بچا دی۔ اس درگزر کی ایک وجہ یہ تھی کہ اب غازی الدین مراد بیگم کا داماد بن چکا تھا اور اگر اب احمد شاہ اس کو سزا دیتا تو اس کی براہِ راست زد مراد بیگم کی نو بیاہتا بیٹی پر پڑتی۔ اس لئے غازی الدین کو معاف کر دیا گیا۔ بعد ازاں ابدالی شاہ نے مغل شہنشاہ کو حکم دیا کہ وہ تاوانِ جنگ کے طور پر نوے لاکھ روپیہ فی الفور ادا کریں۔ اس پر امراء اور شہنشاہ نے معذوری کا اظہار کیا کہ وہ اتنی بڑی رقم کا کیونکر بندوبست کریں۔ اہلِ دہلی نے بہت سے حیلے بہانے کئے لیکن ابدالی کے مطالبے میں کوئی لچک پیدا نہ ہوئی۔

خانہ تلاشی اور لوٹ مار کا حکم

جب احمد شاہ اور دہلی دربار کے مابین تاوانِ جنگ سے متعلق کوئی تصفیہ نہ ہو پایا

تو اسی اثناء میں محرم خان ایک خواجہ سرا نے احمد شاہ کو امرائے دہلی کی خانہ تلاشی لینے کا مشورہ دیا۔ اور اس نے خاص طور پر انتظام الدولہ بن قمر الدین، جو مغلیہ افواج کا اہم افسر تھا، کی نشاندہی کی۔ لہذا اس اطلاع پر احمد شاہ نے فوراً دہلی کی طرف روانگی کا حکم دیا اور شہر میں داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے نواب انتظام الدولہ (خانخاناں) کے گھر کا محاصرہ کر لیا گیا اور جب اس کے گھر کو چھانا گیا تو بے شمار زر و جواہر، سونا چاندی اور سونے کی اشرفیاں حاصل ہوئیں۔ لہذا اسی طریق پر تمام امراء کے گھروں کی تلاشی لی گئی تو لاکھوں روپے نقد اور لاکھوں روپے کا سونا چاندی جمع ہو گیا۔ علاوہ ازیں کروڑوں کی مالیت کے ہیرے اور جواہرات دستیاب ہوئے۔ اسی موقع پر مراد بیگم احمد شاہ کے پاس آئی اور اس نے نواب قمر الدین مرحوم کی بیوہ کے گھر کی تلاشی کی سفارش کی جہاں سے تلاشی کے بعد لاکھوں روپیہ نقد، لاکھوں کا سونا چاندی اور لاکھوں ہی کی مالیت کے ہیرے جواہرات برآمد ہوئے۔ اس کے بعد احمد شاہ نے اپنی فوج کو عام لوٹ مار کا حکم دیا اور مزاحمت کرنے والوں کو قتل کر دینے کی اجازت دے دی۔ ابدالی فوج نے دہلی میں نادر کا دور یاد دلا دیا۔ سپاہیوں نے بے دریغ لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت کی اور رعایا کا ناحق خون بہایا۔ اس وحشت و بربریت کے دوران پاکدامن خواتین نے اپنی عزت و ناموس کی خاطر کنوؤں میں چھلانگیں لگا کر اپنی جانیں دے دیں۔ بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ ابدالی فوجیں دو ماہ تک دہلی میں رہی تھیں۔ اور بعض لکھتے ہیں کہ ایک ماہ تک قیام پذیر رہی تھیں۔ اس عرصہ کے دوران شہر دہلی کو تہہ و بالا کر دیا گیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو لاہور سے طلب کیا۔ جسے وہ لاہور کا گورنر مقرر کر گیا تھا۔ اس نے شادی شاہ عالمگیر ثانی بن جہاندار کی بیٹی سے کی اور خود اپنی شادی بادشاہ احمد شاہ بن محمد شاہ رنگیلے کی بیٹی سے کی اور سرہند تک پنجاب کا علاقہ افغان سلطنت میں شامل کر لیا۔

دوسرے شہروں پر حملے

احمد شاہ ابدالی شہر دہلی کو تباہ و برباد کرنے کے بعد یہاں سے روانہ ہوا اور بالم

گڑھ کے قلعہ پر حملہ کیا جو دہلی سے چند کوس کے فاصلے پر واقع تھا۔ (بالم گڑھ موجودہ پالم پور ہی ہے، آجکل یہاں بھارت کا مشہور ہوائی اڈہ ہے) بالم گڑھ کے قلعہ پر مقامی فوجوں سے ابدالی شاہ کی جنگ ہوئی۔ چند ہی روز میں قلعہ فتح ہو گیا۔ بے شمار مال غنیمت ابدالی کے ہاتھ آیا۔ بالم گڑھ کے بعد احمد شاہ مئی ۱۷۵۶ء میں متھرا پر حملہ آور ہوا۔ جب ابدالی نے متھرا پر حملہ کیا تھا۔ تو اس وقت ہندوؤں کا کوئی تہوار تھا اور مندروں میں کروڑوں روپیہ جمع ہو چکا تھا جو ابدالی کے ہاتھ آیا۔

احمد شاہ نے شہر متھرا کے بعد آگرہ کا رُخ کیا۔ آگرہ کے مغل قلعداروں نے احمد شاہ کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا جس میں ابدالی فوج کا کافی جانی نقصان ہوا۔ لیکن مغل قلعدار ابدالی توپخانہ کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اور آگرہ پر ابدالیوں کا قبضہ ہو گیا۔ احمد شاہ نے آگرہ میں بھی وہی کچھ کیا جو وہ قبل ازیں دہلی و متھرا میں کر چکا تھا۔ آگرہ میں اس کی فوج نے برصغیر کی گرمی سے اکتا کر وطن واپس چلنے پر اصرار کیا۔ دوسرے انہیں گھروں سے نکلے ہوئے بھی کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ احمد شاہ ان کا یہ مطالبہ رد نہ کر سکا۔ احمد شاہ آگرہ سے لوٹ مار کرنے کے بعد واپس آ رہا تھا تو آگرہ کے نواح میں آباد جاٹ قبائل نے احمد شاہ کو راستے میں پریشان کیا۔ اس پر احمد شاہ نے جاٹوں کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ ہزاروں کی تعداد میں جاٹوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ پھر وہ واپس آیا اور مغل بادشاہ عزالدین شاہ عالمگیر ثانی کو دوبارہ تخت دہلی سپرد کیا اور بعض انتظامی تقرریاں کرنے کے بعد لاہور واپس آ گیا۔

لاہور میں ابدالی کی مصروفیات

احمد شاہ ابدالی نے لاہور آ کر یہاں چند روز ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ اس قیام کے دوران میں اس نے مقبوضات کا نظم و نسق بہتر بنانے کے لئے حسب ذیل تقرریاں کیں:

۱۔ لاہور اور ملتان کے گورنر کے عہدہ پر احمد شاہ نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو مقرر کیا اور جہان خان جو سابقہ پنجابی دربار میں احمد شاہ کا نمائندہ تھا اور پنجاب کے

بارے میں کافی معلومات رکھتا تھا، کو شہزادہ تیمور شاہ کی رہنمائی کے لئے نائب مقرر کیا۔

۲۔ سرہند کا قلعدار اپنے ایک بہترین جرنیل اور منتظم عبدالصمد خان محمد زئی کو مقرر کیا تھا اور اسے سکھوں کی سرکوبی کے لئے سخت تاکید کی۔

۳۔ جالندھر دوآب کا علاقہ بڑا زرخیز تھا اور اس کے ساتھ ساتھ یہی علاقہ سکھوں کا گڑھ بھی تھا۔ اس علاقہ کا نائب سرفراز خاں افغان کو مقرر کیا اور اسے بھی سکھوں کی سرکوبی کا حکم دیا۔

۴۔ احمد شاہ نے کشمیر کو ۱۷۵۲ء میں فتح کر لیا تھا۔ لیکن ابھی تک کشمیر کا الحاق احمد شاہ نے افغان ریاست سے نہیں کیا تھا۔ ۱۷۵۷ء میں قیام لاہور کے دوران ملتان کے سابق حکمران بلند خاں سرازئی کو کشمیر کا گورنر مقرر کر کے خود برق رفتاری سے قندھار واپس چلا گیا کیونکہ افغانستان پر ترکوں کے حملے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔

تیمور شاہ بطور گورنر پنجاب

تیمور شاہ کے ابتدائی چھ ماہ کے عرصۂ حکمرانی میں تو پنجاب میں امن وامان رہا لیکن جونہی احمد شاہ نے واپسی اختیار کی۔ سکھوں نے جو احمد شاہ کے خوف سے روپوش ہو گئے تھے، دوبارہ پر پرزے نکالنے شروع کئے اور جالندھر دوآب میں پھر لوٹ مار اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تیمور شاہ نے خود ان کی سرکوبی کے لئے عملی قدم اٹھایا اور جالندھر دوآب میں سکھوں کی سرگرمیوں کو بڑی سختی سے دبا دیا۔ اس طرح پنجاب میں پھر امن وامان قائم ہو گیا۔

آدینہ بیگ سابقہ گورنر پنجاب احمد شاہ سے شکست کھانے کے بعد کانگڑہ کے پہاڑوں میں چھپ گیا تھا۔ اس نے پہاڑی راجاؤں اور نوابوں وغیرہ کو اپنا ہمنوا بنانا شروع کیا اور ابدالی حکومت کے خلاف ابھارا، لیکن وہ عملی طور پر تو اس کا ساتھ نہ دے سکے البتہ اخلاقی حمایت کا یقین ضرور دلایا۔ بعد ازاں آدینہ بیگ جالندھر دوآب میں آکر قیام

پذیر ہو گیا اور اس نے سکھوں کو دوبارہ اکسانا شروع کیا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس نے مذہبی سکھوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا۔

چونکہ آدینہ بیگ سکھوں کے مذہبی جنون سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اس وجہ سے اس کی شروع کردہ مہم کو سکھوں نے اپنے مقاصد کے لئے مفید سمجھ کر اور بہت زیادہ تعداد میں اس کی فوج میں بھرتی ہونا شروع کر دیا۔ اس طرح آدینہ بیگ نے سکھوں کی قوت کے ساتھ جالندھر دوآب کو دوبارہ تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔

پنجاب میں افغان فوج کی تعداد بہت کم تھی۔ احمد شاہ واپسی پر چند فوجی دستے نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے لئے تیمور شاہ کے زیرِ کمان چھوڑ گیا تھا اور باقی فوج کو اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ آدینہ بیگ کی سکھ افواج نے جالندھر دوآب کے علاوہ ''رام راونی'' پر قبضہ کر لیا اور اب امرتسر تک ان کی دست درازیاں بڑھ چکی تھیں اور انہوں نے کلانور، بٹالہ اور گورداسپور وغیرہ میں اپنے قلعے دوبارہ مستحکم کر لئے۔ وہ اب پھر پنجاب میں افغان حکومت کے لئے دردِ سر بن گئے۔ اِسی دوران میں آدینہ بیگ اور جسا سنگھ کلال کے درمیان ایک سیاسی معاہدہ ہوا جس کے مطابق طے پایا کہ پنجاب سے افغانوں کے انخلاء کے بعد آدینہ بیگ گورنر ہو گا اور سکھوں کو ہر طرح کی مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔

آدینہ بیگ اور افغانوں میں جنگ

جب آدینہ بیگ اور سکھوں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں تو خانجہان کے مشورہ سے تیمور شاہ نے آدینہ بیگ کو یہ پیغام بھیجا:

> ''ہم آپ کی عقل و دانش اور بحیثیت گورنر پنجاب آپ کی سابقہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ اپنی معاندانہ سرگرمیاں چھوڑ کر اگر لاہور آ جائیں تو نہ صرف آپ کا جان و مال محفوظ رہے گا بلکہ آپ کی شان کے شایان کسی اہم علاقے کی صوبیداری بھی عطا کی جائے گی۔''

لیکن تیمور شاہ کا یہ خط جب آدینہ بیگ کو ملا تو اس نے یہ دعوت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دی اور کہلا بھیجا تھا کہ آدینہ بیگ خود اپنے زورِ بازو سے لاہور حاصل کرلے گا۔ جب آدینہ بیگ کا جواب تیمور شاہ کو ملا تو اس نے ردِ عمل کے طور پر مراد خاں کی زیرِ قیادت افغان فوج پر مشتمل ایک دستہ فوراً آدینہ بیگ کی گرفتاری کے لئے روانہ کیا۔ علاوہ ازیں کشمیر کے نائب گورنر بلند خان کو حکم دیا کہ وہ بھی فوج لے کر مراد خاں کے ساتھ جالندھر دوآب میں مل جائے۔ لہذا لاہور سے مراد خاں اور کشمیر سے بلند خاں آدینہ بیگ کے خلاف روانہ ہوئے۔ سرہند کے نائب عبدالصمد خاں محمد زئی اور جالندھر کے علاقہ دار سرفراز خاں کو بھی یہی پیغام ملا۔ وہ بھی اپنی فوج کے ہمراہ مراد خان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اِس طرح افغان فوج چار بہترین جرنیلوں کی قیادت میں آدینہ بیگ کی سرزنش کے لئے بڑھی۔ دریائے بیاس کے کنارے جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں تو آدینہ بیگ کی فوج میں شامل سکھوں نے اس قدر پامردی اور بے جگری کا مظاہرہ کیا کہ افغان شکست کھا گئے۔ اس معرکہ میں کشمیر کا گورنر سرہند خاں مارا گیا تھا اور افغان فوج کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا۔

جب اس شکست کی اطلاع لاہور پہنچی تو تیمور شاہ کا وزیرِ اعظم جہانخان ایک بڑی فوج لے کر خود آدینہ بیگ کے خلاف روانہ ہوا۔ جب وہ بٹالہ (گورداسپور) کے مقام پر پہنچا تو مراد خان اور سرفراز خان بھی اپنی شکست خوردہ فوج کے ساتھ آکر اس سے مل گئے۔ اس طرح جہان خان کی فوجی قوت میں اضافہ ہوا۔ جونہی آدینہ بیگ کو معلوم ہوا کہ وزیرِ اعظم جہانخان خود فوج کے ہمراہ اس کے خلاف چلا آرہا ہے تو وہ بغیر لڑے دوبارہ پہاڑوں کی طرف فرار ہو گیا۔ آدینہ بیگ کے راہِ فرار اختیار کرنے پر تیمور شاہ نے لاہور سے حکم بھجوایا کہ سکھوں کے گڑھ امرتسر پر حملہ کر کے ان کے قلعوں وغیرہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ لہذا جہان خان نے امرتسر پر حملہ کر کے دوبارہ تیار کردہ قلعے ''رام راونی'' کو مسمار کر دیا۔ اور جو سکھ وہاں پر موجود تھے انہیں قتل کر دیا۔ بٹالہ اور کلانور میں بھی سکھوں کے تعمیر کردہ قلعوں کو مسمار کر دیا گیا۔ تیمور شاہ کی سکھوں کے خلاف یہ مہم اتنی شدید تھی کہ سکھ

اب دو سال تک دوبارہ سر نہ اٹھا سکے۔ لیکن افغان حکومت نے پنجاب میں سکھوں کے مذہبی مقدس مقامات کو مسمار کر کے نہ صرف ایک سیاسی غلطی کی تھی بلکہ انہوں نے اپنی تباہی کو بھی خود دعوت دی تھی۔ اب پھر سکھ مذہب کے نام پر عزمِ تازہ کے ساتھ متحد ہونے لگے۔ سکھوں میں شدید انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف افغانوں کے خلاف کاروائیاں کیں بلکہ پنجاب کے مقامی مسلمانوں کا بھی قتلِ عام اس قدر شدت سے کیا جو تاریخ کا ایک اندوہناک باب ہے۔

سکھوں کا لاہور پر قبضہ

سکھوں نے جالندھر دوآب، امرتسر، بٹالہ، کلانور، گورداسپور اور لاہور کے گردونواح میں قتل و غارت گری کا سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے کسانوں اور زمینداروں سے لگان، ومالیہ وغیرہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ شہزادہ تیمور شاہ اور جہانخان وزیراعظم لاہور سے سکھوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئے۔ تیمور شاہ اور خان جہانخاں دونوں علیحدہ علیحدہ سمتوں میں گئے۔ تیمور شاہ کو متعدد مقامات پر سکھوں سے سامنا کرنا پڑا۔ اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔

آدینہ بیگ نے جو پہاڑوں سے دوبارہ نکل آیا تھا۔ سکھوں کی مدد سے جالندھر دوآب کے گورنر سرفراز خان کو ذلت آمیز شکست دی۔ سرفراز خاں نے راہِ فرار اختیار کی۔ جب جہانخان سرفراز خان کے لئے کمک لے کر پہنچا تو اسے شکست ہو چکی تھی۔ اس صورت میں وزیراعظم سکھوں کے نرغہ میں پھنس گیا۔ دونوں فوجوں میں سخت معرکہ آرائی ہوئی۔ خان جہان اور سکھوں میں جنگ کے دوران افغانوں کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا۔ وزیراعظم جنگ کے دوران ایک موقع پر اپنے گھوڑے سے گر گیا اور سکھ اسے گرفتار یا قتل کرنے کے لئے برق رفتاری سے دوڑے۔ لیکن چند افغان سپاہیوں کی مدد سے خانجہان دوبارہ گھوڑے پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس نے میدانِ جنگ سے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ اس شکست کے بعد افغان سکھوں سے اس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ

وہ لاہور میں اپنی بیگمات اور بچوں تک کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کابل کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے۔ شہزادہ تیمور نے بمشکل رات کی تاریکی میں دریائے چناب عبور کیا۔

افغانوں کے فرار کے بعد آدینہ بیگ کی قیادت میں سکھوں نے پیش قدمی کر کے اپریل ۱۷۵۸ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا اور شاہی خاندان کو قید کر لیا۔ آدینہ بیگ چونکہ مسلمان تھا اس لئے اس نے شاہی خاندان کی بیگمات کو سکھوں کے چنگل سے نکال کر بحفاظت واپس افغانستان بھجوا دیا۔ سکھوں نے لاہور پر حملہ آدینہ بیگ کی قیادت میں کیا تھا۔ اس لئے اب وہ خیال کرنے لگا تھا کہ سکھ صرف میرے لئے لڑ رہے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتا تھا کہ جسا سنگھ کلال اس کی فوج کا محض ایک پرانا جرنیل ہے۔ اور اس نے لاہور پر قبضے کے لئے جتنی بھی کوشش کی ہے، وہ اس کا فرض تھا۔ حالانکہ جسا سنگھ کلال نے لاہور پر اس لئے قبضہ نہیں کیا تھا کہ یہاں آدینہ بیگ گورنری کرلے۔ بلکہ اس لئے کیا تھا کہ یہاں ''خالصہ راج'' قائم کیا جائے۔ چنانچہ جب آدینہ بیگ نے اپنے آپ کو گورنری کے لئے پیش کیا تو جسا سنگھ کلال نے اعتراض کیا۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں نے آدینہ بیگ کو ذلیل و خوار کر کے لاہور سے نکال دیا اور یہاں اپنی حکومت قائم کر لی اور جسا سنگھ کلال کو اپنا حکمران تسلیم کر کے اس کے نام کا سکہ جاری کیا۔

پنجاب پر مرہٹوں کا قبضہ

لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد جب سکھوں نے آدینہ بیگ کو لاہور سے نکال دیا تو اس نے پنجاب کی گورنری کو حاصل کرنے اور سکھوں سے انتقام لینے کے لئے مرہٹوں سے رابطہ پیدا کیا اور رگھوناتھ راہو مرہٹہ سردار سے سیاسی سودے بازی کر لی۔ آدینہ بیگ نے مرہٹہ سردار کو ایک لاکھ روپیہ روزانہ اور دورانِ قیام میں مبلغ پچاس ہزار روپے ادا کرنے کا وعدہ کیا تاکہ وہ پنجاب پر حملہ کر کے اسے سکھوں سے آزاد کرا دے۔ چنانچہ مرہٹہ سردار دہلی سے کوچ کر کے پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ مرہٹہ سردار رگھوناتھ راہو نے سب سے پہلے سرہند کے قلعہ پر حملہ کیا۔ یہیں آدینہ بیگ بھی اس کے ساتھ آکر شامل ہوا۔ سرہند کے

افغان گورنر عبدالصمد خان محمد زئی کے پاس تقریباً بیس ہزار فوج تھی۔ اس نے مرہٹوں کا خوب مقابلہ کیا۔ لیکن ہار گیا۔ سرہند پر قبضے کے بعد آدینہ بیگ نے حکم دیا کہ شہر کو زمین بوس کر دیا جائے اور عوام سے سب کچھ لوٹنے کے بعد انہیں قتل کر دیا جائے۔ سرہند کو مکمل طور پر تاخت و تاراج کر دیا گیا۔ رعایا کو مرہٹوں نے خوب جی بھر کے لوٹا اور بعد ازاں قتلِ عام کیا۔ جو لوگ بھاگ گئے تھے وہ بچ گئے۔ باقی ماندہ درندہ صفت مرہٹہ سپاہیوں کی تلوار کا لقمہ بن گئے۔ سرہند کی فتح کے بعد مرہٹہ فوجیں لاہور کی جانب بڑھیں۔ سکھوں نے مقابلہ کیا اور قلعہ بند ہو گئے۔ مرہٹوں نے سکھوں کو بہت بڑی تعداد میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور شہر کا محاصرہ کر کے قلعے پر زبردست گولہ باری سے سکھوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ لہٰذا جلد ہی لاہور پر بھی مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا۔

شہزادہ تیمور شاہ ابھی کابل واپس نہیں گیا تھا اور وہ سکھوں سے لاہور واپس لینے کے لئے اپنی فوجوں کو مجتمع کر رہا تھا کہ مرہٹوں کی صورت میں ایک دوسری مصیبت آپڑی، چنانچہ اس نے اپنے نائب جہانخان کی رائے کے مطابق ،کچھی رائے، کے مقام پر اپنے دفاع کے لئے خندقیں کھود لیں اور اپنی پوزیشن مضبوط کر کے بیٹھ گئے۔ لیکن جب مرہٹوں نے حملہ کیا تو افغان حملے کی تاب نہ لا کر پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مرہٹوں نے تیمور شاہ کا اٹک تک پیچھا کیا لیکن وہ پسپا ہوتا ہوا دریائے سندھ عبور کر گیا۔ اس وقت اس کے ساتھ صرف دو سو گھوڑ سوار تھے جبکہ باقی ساری افغان فوج سکھوں اور مرہٹوں سے مقابلہ میں کام آچکی تھی۔ مرہٹوں نے دریائے سندھ کا تمام مشرقی علاقہ روند ڈالا۔ ایک مرہٹہ سردار پٹیل دس ہزار گھوڑ سواروں کے ہمراہ تیمور شاہ کے تعاقب میں قلعہ اٹک تک گیا لیکن جب شہزادہ نہ ملا تو اس نے قلعہ اٹک پر قبضہ کر لیا۔ مرہٹوں نے ملتان، ڈیرہ جات اور تمام جنوبی علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔

آدینہ بیگ دوبارہ بحیثیت گورنر پنجاب

پنجاب کی فتح کا کام مکمل ہونے کے بعد آدینہ بیگ کو مئی ۱۷۵۸ء میں مرہٹہ

سردار رگھوناتھ راہو نے ۷۵ لاکھ روپیہ سالانہ خراج کے عوض پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا اور یوں آدینہ بیگ اپنے ارادہ میں کامیاب ہوا۔ مرہٹہ سردار شمہ جی راؤ کو ملتان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اور تمام جنوبی علاقے ملتان کے تحت کر دیئے گئے۔ اس عرصے کے دوران میں پنجاب کا امن وسکون پھر تباہ و برباد ہو گیا چونکہ ایک طرف تو مرہٹے لٹیروں کا لبادہ اوڑھ کر پنجاب پر مسلط ہو گئے تھے۔ دوسری جانب سکھوں نے پھر سر اٹھایا اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ پنجاب کا گورنر مقرر ہونے کے چند ماہ بعد آدینہ بیگ کے خلاف ملیر کوٹلہ کے نواب نے اعلانِ جنگ کر دیا۔ ملیر کوٹلہ کی فوج افغان اور روہیلہ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ یہ فوج جمال خاں اور قطب شاہ کی زیرِ قیادت آدینہ بیگ کی فوج کے مدِ مقابل آئی اور دونوں مسلمان فوجوں میں پھلورہ کے مقام پر گھمسان کا رن پڑا۔ آدینہ بیگ کی فوج کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا اور قریب تھا کہ آدینہ بیگ کی فوج راہِ فرار اختیار کرے۔ لیکن اسی اثناء میں مخالف فوج کا سردار جمال شاہ، آدینہ بیگ کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اور یوں آدینہ بیگ کی شکست فتح میں تبدیل ہو گئی۔ جنگِ پھلورہ کے بعد آدینہ بیگ نے اپنا صدر مقام لاہور کی بجائے بٹالہ ضلع گورداسپور کو بنا لیا۔ جنگِ پھلورہ کے بعد آدینہ بیگ کا تمام پنجاب پر رعب طاری ہو گیا۔ اور اس نے ملتان کے حاکم مرہٹہ سردار شمہ کو اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر نکال باہر کیا۔ علاوہ ازیں ٹھٹھہ سندھ سے بھی مرہٹہ گورنر کو بھگا دیا اور ان دونوں صوبائی مرکزوں میں اپنے بہترین جرنیل اور منتظم بطور نائب گورنر مقرر کر دیئے۔ بعد ازاں مغل شہنشاہ عزالدین شاہ عالمگیر ثانی نے آدینہ بیگ کو "جنگ بہادر" کا خطاب دیا اور اسے پنجاب، ملتان اور ٹھٹھہ کا خودمختار حکمران تسلیم کر لیا۔

سکھوں کی یورش اور آدینہ کی موت

آدینہ بیگ کو پنجاب کا انتظام سنبھالے ابھی چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ سکھوں نے پنجاب کے علاقہ 'ماجھہ' میں پھر اپنی وحشیانہ سرگرمیوں کا آغاز کیا لیکن آدینہ بیگ نے فوراً سکھوں کی سرکوبی کے لئے ایک فوجی دستہ روانہ کیا، جس نے اس علاقہ سے تقریباً بارہ

ہزار سکھ قید کر لئے اور کئی ہزار سکھوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ گرفتار شدہ بارہ ہزار سکھ پنجاب کے نئے صدر مقام 'بٹالہ' لائے گئے، جہاں ان سب کو آدینہ بیگ کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ جس دِن آدینہ بیگ نے بارہ ہزار سکھوں کو قتل کروایا تھا، اسی رات چند نقاب پوش سکھ مسلح ہو کر گورنر کی حویلی میں داخل ہوئے اور رات کو سوتے میں اس کو ہلاک کر دیا۔ یہ واقعہ نومبر ۱۷۵۸ء کو رونما ہوا۔ بعد ازاں اسے جالندھر کے قریب ایک گاؤں میں دفن کر دیا گیا۔ جو بعض مورخین کے خیال میں اس کا آبائی گاؤں تھا۔

شمہ جی مرہٹہ بطور گورنر پنجاب

آدینہ بیگ کی موت کے بعد شمہ جی راؤ نے پنجاب کے انتظامات خود سنبھال لئے اور مرہٹہ فوجوں کو دریائے سندھ تک پھیلا دیا تاکہ پنجاب پر شمال مغرب کی سرحدوں کی جانب سے افغان حملہ آوروں کو روکا جا سکے۔ مرہٹوں کو افغانوں کے حملے کا ہر وقت خدشہ رہتا تھا۔ مرہٹہ سردار ملکی نظم ونسق کو برقرار رکھنے میں بری طرح ناکام ہوئے۔ اس طرح دوبارہ پنجاب میں خلفشار اور بدامنی کا دور دورہ ہو گیا۔ ادھر سکھوں نے بھی اپنی خون آشام سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ آدینہ بیگ کی ہلاکت کے بعد سکھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ سکھ مسلمانوں کو گرفتار کر کے امرتسر لے جاتے اور وہاں اپنے مقدس تالاب ''رام روانی'' کو صاف کرواتے جسے سابق گورنر پنجاب تیمور شاہ نے ملبے سے پر کر دیا تھا۔ سکھ مسلمانوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر دن رات بیگار لیتے تھے اور سُستی کرنے والوں کو کوڑے لگاتے۔ مرہٹہ گورنر سکھوں کی سرگرمیوں کو ختم کرنے میں قطعی طور پر ناکام ہو چکا تھا۔ اس نے مسلمانوں کے قتلِ عام اور بیگار کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا بلکہ بیچارے مسلمان ہی اس کے غیض وغضب کا ہدف بننے لگے۔

سکھوں نے پنجاب کے تمام علاقوں میں از سرِ نو اپنے قلعے تعمیر کر لئے تھے اور آس پاس کی بستیوں سے محصولات وصول کرنے شروع کر دیئے۔ ادھر جب مرہٹہ اہلکار لگان وغیرہ لینے آتے، اور مسلمان ادا نہ کر سکتے تو ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ یوں مسلمان

دوہرے عذاب میں مبتلا تھے۔

دہلی دربار کی حالت

زوال پذیر مغلیہ سلطنت کے دربار میں اٹھارہویں صدی کے وسطی زمانے میں دو شخصیتیں اہم تھیں۔ ایک نجیب الدولہ اور دوسرا غازی الدین عماد الملک وزیر اعظم۔ احمد شاہ ابدالی واپس جاتے ہوئے نجیب الدولہ کو وزیر اعظم مقرر کر گیا تھا۔ اس سے پہلے یہ عہدہ غازی خان کے پاس تھا کیونکہ غازی الدین اعتماد الملک نے مراد بیگم اور اس کی بیٹی سے اچھا برتاؤ نہیں کیا تھا اس لئے اس سے یہ اہم عہدہ چھین کر نجیب الدولہ کو دے دیا گیا تھا۔ نجیب الدولہ کو اس عہدہ پر دیکھ کر عماد الملک حسد کرنے لگا۔

غازی الدین نے کافی عرصے سے مرہٹوں سے ساز باز کر رکھی تھی۔ اس سے پہلے وہ احمد شاہ بن محمد شاہ کو سکندر آباد کی جنگ میں مرہٹوں کی مدد سے شکست دے چکا تھا، اور اس کی گرفتاری کے بعد اس نے جہاندار شاہ کے دوسرے بیٹے عزالدین کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت نشین کرا دیا تھا۔ اب وہ نجیب الدولہ کو نیچا دکھانے اور اس سے اپنا عہدہ واپس لینے کے لئے مرہٹوں کو پھر دہلی بلا لایا۔ اس طرح مرہٹوں اور نجیب الدولہ کی جانب سے لڑنے والی مغل فوجوں میں ڈیڑھ ماہ تک جنگ جاری رہی۔ بالآخر نجیب الدولہ شکست کھا گیا۔ غازی الدین عماد الملک اپنا پرانا عہدہ مرہٹوں کی بدولت پھر حاصل کر کے دوبارہ برسرِ اقتدار آ گیا۔

ادھر احمد شاہ ابدالی کو پنجاب پر مرہٹوں کے قبضے اور اپنے بیٹے کی پسپائی کا پہلے ہی بہت دُکھ تھا۔ اور اب تو اس کا بدترین دشمن غازی الدین پھر دربار دہلی پہ چھا گیا تھا۔ اس صورت میں ابدالی کی تمام ہمدردیاں بادشاہ عالمگیر ثانی کے ساتھ تھیں۔ غازی الدین کو بھی ابدالی خطرے کا احساس تھا۔ اس لئے اس نے بادشاہ اور اس کے بیٹے شہزادہ علی گوہر کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے سازشیں شروع کر دی تھیں۔

عالمگیر ثانی کا قتل

غازی الدین نے ہی عالمگیر ثانی کو تخت دلایا تھا اور وہی اس کا ایک مدت تک وزیر رہا تھا۔ اس لئے بادشاہ مجبوراً اس پر اعتماد کرتا تھا۔ لیکن دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد غازی الدین نے بادشاہ کو قتل کرا دینے کا منصوبہ بنا لیا۔ اِس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک دن غازی الدین بادشاہ کے پاس حاضر ہوا اور اس سے کہا کہ شہر میں قندھار سے ایک بہت بڑا خدا رسیدہ بزرگ وارد ہوا ہے، آپ کو اس کی خدمت میں ضرور حاضر ہونا چاہیے۔ بادشاہ نے چلنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ چنانچہ وزیراعظم بادشاہ کو درویش سے ملوانے کے لئے کوٹلہ فیروز شاہ کے پرانے کھنڈرات میں لے گیا۔ ان کھنڈرات میں غازی الدین نے پیشتر ہی بادشاہ کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جونہی بادشاہ ان کھنڈرات میں داخل ہوا ایک درندہ صفت ازبک سپاہی ''بالا پوش خان'' نے اشارہ ملتے ہی بادشاہ پر خنجر سے حملہ کیا اور پے در پے وار کر کے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس بادشاہ کے قتل کے بارے میں مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مورخین نے تو اس واقعہ کو صحیح بتایا ہے لیکن بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ کو نماز پڑھتے وقت اس کے خلوت کدے میں کسی نے قتل کر دیا اور لاش کھڑکی سے باہر دریائے جمنا کی طرف پھینک دی۔ جہاں اس کی لاش تین دن تک تقریباً برہنہ حالت میں پڑی رہی اور بعد ازاں اسے ہمایوں کے مقبرے میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

یہ نیک دِل، متقی، دین دار اور درویش منش بادشاہ چھ سال مغلیہ تاج کا وارث رہنے کے بعد ساٹھ سال کی عمر میں ۳۰ نومبر ۱۷۵۹ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا۔ اس کے بعد غازی الدین نے کام بخش کے پوتے اور اورنگ زیب عالمگیر کے پڑپوتے محی الملت کو شاہجہان سوم کے لقب سے تخت نشین کر دیا۔

شاہ عالم ثانی

(۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء)

علی گوہر کا اعلانِ تخت نشینی

غازی الدین عماد الملک وزیر اعظم نے شاہ عالمگیر ثانی کو قتل کروا کے اس کی جگہ محی الملت کو تخت نشین کرا دیا تھا۔ شہزادہ علی گوہر بن عالمگیر ثانی جو اپنے باپ کے قتل کے وقت بہار میں تھا۔ اس کو جب دہلی کے حالات معلوم ہوئے تو اس نے بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اِس نے شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ شہزادہ دہلی دربار کے ناموافق حالات کی وجہ سے بنگال ہی میں ۱۷۶۰ء سے ۱۷۷۱ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں رہا۔ اس نے بنگال کو چھبیس لاکھ روپے پنشن کے عوض اس انگریز کمپنی کے حوالے کر دیا تھا۔

اِدھر دہلی میں گو عماد الملک نے محی الملت کو تخت نشین کروایا تھا، لیکن اسے قبولِ عام ہرگز حاصل نہ ہو سکا کیونکہ اسے عوام اور اکثر درباری امراء ناپسند کرتے تھے۔ دہلی کے عوام اور امراء نے شاہ عالم کو بارہا دہلی آنے کی دعوت دی۔ بالآخر ۱۷۷۲ء میں دہلی آیا۔ چونکہ اس وقت غازی الدین عماد الملک جو اس کا جانی دشمن تھا دہلی چھوڑ کر دکن چلا گیا جو وہیں ۱۸۰۰ء میں فوت ہو گیا۔ ایسٹ انڈیا کے جرنیل لیک (Lake) نے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کر لیا اور مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

احمد شاہ ابدالی کا پانچواں حملہ (۱۷۶۱ء)

احمد شاہ ابدالی نے برصغیر پر کئی حملے کئے لیکن اس کا پانچواں حملہ فیصلہ کن اور دور رس نتائج کا حامل تھا۔ اس کے اسباب حسبِ ذیل تھے:

۱۔ غازی الدین نے احمد شاہ ابدالی کے مقرر کردہ وزیر اعظم دہلی کو مرہٹوں کی مدد سے ہٹا کر خود یہ منصب سنبھال لیا تھا۔ اِس کے علاوہ آدینہ بیگ نے مرہٹوں ہی کی امداد سے ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ کو لاہور سے ذلت آمیز پسپائی پر مجبور کیا تھا۔ احمد شاہ ان دونوں باتوں پر بہت برہم تھا۔ مگر ترکوں کے ساتھ کشمکش کی وجہ سے وہ فوری طور پر برّ صغیر میں نہ آسکا۔

۲۔ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی وجہ سے برصغیر میں مسلمانوں کا مستقبل مخدوش ہو کررہ گیا تھا۔ مرہٹے ہر طرف دندناتے پھرتے تھے۔ ان کو کوئی روکنے والا نہ تھا۔ مرہٹوں نے مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال کر اپنی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ ان کی ان اسلام دشمن سرگرمیوں پر برّ صغیر کے مسلمان اکابر نے احمد شاہ کو اسلام کی مدد کے لئے بلایا۔ ان میں سب سے اہم شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ کی ہے۔ دوسرے سکھ خصوصیّت سے مسلمانوں کے لئے بہت بڑا خطرہ بن چکے تھے۔ ان کی غارت گری کا مرکزی ہدف مسلمان ہی تھے۔ احمد شاہ قبل ازیں کئی بار ان کی سرکوبی کے لئے آیا تھا مگر یہ لوگ مقابلہ کرنے کی بجائے روپوش ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کا مکمل قلع قمع نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ یہاں سے کئی چھوٹے حکمران بھی ان کی امداد کرتے تھے۔

ابدالی کی روانگی

احمد شاہ برصغیر پاک و ہند کے بعض مسلمان حکمرانوں اور حضرت شاہ ولی اللہ کے دعوت ناموں اور یقین دہانیوں کے علاوہ اپنے ذاتی رنج کی بناء پر چالیس ہزار افغان اور ایرانی سواروں کے ہمراہ کابل سے روانہ ہوا اور دریائے سندھ، جہلم اور چناب کو برق رفتاری سے عبور کرتا ہوا لاہور پہنچ گیا۔ جب سکھوں نے احمد شاہ کی اچانک آمد کی خبر سنی تو وہ پھر چوہوں کی مانند اپنے بلوں میں جا گھسے۔ علاوہ ازیں مرہٹہ سردار جو آدینہ بیگ کے ہمراہ پنجاب آئے تھے ان میں سے متعدد تو اُسی وقت چلے گئے، جب انہوں نے

پنجاب پر قبضہ کر کے آدینہ بیگ کو ۷۵ لاکھ روپے سالانہ کے عوض گورنر مقرر کیا تھا۔ باقی ماندہ مرہٹہ سردار ابدالی شاہ کی آمد کی اطلاع پاتے ہی تمام پنجاب اور ٹھٹھہ وغیرہ کو خالی کر کے دہلی پہنچ گئے تھے۔ جہاں مرہٹے تمام ہندوستان سے اکٹھے ہو رہے تھے۔ ابدالی نے اگست ۱۷۵۹ء میں لاہور پر قبضہ کر کے یہاں چند سو سپاہیوں کے ساتھ ایک امیر کو اپنا نائب مقرر کر کے دہلی کی جانب کوچ کیا۔ سرہند پر بھی احمد شاہ نے بغیر مزاحمت قبضہ کر کے وہاں اپنا نائب مقرر کیا اور بعد ازاں سفر جاری رکھتے ہوئے اس نے دریائے جمنا کو سہارن پور کے مقام پر عبور کیا۔ عوام جو مرہٹوں کی وحشیانہ اور بہیمانہ سرگرمیوں سے خوفزدہ ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا چھپے تھے، کو جونہی انہیں احمد شاہ ابدالی کی آمد کی اطلاع ملی، وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔ اور مرہٹے بھی لوٹ کھسوٹ چھوڑ کر جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

چند ابتدائی معرکے

ابدالی فوجیں ابھی دریائے جمنا کو سہارنپور کے مقام سے عبور کر ہی رہیں تھیں کہ ابدالی ہراول دستہ سے مرہٹوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ ہراول دستہ میں روہیلہ سردار حافظ رحمت اللہ خان اور نجیب الدولہ بھی اپنی دس ہزار فوج کے ہمراہ شامل ہو گئے تھے۔ مرہٹہ فوج کی تعداد اسی ہزار گھوڑ سواروں پر مشتمل تھی۔ توپخانہ اور پیادہ فوج اس کے علاوہ تھی۔ بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی اور اس کا سپہ سالار مشہور جرنیل سردار دتہ جی راؤ تھا۔ اور بعض لکھتے ہیں کہ یہ مرہٹہ فوج دراصل حافظ رحمت اللہ خان اور نجیب الدولہ کے خلاف روانہ ہوئی تھی۔ تاکہ وہ احمد شاہ ابدالی سے نہ مل سکیں۔ اور اس کی آمد سے قبل ہی ان کا صفایا کر دیا جائے۔ لیکن وہ ابدالی ہراول دستے میں آ کر شامل ہو چکے تھے کہ جب مرہٹہ جرنیل دتاجی رائے اپنی کثیر فوج کے ساتھ بدلی کے مقام پر ابدالی کے ہراول دستہ پر حملہ کر دیا۔ مرہٹوں نے اپنے ٹڈی دل لشکر سے افغان اور روہیلہ فوج کو گھیر لیا۔ اور اس قدر شدید حملہ کیا کہ ہراول دستے میں خوف و ہراس اور بدنظمی بھی پھیل گئی۔

مرہٹوں نے روہیلوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں چند ہی گھنٹے کے اندر چھ ہزار روہیلے شہید کر دیئے گئے اور پانچ سو کے قریب سخت زخمی ہوئے۔ اس موقع پر احمد شاہ ابدالی کے ہراول دستے کے ایک سردار احمد خان بنگش والی فرخ آباد نے فوراً اپنے اس توپخانہ کو گولہ باری کا حکم دیا، جو اونٹوں پر لدا ہوا تھا، (مؤرخ اسے گشتی توپخانہ بھی کہتے ہیں) ۔حکم ملتے ہی توپچیوں نے آگ برسانا شروع کر دی۔ اس گشتی توپخانہ نے اس قدر شدت سے مرہٹوں پر گولے برسائے کہ تھوڑی ہی دیر میں ان کی لاشوں کے انبار لگ گئے۔ اس کے علاوہ احمد خان بنگش نے اپنے زیر کمان دس ہزار گھوڑ سواروں سے مرہٹہ فوج پر شدت کے ساتھ جوابی حملہ کیا کہ مرہٹے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

اس اثناء میں احمد شاہ ابدالی دریائے جمنا کو عبور کر چکا تھا اور وہ بھی اپنے مخصوص گھوڑ سوار دستے کے ہمراہ فوراً میدانِ جنگ میں پہنچ گیا، لیکن بادشاہ کی آمد سے قبل احمد بنگش نے میدان جیت لیا تھا۔ اس جنگ میں مرہٹوں کی فوج کے ۸۰ ہزار گھوڑ سوار مکمل طور پر تباہ ہو گئے۔ اور ان کا سپہ سالار مرہٹہ سردار راؤ دتہ جی ناتھ سندھیا بھی میدانِ جنگ میں قتل ہو گیا۔ صرف ایک مرہٹہ سردار ملہار راؤ ہلکر بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکا۔ مگر وہ بھی ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو زبردست کامیابی ہوئی۔ مرہٹوں کا بھاری توپخانہ بھی ابدالیوں کے ہاتھ لگ گیا۔

ملہار راؤ ہلکر فرار کے بعد ان تمام مرہٹوں کو جمع کر کے دوبارہ دہلی سے چند میل کے فاصلے پر سکندر آباد کے مقام پر مقابلہ کے لئے آ گیا۔ جو دوسرے علاقوں میں لوٹ کھسوٹ کی غرض سے سرگرداں تھے، لیکن ملہار راؤ ہلکر اس جنگ میں بھی تمام مرہٹہ سپاہیوں کو جہنم رسید کر کے خود فرار ہو گیا۔

ابدالی دہلی میں

سکندر آباد کے معرکے کی کامیابی کے بعد احمد شاہ تیسری مرتبہ دہلی میں داخل ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کے دہلی میں قیام کے دوران چند سفارتی نمائندوں نے تحفہ تحائف اور

نذرانے وغیرہ پیش کیے۔ راجا جے پور اور راجا مارواڑ نے بذاتِ خود ابدالی کی خدمت میں حاضر ہو کر نذرانے پیش کیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے بھی ایک نمائندہ نذرانے لے کر حاضر ہوا۔ علاوہ ازیں متعدد چھوٹے چھوٹے راجے، نواب اور جاگیردار بھی اس کی خدمت میں تحائف پیش کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ احمد شاہ ابدالی کو اسی اثناء میں چند دیگر حکمرانوں نے غیر جانبداری کی اطلاع دی۔ ان میں درج ذیل کا نام قابلِ ذکر ہے:۔

۱۔ بنگال کا نواب سراج الدولہ
۲۔ ایسٹ انڈیا کمپنی
۳۔ شجاع الدولہ والیِ اودھ
۴۔ مہاراجا جے پور اور مارواڑ
۵۔ غازی الدین عماد الملک وزیرِ اعظم شہنشاہ ہند
۶۔ راجپوتانہ کے جملہ راجپوت راجاؤں نے بھی باقاعدہ طور پر اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیا۔

احمد شاہ چند دن دہلی میں قیام کرنے کے بعد دریائے جمنا عبور کر کے نواب شجاع الدولہ والیِ اودھ سے گفت و شنید کی غرض سے ''شہر انوب'' کے لئے روانہ ہوا۔ چونکہ نواب شجاع الدولہ نے پرزور الفاظ میں اسے حملہ کی دعوت دی تھی اور ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا تھا۔ شہر انوب میں احمد شاہ نے نواب شجاع الدولہ سے مذاکرات کے بعد اسے اپنے ساتھ ملایا۔ اس شہر میں احمد شاہ نے موسمِ برسات بھی گزارا تھا۔

دہلی میں مرہٹوں کی آمد

احمد شاہ ابدالی کی برصغیر میں آمد کے بعد مرہٹوں اور ابدالیوں میں دو ابتدائی خون ریز معرکے دہلی کے مضافات میں ''بدلی'' اور ''سکندر آباد'' کے مقام پر ہوئے۔ بدلی میں تو مرہٹوں کی اسی ہزار گھوڑ سوار فوج بالکل ناکارہ ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ ان

کے کئی نامور جرنیل بھی ہلاک ہو گئے تھے۔ اس کے بعد سکندر آباد میں بھی کئی ہزار مرہٹے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ جب مرہٹوں کے اس زبردست جانی اور مالی نقصان کی اطلاع پیشوا بالا جی راؤ کو ملی تو اس نے مسلمانوں اور احمد شاہ ابدالی کے خلاف مرہٹہ قوم کو مذہبی جذبہ کی آڑ لے کر خوب اُبھارا اور اپنے پیشوائے اوّل کی پیشین گوئی کا حوالہ دے کر فتح کی نوید سنائی۔ اس طرح مرہٹے اپنے مذہب کے تحفظ اور اپنے پیشوا کے قول کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ پیشوا نے اپنے بیٹوں سادھا شورائے بھاؤ اور ملہار راؤ کے علاوہ نامی گرامی مرہٹہ سرداروں کو اپنی پرخلوص دُعاؤں اور خوشگوار امیدوں کے ساتھ روانہ کیا۔ جب مرہٹوں کا یہ ٹڈی دل لشکر دہلی کی طرف بڑھا آ رہا تھا تو راستہ میں ریاست 'بھرت پور' کا راجا 'سورج مل جاٹ' اپنے تیس ہزار راجپوت شہسواروں کے ساتھ مرہٹہ لشکر میں شامل ہو گیا۔ علاوہ ازیں جنوبی دکن کی ایک بڑی جنگجو قوم پنڈارے کا پندرہ ہزار گھوڑ سواروں پر مشتمل مضبوط دستہ بھی مرہٹوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اعداد و شمار کے مطابق مرہٹوں کی کل طاقت درج ذیل تھی:

۱۔ پیشوا کی روانہ کردہ کل سپاہ تین لاکھ پیادہ اور پچپن ہزار سواروں پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ ان کے پاس تین سو بھاری توپیں بھی تھیں۔

۲۔ پندرہ ہزار پنڈارے سوار۔

۳۔ راجا بھرت پور والی بھرت پور کے تیس ہزار شہسوار۔

۴۔ راجا گوبند راؤ بندھیلہ کے بارہ ہزار گھوڑ سوار۔

اس طرح مرہٹوں کی طاقت تین لاکھ پیدل اور ایک لاکھ بارہ ہزار سوار فوج پر مشتمل تھی۔ اس پر تین سو بھاری توپوں کی قوت مستزاد تھی۔

مرہٹوں کی دہشت گردی

احمد شاہ ابدالی کی غیر موجودگی میں مرہٹوں کے اس ٹڈی دل لشکر نے دہلی پر حملہ

کیا تو بڑی آسانی سے ابدالی جرنیل نجابت خان اور افغان فوجی دستے کو تہ تیغ کر کے دہلی پر جولائی ۱۷۶۰ء میں قبضہ کر لیا۔ قبضہ کے بعد مرہٹوں کے سپہ سالار وشوارائے نے سلاطین دہلی اور مغلیہ بادشاہوں کی تاریخی یادگاروں کو بہت نقصان پہنچایا۔ اور مسلمان رعایا کا قتلِ عام کیا اور لوٹ گھسوٹ کا بازار گرم کر دیا گیا۔ بالاجی باجی راؤ کے بیٹے سادھا شوراؤ بھاؤ نے دہلی میں مسلمانوں کی خانقاہوں، مسجدوں اور مغلیہ بادشاہوں کے مقبروں کو تہس نہس کر دیا۔ اور ان عمارتوں میں استعمال شدہ قیمتی پتھر، سونا اور جواہرات نکال لئے۔ شہنشاہ شاہجہان کے تعمیر کردہ دیوان خاص کر چھتوں میں استعمال شدہ تمام سونا اور چاندی اکھاڑ لیا اور بیگمات کے پاس جو قیمتی زیورات اور ہیرے تھے وہ بھی چھین لئے اور دوسرا سامان بھی لوٹ لیا۔

ابدالی کی غضبناکی

احمد شاہ کو دہلی میں مسلمانوں کے قتلِ عام، مقدس مقامات کی بے حرمتی، شاہی محلات کی تباہی کے متعلق مرہٹوں کی بربریت کی اطلاع ملی۔ اس کے بعد دوسری اطلاع یہ ملی کہ کنجپورہ میں مرہٹوں نے احمد شاہ کے مقرر کردہ تمام سپاہی سوائے قلعدار یعقوب خان درانی کے شہید کر دیئے گئے ہیں۔ ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو جب بادشاہ کے پاس یہ تمام خبریں پہنچیں تو اس نے مرہٹوں سے انتقام لینے کا پختہ عزم کر لیا۔ اس نے پہلے قرآن کریم سے چند آیات پڑھ کر ایک تیر پر پھونک ماری اور تیر کو اپنی کمان میں جوڑ کر دریائے جمنا کی طرف چلایا۔ اس کے فوراً بعد بادشاہ ابدالی نے 'بسم اللہ، اللہ اکبر' با آواز بلند پڑھتے ہوئے دریائے جمنا میں چھلانگ لگا دی اور احمد شاہ کے ساتھ ہی شاہی فوج کے چار ہزار بہترین شہسواروں نے بھی اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے۔ بعد ازاں باقی لشکر بھی دریا میں کود پڑا۔ دریا میں طغیانی اپنے جوبن پر تھی۔ لیکن ابدالی سپاہی ایک دوسرے کی مدد سے تختوں اور لکڑیوں کے سہارے دریا عبور کر گئے۔ اس اچانک حکم کی وجہ سے باربرداری کے سینکڑوں جانور، کافی مقدار میں گولہ بارود، اور متعدد توپوں کے علاوہ سینکڑوں سپاہی

بھی دریا کی موجوں کی نذر ہو گئے۔ دریا عبور کرنے کے فوراً ہی بعد اس نے عام حملے کا حکم دیا۔ لیکن وزیروں اور امراء کے کہنے پر حملے کا حکم واپس لے لیا کیونکہ فوج ایک تو منظم نہ تھی اور دوسرے وہ دریا کی لہروں کا مقابلہ کر کے قدرے تھک چکی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے اس جرأت مندانہ اقدام سے مرہٹہ لشکر میں ہراس پھیل گیا اور ان کے کئی سردار ہمت ہار بیٹھے، اور میدان چھوڑ گئے۔ ان میں بعض روایتوں کے مطابق بھرت کا راجا ''سورج مل'' بھی تھا۔ جو اپنے تیس ہزار راجپوتوں کے ہمراہ میدانِ جنگ سے مُنہ موڑ گیا۔

مرہٹے پیچھے ہٹتے ہٹتے آخر پانی پت کے تاریخی میدان میں خندقیں کھود کر مورچہ بند ہو گئے۔ یکم نومبر ۱۷۶۰ء کو احمد شاہ ابدالی بھی پانی پت کے میدان میں جا اترا۔ احمد شاہ کی فوجی قوت مندرجہ ذیل تعداد کے مطابق تھی:

۱۔ کابل سے وہ اپنے ساتھ تقریباً چالیس ہزار سوار لایا تھا۔

۲۔ ہندوستان سے اسے مزید تیرہ ہزار سوار اور اڑتیس ہزار پیدل سپاہی مل گئے تھے۔

۳۔ ہندوستان ہی کی بعض ریاستوں سے اسے عام قسم کی ستر توپیں بھی حاصل ہوئی تھیں۔

پھر بھی ابدالی لشکر مرہٹہ لشکر سے بہت کم تھا۔ مرہٹوں کو اعلیٰ بھاری توپخانہ کی واضح برتری حاصل تھی۔

پانی پت کی جنگ

۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء تک مرہٹہ اور ابدالی فوجیں پانی پت کے میدان میں ایک دوسرے کے بالمقابل خیمہ زن رہیں اور دونوں کے درمیان اکثر اوقات معمولی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن کسی بھاری حملے کی دونوں جانب سے کوئی ابتدا نہ ہوئی۔ فیصلہ کن معرکہ ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو لڑا گیا۔ گوبند راؤ بندھیلا نے بارہ ہزار گھوڑ سواروں کو پانی پت کے گرد و نواح میں پھیلا دیا۔ اس کا مقصد ابدالی کے سامانِ رسد پر قبضہ کرنا اور اس کے

ذرائع مواصلات کو ختم کرنا تھا۔ لیکن وہ اپنے اس منصوبے میں بالکل ناکام رہا کیونکہ ایک دن علی الصبح افغان وزیراعظم خان ولی خان کے بھتیجے عطا محمد خان اور حاجی کریم داد خان درانی نے گوبند راؤ بندھیلا پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس معرکے میں گوبند راؤ بندھیلا اور اس کے تمام ساتھی کام آئے اور سب سامانِ رسد جو مرہٹوں نے جمع کر رکھا تھا ابدالیوں کے ہاتھ آ گیا۔ اب احمد شاہ کے اس دستے نے اپنی کاروائیاں تیز کر دیں۔ مرہٹوں کا جتنا سامانِ رسد آتا یہ لوگ اس پر قبضہ کر لیتے اور یوں مرہٹے خوراک کی شدید کمی کا شکار ہو گئے۔ اس پر انہوں نے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کی لیکن احمد شاہ ابدالی نے اس امکان کو قطعی رد کر دیا اور لڑنے کے لئے تیار رہا۔ ابدالی نے اپنے تمام جرنیلوں کو تیار رہنے کا حکم دیا۔

احمد شاہ نے مرہٹوں کی ناکہ بندی اور سخت کر دی۔ اس ناکہ بندی کے لئے ابدالی کے گشتی توپخانہ نے بہت موثر کردار ادا کیا لیکن وہ پہلے حملہ کرنے سے گریز کرتا رہا۔ اس طرح تقریباً دو ماہ تک فوجیں میدان میں آمنے سامنے پڑی رہیں۔

جنگ کا آغاز

احمد شاہ نے اپنی فوج کی صف آرائی اس طرح کی تھی کہ قلب کو اپنے لئے منتخب کیا اور اس کے ہمراہ روہیلہ سردار حاجی رحمت اللہ خان اور نجیب الدولہ تھے۔ میمنہ پر خان ولی خان اور اس کا بھتیجا عطا محمد تھے۔ میسرہ پر احمد شاہ نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو چند مشہور روہیلا سرداروں کے ساتھ مقرر کیا۔ علاوہ ازیں احمد شاہ نے اپنا گشتی توپخانہ بھی قلبِ لشکر میں متعین کیا۔ مرہٹہ فوج کی ترتیب اس طرح تھی کہ مرہٹہ فوج کے سپہ سالار شوراؤ نے قلب کی قیادت اپنے ذمہ لی۔ میسرہ پر راجپوت اور جاٹوں کو مشہور کاردی برادران فتح خان اور ابراہیم خان جو یورپی طریقۂ جنگ کے ماہر تھے، کے تحت مقرر کیا تھا۔ میمنہ پر نامور مرہٹہ جرنیل سندھیا اور شمشیر بہادر راؤ متعین تھے۔

احمد شاہ چاہتا تھا کہ فوجی صورتِ حال پر غور کرنے کے لئے اسے مکمل سکون اور

تنہائی میسر رہے۔ اس لئے اس نے اپنا سرخ رنگ کا شاہی خیمہ دشمن افواج کی طرف اپنی فوج سے تقریباً آدھ میل کے فاصلے پر نصب کرا رکھا تھا۔ جس کی حفاظت چار ہزار افغان شہسوار کرتے تھے۔ رات کے وقت ان کی تعداد زیادہ کر دی جاتی تھی۔ احمد شاہ کا معمول یہ تھا کہ نمازِ فجر کے بعد اپنے چند جرنیلوں کے ساتھ فوج کے معائنے کے لئے نکلتا تھا۔ دشمن کی تازہ جنگی نقل و حرکت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اپنی فوج کی بدلے ہوئے حالات کے مطابق صف بندی کرتا۔ بعد ازاں خیمے میں واپس آکر فوجی مسائل پر اپنے جرنیلوں سے صلاح مشورے کرتا۔ احمد شاہ ایک دن ابھی نمازِ فجر میں مصروف ہی تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ مرہٹوں نے حملہ کر دیا ہے۔ اور مرہٹہ فوج اپنی خندقوں سے نکل کر گولہ باری کرتے ہوئے شاہی کیمپ کی جانب پیش قدمی کر رہی ہے۔ کاروی برادران بھی برطانوی اور فرانسیسی طریقۂ جنگ کے مطابق توپخانے کی آڑ میں آگے بڑھنے لگے۔ مرہٹہ توپخانہ اس قدر شدید گولہ باری کر رہا تھا کہ میدانِ دجنگ میں چاروں طرف دھوئیں اور گرد و غبار کے بادل چھا گئے اور اس گرد و غبار میں کچھ بھائی نہ دیتا تھا۔ اس اچانک حملے کو روکنے کے لئے احمد شاہ کا ایک جرنیل نجیب الدولہ روہیلہ منصوبہ بندی کے بغیر اپنے دستے کے ساتھ مرہٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ لیکن مرہٹوں نے اپنی کثیر تعداد کے بل بوتے پر انہیں گھیر لیا اور اس گھمسان کے معرکے میں سات ہزار روہیلا سپاہی مارے گئے۔ لیکن جونہی وزیر اعظم ولی خان کو روہیلہ دستے کی تباہی کی اطلاع ملی تو وہ فوراً ان کی مدد کے لئے بڑھا اور مرہٹوں کو نرغہ میں لے کر ان پر شدید حملہ کر دیا۔ احمد شاہ ابدالی بھی اپنے خاص دستے کے ساتھ اس حملے میں شامل ہوا اور یہ جگہ لڑائی کا مرکز بن گئی۔ مسلمان فوج نے دست بدست جنگ میں انفرادی بہادری کے بے مثال مظاہرے کئے۔ مرہٹے بھی اگرچہ جانفشانی کے جذبے سے لڑے لیکن بتدریج مسلمانوں کا پلہ بھاری ہونے لگا۔ ابدالی کے گشتی توپخانہ کی کارگر اور کامیاب کارکردگی سے مسلمانون کو واضح برتری حاصل ہو گئی۔ میدانِ جنگ میں ہر طرف مرہٹوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے جس سے ان کی شکست کے آثار نمایاں ہو گئے۔ بالآخر مرہٹے بے انداز جانی نقصان اٹھانے کے بعد بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمان فوج نے

اپنے گشتی توپخانہ کے ہمراہ بیس میل تک مرہٹوں کا تعاقب کیا اور انہیں مزید نقصان پہنچایا۔

اس جنگ میں مرہٹوں کے تقریباً دو لاکھ سپاہی قتل اور بائیس ہزار گرفتار ہوئے۔ مرہٹوں کے تقریباً ساٹھ ہزار گھوڑے ابدالیوں نے پکڑ لئے۔ اس کے علاوہ ان کا بہترین توپخانہ جو تین سو بھاری توپوں پر مشتمل تھا، مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ بے شمار مالِ غنیمت بھی ملا۔ بعض روایات کے مطابق مادھوجی سندھیا اور ملہار راؤ ہلکر بھی گرفتار ہوئے تھے۔ لیکن وہ کچھ ادائیگی کے عوض رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے علاوہ بالاجی راؤ پیشوا کا بیٹا شوراؤ بھی اسی جنگ میں قتل ہوا۔ جب پیشوا مزید کمک لے کر آرہا تھا کہ راستے میں اسے اس عظیم ہزیمت کی اطلاع ملی تو وہ دل برداشتہ ہو کر واپس پونا (مہاراشٹر) چلا گیا اور چند ماہ بعد وہیں مر گیا۔ اس جنگ کے بعد مہاراشٹر میں تباہی مچ گئی۔ ہر گھر میں ماتم بپا تھا۔ اس جنگ میں مرہٹوں کی طاقت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور وہ برصغیر کے سیاسی صفحے سے یک لخت معدوم ہو گئے۔

اس جنگ میں مرہٹوں کی شکست کے اسباب مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ مرہٹے جو اب تک گوریلا جنگ لڑتے رہے تھے پہلی بار اس موقع پر کھلے میدان میں جم کر لڑے تھے۔ لیکن اس طریقۂ جنگ میں مہارت نہ ہونے کی وجہ سے بُری طرح پٹے۔ جبکہ مسلمان تو ہمیشہ سے کھلے میدان میں لڑنے کے عادی تھے۔

۲۔ مرہٹوں کی مرکزی قیادت اور ان کے حلیفوں کے درمیان شدید اختلافات تھے اور انہوں نے متحد ہو کر مسلمانوں کا مقابلہ نہ کیا۔

۳۔ مرہٹہ قیادت میں اعلیٰ جنگی قابلیت کا فقدان تھا۔ ان کے برعکس احمد شاہ ابدالی ایک آزمودہ کار اور منجھا ہوا جرنیل تھا۔ اور دشمن کی ہر کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھانا جانتا تھا۔

۴۔ مرہٹوں کے ظلم وستم کی وجہ سے مقامی باشندے ان سے سخت نالاں تھے اور انہوں نے مرہٹہ لشکر کو سامان خورد و نوش فراہم کرنے میں قطعاً تعاون نہ کیا۔

۵۔ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کی ناکہ بندی کر کے ان کی رسد و کمک کے تمام ذرائع مسدود کر دیئے تھے۔ اور مرہٹہ فوج غذائی کمی کا شکار ہو گئی۔ جبکہ ابدالی کے پاس سامانِ رسد وافر مقدار میں موجود تھا۔

۶۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر اسلام کے تحفظ اور بقا کے لئے لڑے تھے۔ اس مقدس جذبے کا کوئی توڑ مرہٹوں کے پاس نہیں تھا۔

ابدالی کی واپسی

احمد شاہ ابدالی پانی پت کے میدان میں اسلام کو مٹانے والوں کو مٹا کر کثیر مالِ غنیمت کے ساتھ دہلی واپس آیا تو شہری رعایا کے علاوہ دیہات سے بھی کثرت کے ساتھ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے۔ انہوں نے بادشاہ اور فاتح فوج کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ ابدالی نے وطن واپسی سے پہلے چند ایک نئی تقرریاں کیں اور خطابات دیئے۔ احمد شاہ نے شہزادہ علی گوہر بن شاہ عالم ثانی کو جو اس وقت بنگال میں تھا، دہلی کا بادشاہ مقرر کیا اور اس کے ساتھ نجیب الدولہ روہیلا کو دوبارہ دہلی کا وزیر اعظم مقرر کیا۔ دربار کے چند سرکردہ امراء نے احمد شاہ کو کہا کہ وہ تخت پر جلوس فرمائے، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بعد ازاں ابدالی مارچ ۱۷۶۱ء کو دہلی سے لاہور پہنچا اور چند روز قیام کیا۔ اس نے فوجدار خان نائب گورنر پسرور اور جالندھر دوآب کے گورنر سربلند خان وغیرہ کو لاہور طلب کیا جبکہ لاہور کا گورنر امیر محمد خان اور نائب گورنر کریم داد خان پہلے ہی سے لاہور میں موجود تھے۔ یہاں قیام کے دوران میں احمد شاہ نے صوبوں کے انتظامی سربراہوں کا ازسرِنو تقرر کیا۔ امیر محمد خان کی جگہ خواجہ عبداللہ خان کو لاہور اور سربلند خان کی بجائے زین خان کو سرہند کو حاکم مقرر کیا اور سربلند خان کو ملتان کی گورنری پر فائز کیا۔ ان امور کی انجام دہی کے بعد احمد شاہ واپس کابل چلا گیا۔ کیونکہ اس کی فوج برصغیر کے موسم اور مسافرت کی صعوبتوں سے تنگ آ گئی تھی اور واپسی پر مصر تھی۔

پانی پت کی تیسری جنگ برصغیر کا ایک نہایت اہم موڑ ثابت ہوئی۔ مرہٹوں کی

قوت پاش پاش ہو گئی۔ پیشوا کے اقتدار کا سنگھاسن الٹ گیا۔ پیشوا جو پہلے ہی دمے کا مریض تھا، اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا اور چند مہینوں کے بعد فوت ہو گیا۔ مرہٹوں کی مرکزیت ختم ہو گئی اور کئی خود مختار ریاستیں بن گئیں۔ مغلیہ سلطنت جو مرہٹوں کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے آخری دموں پر تھی، اس جنگ میں مرہٹوں کی شکست کے باعث کچھ سنبھالا لے سکتی تھی لیکن پھر بھی مغل دربار نے اپنی پرانی روش ترک نہ کی اور اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔

اس جنگ کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹوں کی فیصلہ کن شکست کے بعد میدان انگریزوں اور سکھوں کے لئے خالی ہو گیا۔ اب ان کی راہ میں مزاحمت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے اس جنگ کے فوراً بعد پانڈی چری پر قبضہ کر لیا اور سکھوں نے پنجاب میں پاؤں پسارنے شروع کر دیئے۔

جنگِ پانی پت اور پنجاب

احمد شاہ ابدالی کے پانچویں حملے سے قبل جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ پنجاب پر مرہٹوں نے تسلط قائم کر لیا تھا اور ابدالی اقتدار کا پنجاب سے خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس عرصے کے دوران میں دو مسلم دشمن طاقتیں پنجاب میں ابھر آئی تھیں۔ جب احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کے خلاف برسرِ پیکار تھا تو سکھوں نے پنجاب میں اپنی مسلم کش سرگرمیاں تیز کر دیں اور لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لوٹ مار سے جمع کردہ مال نے سکھوں کی اقتصادی حالت کو کافی مضبوط بنا دیا تھا اور انہوں نے جابجا دفاعی قلعے تعمیر کر لئے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کی شمالی ہند میں مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر بیساکھی کے میلے کے موقعہ پر امرتسر میں تمام پنجاب سے آئے ہوئے سکھوں کا ایک بہت بڑا اجتماع ہوا جس میں سکھ راہنماؤں نے بڑی اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ اور ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا تھا کہ سکھ اپنے تمام اختلافات دور کر دیں اور گورو کے نام پر ایک اجتماعی خزانہ کی تشکیل کی جائے۔ جس سے وہ گورو جی کے خالصوں کو جنگی ہتھیار اور دیگر ضروریات کا سامان فراہم

کیا جائے تا کہ ایک سکھ ریاست کی بنیاد رکھی جا سکے۔ اس اجتماع میں متعدد سکھ رہنماؤں نے حصہ لیا۔ ان میں جسا سنگھ کلال اہلو والیہ، ہری سنگھ بھنگی، لہنا سنگھ، چیت سنگھ وغیرہ شامل تھے۔ اس طرح ایک سکھ فیڈریشن وجود میں آ گئی۔ اس فیڈریشن کا سربراہ جسا سنگھ کلال اہلو والیہ تھا۔ اس موقع پر یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ لاہور شہر پر بہر صورت فی الفور قبضہ کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں سکھوں نے ایک معمولی کوشش بھی کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر بھی انہوں نے سوچا کہ احمد شاہ ابدالی واپس کابل جاتے ہوئے لازماً پنجاب سے گزرے گا، اور انہیں دوبارہ جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لئے انہوں نے احمد شاہ کی واپسی تک اپنے اس فیصلے کو ملتوی کر دیا۔ لہذا ان حالات پر غور وخوض کرنے کے بعد سکھوں نے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ علاوہ ازیں سکھ سرداروں نے اپنے اپنے علاقوں میں دفاعی قلعے تعمیر کروائے اور وہاں مقامی طور پر اپنی اپنی سرداریاں قائم کر دیں۔

مرہٹوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد احمد شاہ واپسی پر لاہور میں ٹھہرا۔ لیکن بوجوہ سکھوں کے خلاف کوئی کاروائی نہ کر سکا۔ اور کابل چلا گیا، جس سے سکھوں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔

ابدالی کا پنجاب پر چھٹا حملہ

(۱۷۶۲ء)

احمد شاہ ابدالی بمشکل لاہور سے کابل پہنچا ہی تھا کہ سکھوں نے اپنے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق پنجاب میں ظلم وتشدد اور لوٹ کھسوٹ شروع کر دی۔ اس مرتبہ سکھوں نے لاہور کے اردگرد کے علاقوں کو تباہ اور آبادیوں کو نذرِ آتش کر دیا۔ اور مزاحمت کرنے والے افغانوں کے کئی دستوں کو شہید کر دیا، بعدازاں وہ لاہور پر حملہ آور ہوئے۔ اور انہوں نے قلعہ کا محاصرہ کر کے لاہور کے نائب گورنر امیر محمد خان افغان سے ایک خطیر رقم کا مطالبہ کیا۔ گورنر پنجاب امیر محمد خان نے تیس ہزار روپیہ انہیں ادا کیا۔ سکھوں نے افغان انتظامیہ کو اس قدر ہراساں کر دیا تھا کہ انہیں احمد شاہ سے مدد کی اپیل کرنا پڑی۔ سکھوں نے زمینداروں اور کاشتکاروں سے مالیہ اور آبیانہ وغیرہ خود وصول کرنا شروع کر دیا۔ اور بہت سے افغان اہلکاروں کو ہلاک کر دیا۔

سردار چرت سنگھ نے لاہور کے شمال میں گجرولی کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کر لیا تھا، یہ قلعہ مٹی اور گارے سے بنایا گیا تھا۔ گورنر پنجاب عبید خان نے سکھوں کی زیادتیوں سے تنگ آکر ان کی سرکوبی کا فیصلہ کیا اور ''گجرولی'' کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اس کی اپنی فوج میں موجود سکھوں نے اپنے ہم قوموں سے ساز باز کی اور اس سازش کے نتیجے میں عبید خان کو شکست ہوئی۔ اور انہوں نے اپنی وحشیانہ سرگرمیاں مزید تیز کر دیں۔ افغانوں کے خلاف جنگِ گجرولی میں کامیابی سے سکھوں کے حوصلے بہت بلند ہو گئے تھے۔ گورنر پنجاب عبید خان نے اس شکست کے فوراً بعد احمد شاہ ابدالی سے امداد کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں احمد شاہ ابدالی نے اپنے ایک نامور جرنیل نورالدین خان کو سکھوں کے استیصال کے لئے سات ہزار گھوڑ سوار افغانوں کے ہمراہ فوراً پنجاب کی طرف روانہ کیا۔ نورالدین ابھی جہلم

ہی پہنچا تھا کہ سکھوں کی ایک بڑی تعداد نے جیرت سنگھ سکر چکیہ کی قیادت میں مذہبی جوش و خروش کے جذبے کے تحت اس پر اس شدت سے حملہ کیا کہ افغانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اوراس جنگ میں نورالدین کوشکستِ فاش ہوئی اور میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کر کے قلعہ سیالکوٹ میں محصور ہو گیا، جہاں افغان قلعدار متعین تھے۔لیکن سکھوں نے افغانوں کا تعاقب جاری رکھا اور قلعہ سیالکوٹ کا محاصرہ کرلیا۔ یہاں بھی افغانوں کو شکست ہوئی۔ اور جرنیل نورالدین نے جموں کے ہندوراجا کے ہاں پناہ لی۔ جہاں اس کے بچے کھچے ہزیمت خوردہ سپاہی بھی ادھراُدھر سے آکر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ان کامیابیوں نے سکھوں کو بہت بیباک بنادیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو پنجاب کے اصل مالک سمجھنے لگے اورانہوں نے مسلمانوں کو پنجاب سے مکمل طور پر بے دخل کرنے کا تہیہ کرلیا۔ اِن فتوحات کے بعد سکھ دیوالی کے موقع پر امرتسر میں اکٹھے ہوئے تو انہوں نے پنجاب کے مسلمان، جاگیرداروں اور نوابوں کو لوٹنے اور قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے جنڈیالہ کے ایک راہب کو قتل کیا جس نے پانی پت کی جنگ میں احمد شاہ ابدالی کی مدد کی تھی۔ اس کے بعد ملیرکوٹلہ پر حملہ کیا۔ وہاں کے مسلمانوں نواب، خان ہینکن خان کو مع اہل وعیال شہید کردیا اور بعد ازاں اس کی حویلی میں سے سامان لوٹ کر آگ لگادی۔اور شہر میں قتلِ عام کیا۔ سکھوں کے 'خالصہ ولی' نے ملیرکوٹلہ کو تباہ و برباد کرنے کے بعد، بروچ کے نواب امیر مرتضیٰ خان پر حملہ کیا اور شہر کو لوٹنے کے بعد نذرِآتش کردیا۔ سکھوں نے اِن دوشہروں کو تباہ کرنے کے بعد ''ازل'' پرحملہ کیا اور وہاں بھی وحشت و بربریت کی داستانیں دوہرائیں۔ اِس کے بعد سکھوں نے سرہند پر یلغار کی، جہاں آس پاس کے ستم رسیدہ مسلمان اکٹھے ہو گئے تھے۔ لیکن یہاں سکھوں کو کامیابی نہ ہوئی اور وہ شکست کھا کر واپس چلے گئے۔

ان وجوہات کی بناء پر احمد شاہ ابدالی کو چھٹی مرتبہ پنجاب پر حملہ کرنا پڑا۔

سکھوں کے خلاف ابدالی کا اقدام

احمد شاہ ابدالی مسلمانوں پر سکھوں کے ظلم وستم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

لہٰذا اس نے سکھوں کے خلاف عملی اقدام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ نومبر ۱۷۶۲ء میں کابل سے بڑی تیزی کے ساتھ روانہ ہو کر لاہور پہنچا۔ لاہور میں احمد شاہ نے چند احکامات جاری کیے۔ پھر اپنے فوجی کیمپ کو دریائے ستلج کے مشرقی کنارے پر قائم کرنے کی غرض سے لاہور سے فوراً روانہ ہوا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر اس وقت حملہ تھا جب سکھوں نے جنڈیالہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ سکھوں کو جب اچانک معلوم ہوا کہ احمد شاہ ابدالی سر پر آ پہنچا ہے تو ان کے جتھوں میں زبردست افراتفری اور بھگدڑ مچ گئی۔ اور وہ سرہند کی طرف بھاگ گئے جہاں ایک دوسرا 'خالصہ دَل' برسرِ پیکار تھا۔ سکھوں کا خیال تھا کہ سرہند میں موجود دوسرے سکھوں کے ساتھ مل کر سرہند کو فتح کر کے اپنا مرکز بنالیں گے یا انہیں احمد شاہ کی آمد سے مطلع کر کے بچالیں گے اور پھر متحد ہو کر افغان بادشاہ کا مقابلہ کریں گے۔ سید محمد لطیف بھی لکھتے ہیں کہ احمد شاہ کی آمد کے وقت سکھوں نے سرہند کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ سرہند کے مسلمانوں نے بڑی جرأت کے ساتھ مقابلہ جاری رکھا۔ اور جونہی محصورین کو معلوم ہوا کہ احمد شاہ ابدالی بذاتِ خود آ گیا ہے، تو وہ قلعہ سے نکل کر کھلے میدان میں سکھوں کے مقابلہ پر آ گئے۔ مسلمانوں کی تعداد سکھوں کے مقابلے میں کئی گنا کم تھی۔ لیکن ان کے حوصلے بہت بلند تھے۔ چنانچہ انہوں نے سینکڑوں سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بالآخر سکھ بے شمار لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ احمد شاہ ابدالی سرہند پہنچا اور سرہند میں متعین فوجی دستے کو ہمراہ لے کر شہر لدھیانہ سے ہوتا ہوا کوٹ رہیرا کے مقام پر جو شہر لدھیانہ سے تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے، خیمہ زن ہو گیا۔ سکھوں کے دل بھی برصغیر کے اطراف و جوانب سے احمد شاہ ابدالی کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ سکھوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ تھی۔ یہ تمام سکھ جنگ میں رضاکارانہ طور پر حصہ لینے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ سکھ اس جنگ کو غالوگرڑھ کی جنگ کا نام دیتے ہیں۔ اس جنگ میں سکھ اپنے روائتی مذہبی جنون میں دیوانے ہو کر لڑے۔ مسلمان بھی اپنی تاریخی شجاعت کے ساتھ میدانِ جہاد میں اترے۔ اور تائیدِ الٰہی ان کی قوت میں اضافے کا سبب بنی۔ جب معرکہ کارزار گرم ہوا تو مسلمانوں اور سکھوں نے جرأت اور

بہادری کی نمایاں مثالیں قائم کیں۔ طرفین کے بے شمار آدمی موت سے ہمکنا ہوئے۔ لیکن بالآخر سکھ بہت زیادہ جانی نقصان اٹھانے کے بعد راہِ فرار اختیار کر گئے۔ اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ احمد شاہ کے محفوظ دستوں نے بہت دُور تک سکھوں کا تعاقب کیا جس کی وجہ سے سکھوں کے مرنے والے سپاہیوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ اس جنگ میں سکھ مقتولین کی تعداد کے بارے میں مؤرخین آپس میں خاصا اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ تعداد دس ہزار سے لے کر پچاس ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ لیکن پنڈت کنھیا لال کی رائے، جس سے سید محمد لطیف بھی اتفاق کرتے ہیں۔ تقریباً صحیح مانی جاتی ہے۔ یہ تعداد اندازاً چوبیس ہزار تھی اور زخمی اس کے علاوہ۔ بہر حال سکھوں کی ایک قابل ذکر تعداد ابدالی کی تیغ خارا شگاف کا شکار بنی۔ اِس فتح کے بعد احمد شاہ ابدالی کی ہیبت میں اضافہ ہو گیا۔ اور وقتی طور پر بغاوت کے شعلے سرد پڑ گئے۔

ابدالی کا امرتسر پر حملہ

احمد شاہ ابدالی کوٹ رہیرا کی جنگ میں سکھوں کو شکستِ فاش دینے کے بعد لدھیانہ اور سرہند سے ہوتا ہوا لاہور آیا۔ بادشاہ نے لاہور میں چند روز قیام کیا۔ لاہور میں قیام کے دوران میں آس پاس کے راجے اور نواب اس کی خدمت میں تحائف اور نذرانے پیش کرنے کے لئے آئے۔ ان میں سے جموں کا راجا رنجیت دیو، قادیان کا نواب مرزا امیر محمد، کپورتھلہ کا راجا برہام رائے اور کانگڑہ کا راجا ندھان سنگھ قابل ذکر ہیں۔ انہی دنوں دیوالی کا تہوار آ گیا۔ احمد شاہ کو بتایا گیا کہ سکھ اس تہوار پر امرتسر میں اپنے مقدس تالاب اور گوردوارے میں ضرور جمع ہونگے۔ لہذا ان کے مکمل قلع قمع کے لئے ضروری ہے کہ دیوالی کی تقریب کے دوران ان پر اچانک چھاپہ مارا جائے۔ اس مشورے سے اتفاق کرتے ہوئے احمد شاہ نے لاہور سے امرتسر کی طرف کوچ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مہم میں مذکورہ راجے اور نواب بھی بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ جبکہ بعض مورخین اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ لوگ احمد شاہ کی مدد کے لئے یا سکھوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کے لئے

نہیں آئے تھے۔ بلکہ وہ تو بادشاہ کو محض تحائف اور نذرانے وغیرہ پیش کرنے آئے تھے اور انہیں احمد شاہ نے لاہور دربار ہی سے رخصت کر دیا تھا۔ لہٰذا امرتسر کی مہم میں وہ احمد شاہ کے ساتھ نہیں تھے۔ امرتسر پر قابض ہونے کے لئے احمد شاہ کو کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اول تو حالیہ شکست کی وجہ سے اور احمد شاہ کی برصغیر میں موجودگی کے خوف سے بہت کم سکھ امرتسر آئے تھے۔ دوسرے جب انہیں ابدالی کی آمد کا علم ہوا تو آئے ہوئے سکھ بھی بھاگ گئے۔ احمد شاہ نے سکھوں سے مساجد اور مقابر کی توہین کرنے کا انتقام لینے کے لئے امرتسر کے ''ہر دیو'' نامی گوردوارے کو مسمار کروادیا۔ علاوہ ازیں اس نے سکھوں کے مقدس تالاب رام راونی کو اسی گوردوارے کے ملبے سے دوبارہ بھروادیا۔

اس مہم کے بعد ابدالی واپس لاہور آیا۔ کوٹ رہیرا کی جنگ میں ایک سکھ سردار ''آلہ سنگھ'' گرفتار ہو کر دوسرے قیدیوں کے ساتھ لاہور لایا گیا۔ احمد شاہ ابدالی اِس سکھ سردار کی بہادری سے بہت متاثر ہوا۔ اسے راجا کا خطاب دیا۔ اور اسے دوبارہ اس کے علاقے میں بحال کر دیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہ سکھ سردار موجودہ ریاست پٹیالہ (مشرقی پنجاب) کا بانی حکمران تھا۔

اسی دوران میں کشمیر کے ہندو گورنر نے افغان حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے اس بغاوت کو فرو کرنے کی غرض سے زین خان کو ایک بھاری فوج دے کر روانہ کیا۔ جموں کا راجا رنجیت دیو بھی اِس لشکر کے ساتھ تھا۔ سکھ جیون رام معمولی مزاحمت کے بعد گرفتار کر لیا گیا۔ اور اسے پابہ زنجیر لاہور بھیج دیا گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے اس غدار گورنر کی پہلے آنکھیں نکلوائیں اور بعد ازاں اسے قتل کروادیا اور کشمیر کا نیا گورنر سربلند خان کو مقرر کیا۔ اسی دوران میں احمد شاہ کو اطلاع ملی کہ قندھار کے حالات مخدوش ہیں۔ لہٰذا اس پیغام کے پیشِ نظر احمد شاہ نے فوراً واپسی کا قصد کیا اور کابلی مل کو لاہور کا گورنر اور خواجہ عبید اللہ کو نائب گورنر مقرر کر کے ۱۷۶۲ء کے اواخر میں قندھار چلا گیا۔ احمد شاہ کی واپسی کے فوراً بعد سکھوں نے اپنی طاقت جمع کر کے اپنی سابقہ سرگرمیاں پھر سے شروع کر دیں۔

سکھوں کے ہاتھوں قصور اور مالیر کوٹلہ کی پھر سے تباہی

احمد شاہ ابدالی نے ابھی بمشکل دریائے چناب ہی کو عبور کیا تھا کہ سکھ جنگلوں اور پہاڑوں میں واقع اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے اور انہوں نے امرتسر میں جمع ہو کر اپنا لائحہ عمل طے کیا۔ اور اِس پر عمل کرنے کے لئے انہوں نے حلف اٹھائے۔ اس کے بعد ان کے خونخوار جتھے ہر سمت روانہ ہو گئے۔ جن کا براہِ راست ہدف مسلمان تھے۔ چنانچہ سکھوں کی وحشت و بربریت کا سب سے پہلا نشانہ قصور (ضلع لاہور) بنا۔ قصور میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ حکومت ہی سے حسین خان کا خاندان قصور کا فوجدار چلا آرہا تھا اور افغانوں کی اِس شہر میں کافی آبادی تھی۔ سکھوں نے تقریباً پچاس ہزار کی جمعیت کے ساتھ اس شہر پر حملہ کیا۔ انہوں نے اپنی روایتی بربریت کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمان عورتوں کے جسموں سے زیور چھین کر انہیں شہید کر دیا۔ اسی طرح مردوں کے علاوہ بچوں اور بوڑھوں کو بھی بڑی تعداد میں شہید کیا گیا۔ اور کروڑوں روپے کی مالیت کا ساز و سامان لوٹ کر شہر کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ سکھوں نے قصور میں نہ صرف مسلمانوں کا قتلِ عام کیا بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی ان کے ظلم سے محفوظ نہ رہ سکے۔

قصور کی تباہی کے بعد درندہ صفت سکھوں نے ریاست ملیر کوٹلہ پر دوبارہ حملہ کر دیا۔ اس شہر کے مظلوم مسلمان ابھی سکھوں کی اس تباہی کو فراموش نہ کر پائے تھے، جو ان کے ہاتھوں ماضی قریب میں ہوئی تھی کہ وہ اِس قیامت خیز مصیبت کا دوبارہ شکار بن گئے۔ سکھوں نے قصور کی طرح یہاں بھی ایک کثیر تعداد کے ساتھ حملہ کر کے سب کچھ لوٹ لیا اور تمام مسلمانوں کو شہید کر کے شہر میں آگ لگا دی۔

سرہند پر سکھوں کا حملہ

سکھوں نے ملیر کوٹلہ کے بعد سرہند پر یلغار کی۔ سکھوں کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زائد تھی۔ اور وہ جدید آتشیں اسلحہ سے لیس تھے۔ گورنر سرہند زین خان نے اپنی محدود نفری کے ساتھ مزاحمت کی، جس کے نتیجے میں منارہ کے میدان میں سکھ اور افغان

فوجوں کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں سکھوں کو تعداد اور اسلحہ کی برتری کی وجہ سے فتح حاصل ہوئی۔ زین خان اپنی تمام فوج کے ساتھ شہید ہوگیا۔ اس جنگ میں کسی مسلمان نے میدان نہ چھوڑا۔ سکھوں نے سرہند پر قبضہ کر کے وہاں کی تمام آبادی کو بلا امتیاز مذہب وملت موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس طرح سکھوں نے اپنے مذہبی پیشوا گورو گوبند سنگھ کی خواہش کو عملی جامہ پہنایا۔

واقعہ یوں ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں گورو گوبند سنگھ کی بیوی اور دو لڑکے سرہند میں قتل ہوگئے تھے۔ سکھوں نے مقامی مغل حاکم وزیر خان کو موردِ الزام ٹھہرایا، حالانکہ یہ کام ایک ہندو دیوان کا تھا۔ سکھوں نے سازش سے وزیر خان کو قتل بھی کروا دیا لیکن پھر بھی ان کا غصہ فرو نہ ہوا۔ گورو گوبند سکھ نے اپنے پیروں کو ہدایت کی کہ جب بھی موقع ملے سرہند کو خوب تاراج کرنا۔ چنانچہ اس فتح کے بعد سکھوں نے اپنے گورو کی وصیت کے عین مطابق عمل کیا۔ اس زمانے سے آج تک یہ رسم بن چکی ہے کہ جب کوئی سکھ سرہند جاتا ہے تو ایک اینٹ اٹھا کر دریائے ستلج میں پھینک دیتا ہے۔ سرہند میں تمام مسلمانوں کو جن میں عورتیں، بچے، بوڑھے سب شامل تھے شہید کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں مقبرے، مسجدیں، خانقاہیں وغیرہ زمین بوس کر دی گئیں۔ مال اسباب کی لوٹ کا تو ذکر ہی کیا۔ سرہند کو جو ایک اہم تجارتی شہر تھا چند دنوں میں کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سکھوں نے اس ملبے کے بھی دام کھرے کر لئے۔ یعنی ان کھنڈرات کو سکھوں کے رہنما سردار بدھ سنگھ نے پٹیالہ کے راجا آلہ سنگھ کے ہاتھ پچیس ہزار روپے کے عوض فروخت کر دیا۔

سکھوں نے اپنی وحشت و بربریت اور قتل و غارت سے پنجاب میں اس قدر خوف و ہراس پھیلا دیا کہ پنجابی عوام نے اپنی عزت و ناموس اور جان و مال کے تحفظ کی غرض سے سکھوں کی سی وضع قطع اختیار کر لی تھی۔ ان دنوں سوائے شہر لاہور کے تمام پنجاب پر سکھوں کا اقتدار قائم ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے پنجابی عوام بالعموم اور مسلمان بالخصوص گرداب بلا میں گرفتار ہوگئے۔ ستلج اور جمنا کا درمیانی علاقہ تو بالکل تہس نہس کر دیا گیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی کا ساتواں حملہ

لاہور میں احمد شاہ ابدالی کے گورنر کابلی مل اور اس کے نائب خواجہ عبیداللہ خان سکھوں کو کہیں بھی نہ روک سکے۔ بالآخران کی حدود وسمٹ کر شہر پناہ سے آملیں۔ جبکہ شہر پناہ سے باہر کا تمام علاقہ عملاً سکھوں کے قبضے میں تھا۔ ایک روز سکھوں نے بہت بڑی تعداد کے ساتھ لاہور شہر پر حملہ کر دیا۔ افغان فوج قلعہ میں محصور ہونے پر مجبور ہوگئی۔ سکھوں نے گورنر پنجاب کابلی مل سے مطالبہ کیا کہ لاہور کے تمام قصابوں کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ جب گورنر نے انکار کر دیا تو سکھوں نے دھمکی دی کہ اگر انہوں نے مطالبہ پورا نہ کیا تو عوام کے قتلِ عام کے بعد شہر کو نذرِ آتش کر دیا جائے گا۔ اور اہل وعیال کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے گا۔ ہندو گرونر کابلی مل نے حالات سے مجبور ہو کر لاہور کے تمام مسلمان قصابوں کو جن کی تعداد تقریباً سات سوتھی، سکھوں کے حوالے کر دیا۔ سکھوں نے ان کے ناک اور کان کاٹ کر رہا کر دیا۔ بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ سکھوں نے ناک کان کاٹنے کے بعد انہیں شہید کر دیا تھا۔ لیکن دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ سکھوں نے تمام کو رہا کر دیا تا کہ دیگر لوگوں کو عبرت ہو۔ جب مذکورہ بالا واقعات کا علم احمد شاہ ابدالی کو ہوا تو اس نے سکھوں کا مکمل صفایا کرنے کا فیصلہ کر لیا اور موسمِ سرما ۱۷۶۴ء میں پنجاب پر ساتویں بار حملہ آور ہوا۔

جب احمد شاہ ابدالی کو سکھوں کے ہاتھوں پنجاب کے مسلمانوں پر ظلم وستم کے واقعات وحالات کی اطلاع پہنچی تو اس نے بڑی سرعت سے دریائے سندھ کو عبور کیا اور جنوری ۱۷۶۴ء کے آخر میں لاہور پہنچ گیا۔ ابھی احمد شاہ ابدالی نے دریائے چناب کو عبور کیا ہی تھا کہ پنجاب سے تمام سکھ اپنی اپنی پہاڑی پناہ گاہوں میں پناہ لے چکے تھے۔ اور سرہند تک کوئی شخص بھی سکھوں کے لباس میں نظر نہیں آتا تھا۔ چناب اور ستلج کا درمیانی

علاقہ ان ظالموں سے مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔ احمد شاہ نے چند روز لاہور میں قیام کرنے کے بعد سرہند کا رخ کیا۔ جب بادشاہ شہر سرہند میں داخل ہوا تو سرہند کی عالیشان عمارتیں، مسجدوں، خانقاہوں اور مقبروں کو کھنڈرات کی صورت میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس پر سرہند کی تباہی کا ایسا اثر ہوا کہ بادشاہ نے جوشِ انتقام میں بلند آواز سے کہا تھا کہ انہیں (سکھوں کو) زمین میں سے بھی نکال کر میرے سامنے پیش کرو۔ افغان اور قزلباش شہسواروں نے چاروں طرف پچاس پچاس میل تک گھوڑے دوڑائے، لیکن کہیں بھی سکھ نہ ملے۔ اگر اکا دکا کوئی ہاتھ لگا بھی تو اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ سکھ پنجاب سے نکل کر شمال مشرقی شوالک کی پہاڑیوں اور نابھہ اور پٹیالہ کے جنوبی گھنے جنگلوں میں جا چھپے تھے۔ سکھوں پر احمد شاہ کا دبدبہ طاری ہو چکا تھا۔ یہی نام تھا جس سے سکھ خوفزدہ ہو جاتے تھے۔

اگر سکھ احمد شاہ ابدالی کی پنجاب میں آمد کے وقت روپوش نہ ہوتے تو یقیناً ان کا بھی وہی حشر ہوتا، جو مرہٹوں کا پانی پت میں ۱۷۶۱ء میں ہوا تھا۔ چونکہ اب سکھ موجود نہ تھے اس لئے ان کا قلع قمع ممکن نہ تھا۔ اور نہ ہی ان کی پناہ گاہوں کا سراغ لگایا جا سکتا تھا۔ سرہند، ملیر کوٹلہ اور قصور کے شہروں اور مسلمانوں کے قتلِ عام نے ابدالی کو اس قدر متاثر کیا کہ احمد شاہ نے مشرقی پنجاب میں پورے دو ماہ تک قیام کر کے افغان فوج کو حکم دیا کہ سکھوں کی فصلوں، دیہاتوں اور جملہ املاک کو تباہ و برباد کر دیں۔ چنانچہ دو ماہ کے عرصے میں سکھوں کے دیہاتوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا اور کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی گئی۔ اس طرح احمد شاہ نے اپنی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کیا۔

تقریباً دو ماہ تک سکھوں کی تلاش اور جستجو میں مشرقی پنجاب میں گزارنے کے بعد احمد شاہ واپس لاہور آیا۔ لاہور کے مختصر قیام کے دوران میں احمد شاہ نے کئی انتظامی نوعیت کے احکام جاری کئے۔ جن میں اہم حکم فرمانروائے پٹیالہ راجا آلہ سنگھ کی سرہند کی گورنری کا تھا۔ یہ تقرر بادشاہ نے اپنے وزیر ولی خان کی سفارش پر کیا تھا۔ راجا نے سالانہ ساڑھے تین لاکھ خراج دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لاہور میں ابدالی کے قیام کو ابھی چند

ہی روز ہوئے تھے کہ افغانستان کے اندرونی حالات کے بارے میں غیر تسلی بخش قسم کی خبریں ملیں۔ اس پر اس نے فوراً واپسی کا قصد کیا اور تیزی سے کابل چلا گیا۔

پنجاب میں احمد شاہ ابدالی کا ساتواں حملہ محض آمد و رفت تک ہی محدود رہا۔ اور جس مقصد یعنی سکھوں کے مکمل استیصال، کے لئے وہ آیا تھا وہ مقصد حاصل ہوئے بغیر اسے کابل کے حالات سے مجبور ہو کر واپس جانا پڑا۔ اس موقع پر سکھوں کا میدانِ کارزار سے ہٹ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش ہو جانا ان کی موقع شناسی کا بین ثبوت ہے۔ ان کے اس فیصلے نے ان کی جدوجہد پر دُور رس مثبت اثرات چھوڑے۔ اس صحیح اور بروقت فیصلے کی وجہ سے ان کی منزل بہت قریب ہوگئی۔ احمد شاہ ابدالی اب کی بار سکھوں کے ساتھ فیصلہ کن معرکے کی نیت سے آیا تھا۔ جب پنجاب میں آکر اس نے سکھوں کے مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اس کے اس ارادے میں مزید پختگی آگئی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر سکھ مزاحمت کرتے تو ان کا حشر بھی مرہٹوں جیسا ہوتا اور مرہٹوں کی طرح ان کی قوت بھی مکمل طور پر پامال ہو کر رہ جاتی، لیکن چونکہ وہ منظرِ عام سے ہٹ گئے اس لئے ان کی طاقت محفوظ رہی۔ اور پھر وہ ابدالی کی واپسی کی بعد پنجاب کے بلاشرکت غیرے مالک بن گئے۔ علاوہ ازیں اگر احمد شاہ ابدالی کو افغانستان کی غیر مستحکم صورتِ حال کی وجہ سے واپس جانا نہ پڑتا اور وہ کچھ مدّت اور پنجاب ہی میں قیام کرتا تو اس صورت میں بھی سکھوں کو سامانِ رسد کی قلت کی وجہ سے مجبوراً اپنی پناہ گاہوں سے نکلنا پڑتا اور ان کی احمد شاہ ابدالی کی فوج سے ٹکر ہو جاتی اور لڑائی کی صورت میں احمد شاہ ابدالی کا پلّہ بھاری رہتا۔ الغرض ابدال کی واپسی سکھوں کے حق میں نہایئت مفید ثابت ہوئی، جس کے نتیجے میں پنجاب مسلمانوں کی گرفت سے نکل کر سکھوں کے تصرف میں چلا گیا۔

لاہور پر سکھوں کا دوبارہ قبضہ

احمد شاہ ابدالی کی پنجاب سے اچانک واپسی کے فوراً بعد سکھ اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے اور بہت جلد ہی سارے پنجاب پر ان کا تسلّط قائم ہوگیا۔ تمام چھوٹے بڑے

شہروں پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے لاہور پر یلغار کی۔ لاہور کے گورنر کابلی مل نے افغان افواج کے ساتھ کھلے میدان میں سکھوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن بری طرح شکست کھا کر وہ جموں کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں کے راجا رنجیت سنگھ نے اسے سیاسی پناہ دی۔ سکھوں نے باقی ماندہ افغان فوج کو شہید کر دیا۔

شہر پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ جب سکھ شہر میں داخل ہوئے، اس وقت گورنر کابلی مل کا بھانجا امر سنگھ محفلِ رقص وسرور سے دل بہلا رہا تھا۔ سکھوں نے اسے گرفتار کر کے وہیں طوق وسلاسل میں جکڑ دیا۔ کابلی مل کے بقیہ اہل وعیال بھی گرفتار کر لئے گئے۔ جنہیں بعد میں ۲۵ ہزار روپے کی ادائیگی کے عوض جموں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ جہاں کابلی مل پہلے سے موجود تھا۔ لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد سکھوں نے شہر میں قتل وغارتگری کا بازار گرم کر دیا۔ شہریوں کو بری طرح لوٹا گیا۔ سکھ لوٹ مار کی غرض سے لوگوں کے گھروں میں داخل ہو جاتے، ان کا سامان لوٹتے، خواتین کی بے حرمتی کرتے اور بعد میں تمام عورتوں اور مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ سکھوں نے لاہور کے شہریوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ کسی کی جان ومال اور آبرو محفوظ نہ رہی۔ یہ سلسلہ کئی ہفتے جاری رہا۔ لیکن مارے دہشت کے کسی شخص کو سکھوں کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ تھی۔ اور نہ ہی کسی میں اتنا دم تھا کہ سکھ سرداروں سے رحم کی اپیل کرتا۔ بالآخر لاہور کے شہری سکھوں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اس وقت کے ایک صاحب کرامت بزرگ ''تھوشاہ'' کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ وہ سکھوں کو اس ظلم وستم سے باز کریں۔ چنانچہ اس بزرگ کے کہنے پر سکھوں نے غارت گری بند کر دی۔

اس قتل وغارت اور لوٹ کھسوٹ کے بعد بھنگی مثل کے تین سرداروں صوبا سنگھ، گوجر سنگھ اور لہنا سنگھ نے لاہور کو باہم تین حصوں میں اس طرح تقسیم کر لیا کہ:

۱۔ جنوبی علاقہ نیاز بیگ تک صوبا سنگھ کے حصے میں آیا۔

۲۔ مشرقی علاقہ مع مغلپورہ، شالامار باغ اور کابلی مل کی حویلی وغیرہ، گوجر سنگھ کو ملا۔

۳۔ لاہور کے باقی ماندہ علاقے یعنی قلعہ، بادشاہی مسجد، شاہدرہ اور مغربی علاقہ لہنا سنگھ نے اپنے قبضے میں لے لیا۔

لہنا سنگھ بادشاہی مسجد کو بطورِ اصطبل استعمال کرتا تھا۔ جس طرح سکھوں نے لاہور شہر کے آپس میں حصے بخرے کر لئے تھے۔ اس طرح بقیہ پنجاب میں بھی سکھ سرداروں نے اپنی چھوٹی بڑی خودمختار حکومتیں قائم کر لیں۔ جن میں تاحال کسی قسم کی بھی انتظامی یگانگت مفقود تھی۔

لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد سکھ پنجاب کے دیگر غیر مفتوحہ علاقوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس طرح سارا پنجاب آہستہ آہستہ ان کے زیرِ نگیں آ گیا۔ لاہور کی فتح کے بعد ان کا سب سے بڑا معرکہ گجرات اور رہتاس کے علاقے کے افغان حاکم خان جہان خان سے ہوا۔ جہان خان پنجاب کے افغان حکمرانوں میں سب سے قدیم تھا۔ وہ مراد بیگم (مغلانی بیگم) کے عہد سے پنجاب کے معاملات میں کسی نہ کسی حیثیت سے براہ راست دخیل رہا تھا۔ سکھوں نے جب اس کے علاقوں پر حملہ کیا تو خان جہان نے بڑی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا۔ لیکن اسے شکست ہوئی اور اس نے بھاگ کر سیالکوٹ کے قلعے میں پناہ لی اور وہاں ایک بار پھر اس نے سکھوں کے طوفانِ بدتمیزی کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن یہاں بھی سکھوں کا پلہ بھاری رہا۔ اور خان جہان خان سیالکوٹ سے راہِ فرار اختیار کر کے جموں کے راجا کے پاس پناہ گزین ہو گیا۔ یوں سارے پنجاب پر سکھوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد پورے پنجاب میں وحشت و بربیت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ مسلمانوں کو شدید زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر طرف قتلِ عام اور تاراجیٔ املاک کا دور دورہ تھا۔ مساجد، مسلم مدارس اور مقابر مسمار کر دیئے گئے۔ اپنے مخالفوں کو صفحہ ہستی سے نمٹانا سکھوں کے نزدیک مقدس مذہبی فریضہ اور گرو جی مہاراج کی خوشنودی کا ذریعہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے واپس جانے کے بعد دو سال کے عرصہ میں سکھوں کو پنجاب پر مکمل اقتدار حاصل ہو گیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، اس وقت پنجاب میں سکھوں کی چھوٹی بڑی کئی خودمختار ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ لیکن ان میں وحدتِ فکر و عمل کماحقہٗ، موجود نہ تھی۔ اس مقصد

کو حاصل کرنے کے لئے قومی سطح پر سکھوں کا ایک اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا۔ جس میں آج کی اصطلاح کے مطابق ایک وفاق کی تشکیل کی گئی۔ اس کے علاوہ ایک مشترکہ سکہ بھی جاری کیا گیا۔ جس پر گورونانک اور گورنر گوبند سنگھ کے نام کندہ تھے۔ سکے کی دوسری جانب دیگ، تیغ اور فتح درج تھے۔ وفاق میں شامل ہر ایک رکن نے حلف اٹھایا جس کے الفاظ یہ تھے:

> ''ہمارے سر پر خدا ہے اور ہماری بغل میں گوروگو بند سنگھ کی عطا کردہ تلوار ہے۔ ہمارے ہاتھ میں گورونانک کی کتاب (گرنتھ) ہے اور یہی چیزیں دنیا میں ہماری نگہبان اور محافظ ہیں۔''

علاوہ ازیں اپنے مذہب اور عقائد کی روشنی میں سکھوں نے چند قوانین نافذ کیے، جس کے مطابق وہ عوام سے مالیہ اور آبیانہ وغیرہ وصول کرتے تھے۔ اِس کے علاوہ انہوں نے ایک اور ٹیکس لگایا جسے وہ ''راکھی'' کہتے تھے۔ جو جزیہ سے مشابہ تھا۔ اِس ٹیکس کو وہ عوام کی جان و مال کے تحفظ کے لئے حاصل کرتے تھے۔ ان دو سالوں میں سکھوں نے مسلمانوں پر قافیہ حیات تنگ کر دیا تھا۔ انہیں مذہبی آزادی ہرگز حاصل نہ تھی۔ مسلمانوں کو اذان دینے کی اجازت نہ تھی۔ سکھ سردار جو اپنے اپنے علاقے میں خودمختار راجے بن گئے تھے، مسلمانوں سے بیگار لیتے تھے اور مسلمانوں کو سب سے کمتر خیال کرتے تھے۔ مسلمانوں کی حالتِ زار کی وجہ سے احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر آٹھواں اور آخری حملہ کیا۔ جس سے سکھوں کی چند روز کی آن بان پھر ختم ہوگئی۔

احمد شاہ ابدالی کا آٹھواں حملہ

(۱۷۶۷ء)

احمد شاہ ابدالی ایک فعال اور سخت کوش زندگی گزارنے کے بعد اب بڑھاپے کی عمر میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ ایک طویل عرصے تک مرہٹوں اور سکھوں سے نبرد آزما رہا تھا۔ لیکن اب اس کے اعضاء مضمحل ہو چکے تھے۔ اس میں پہلے سا جوش اور ولولہ نہ رہا تھا۔ مزید برآں وہ ۱۷۶۴ء سے ناک کے سرطان میں بھی مبتلا تھا۔ لیکن پنجاب کے مسلمانوں پر سکھوں کی زیادتیوں کا حال سن کر وہ ضبط نہ کر سکا۔ اور ۱۷۶۷ء میں آٹھویں بار پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ یہ اس کا آخری حملہ تھا۔ اگرچہ اب اس میں پہلی سی گرمی رفتار نہ تھی پھر بھی وہ غیر معمولی رفتار سے راستے کے دریا عبور کرتا ہوا لاہور پہنچا۔ سکھ اس کی آمد سے پہلے ہی شہر خالی کر کے جا چکے تھے۔ اس نے لاہور میں اپنے عامل مقرر کر دیئے اور شہریوں کو امن و امان اور تحفظ دے کر احمد شاہ سرہند کی جانب روانہ ہوا۔ جب احمد شاہ ابدالی سرہند پہنچا تو یہ دیکھ کر بہت دل گرفتہ ہوا کہ نیا تعمیر کردہ شہر بھی سکھوں نے تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اس نے سوچا کہ سرہند کے عوام کو محض میری وجہ سے ہر سال انسانیت سوز مظالم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس نے مصالحانہ حکمتِ عملی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن قبل اس کے کہ احمد شاہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھاتا سکھ بہت بڑی تعداد میں اس کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ مگر جب مسلم اور خالصہ لشکر میں جنگ ہوئی تو سکھوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کر اپنی پرانی پناہ گاہوں میں چھپ گئے۔ احمد شاہ سرہند سے مشرق کی طرف بڑھتا ہوا جگراؤں کے مقام پر پہنچ گیا اور وہاں سے احمد شاہ ابدالی نے دہلی میں روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو پیغام بھجوایا کہ وہ اس کی ملازمت میں آجائے۔ لیکن نجیب الدولہ نے انکار کر دیا۔ ابدالی اسے پنجاب کا گورنر مقرر کرنا چاہتا تھا۔

راجا پٹیالہ کی حاضری

احمد شاہ ابدالی نے اپنے ساتویں حملے ۱۷۶۵ء کے دوران والد پٹیالہ راجا آلہ سنگھ کو سرہند کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ اس دوران میں راجا آلہ سنگھ فوت ہو گیا تھا اور اس کا پوتا امر سنگھ اس کا جانشین ہوا۔ چونکہ راجا پٹیالہ احمد شاہ ابدالی کا باجگزار تھا اس لئے نیا راجا ''جگراؤں'' کے مقام پر احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک لاکھ روپیہ نقد اور چند اعلیٰ گھوڑے مع سنہری زین وغیرہ کے بطور نذرانہ پیش کئے۔ جس کے جواب میں احمد شاہ نے راجا امر سنگھ کو 'مہاراجا مہندر بہادر' کا خطاب دیا۔ علاوہ ازیں اسے نقارہ اور علم رکھنے، مستقل فوج قائم کرنے اور اپنے نام کا سکہ جاری کرنے کی بھی اجازت دی۔ چنانچہ جب راجا امر سنگھ نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا تو اس پر ایسا شعر کندہ کرایا جس سے احمد شاہ کے ساتھ اس کے عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ شعر یہ ہے:

حکم شد از قادرِ بیچون بہ احمد بادشاہ

سکہ زد بر سیم و زر از اوجِ ماہی تا بماہ

یہ راجا اور اس کے بعد اس خاندان کے دوسرے راجے ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ نہایت قابلِ قدر سلوک کرتے رہے۔ مسلمانوں کو ریاست میں اعلیٰ ملازمتیں حاصل تھیں۔ حتیٰ کہ وزیر اعظم کے عہدہ پر ہمیشہ مسلمان ہی فائز رہے۔ پٹیالہ کی وزارتِ عظمیٰ کا حامل ''خلیفہ خاندان'' آجکل لاہور میں مقیم ہے۔ اس خاندان نے مسلمانوں کی قابلِ فخر خدمات انجام دیں۔ مثال کے طور پر خلیفہ حسن جنہوں نے علی گڑھ کی تحریک اور مسلم ایجوکیشن کانفرنس میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

مہاراجا پٹیالہ پر مذکورہ بالا ابدالی عنایات کے علاوہ ایک خاص عنایت یہ ہوئی کہ جب احمد شاہ ۱۷۶۷ء میں پنجاب سے کابل کے لئے روانہ ہوا تو اس نے راجا کو سرہند کے خود مختارانہ اختیارات بھی تفویض کر دیئے۔ سرہند برطانوی راج میں بھی ریاست پٹیالہ میں شامل رہا۔

احمد شاہ مشرقی پنجاب میں شہر ابنالہ سے پچیس میل دور جنوب میں خیمہ زن تھا۔ وہ نجیب الدولہ روہیلہ کے جواب کا منتظر تھا۔ جب نجیب الدولہ کا جواب آیا کہ وہ ابدالی شاہ کی ملازمت اختیار کرنے سے قاصر ہے تو ابدالی سرہند سے ہوتا ہوا لاہور پہنچا۔

ابدالی کی واپسی

مشرقی پنجاب سے احمد شاہ ابدالی لاہور آیا۔ لاہور میں چند روز قیام کے دوران میں اس نے مولوی عبیداللہ خان کو لاہور کا گورنر اور داؤد خان افغان کو نائب گورنر مقرر کیا۔ اس کے علاوہ گجرات اور رہتاس پر کشمیر کے سابق گورنر سرفراز خان کو مقرر کیا۔ اس سے قبل اس علاقے کا گورنر خان جہانخان تھا۔ جو سکھوں سے شکست کھا کر بھاگ گیا تھا۔ ابدالی نے جالندھر دوآب کے ہندو راجپوت گورنر کو پٹیالہ کے راجا کا نائب مقرر کر کے سرہند بھی ان کی تحویل میں دے دیا۔ لاہور میں قیام کے دوران احمد شاہ نے اپنی مصلحت آمیز پالیسی کے تحت بھنگی مثل کے ایک سردار، سردار لہنا سنگھ کو خیر سگالی کے اظہار کے طور پر پھلوں کا تحفہ بھیجا۔ سردار لہنا سنگھ نے اس تحفے کو شکریے اور اس پیغام کے ساتھ واپس کر دیا کہ یہ چیزیں تو ماکولاتِ شاہانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم غریب تو بھنے ہوئے چنوں پر ہی گزارا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی سردار لہنا سنگھ نے ایک خطیر نذرانہ بھی بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ احمد شاہ اِس کی کسرِ نفسی اور شائستہ مزاجی کی وجہ سے بہت خوش ہوا اور ماسوائے قلعہ کے لاہور اور اس کے قرب وجوار کا تمام علاقہ سردار لہنا سنگھ کو بخش دیا۔

لاہور میں احمد شاہ ابدالی کے قیام کو ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ اسے فوراً واپس جانا پڑا۔ اس کی اچانک واپسی کی ایک اہم وجہ اس کی بیماری بھی تھی۔

ابدالی کی وفات

احمد شاہ ابدالی اپنی علالت کے باوجود انتہائی سرعت کے ساتھ خراسان پہنچا، جہاں اسی کے بھائی نے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ احمد شاہ کو اس بغاوت کے فرو کرنے میں خاصی مشکل پیش آئی۔ بالآخر وہ امن وامان قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہاں اپنا

نائب مقرر کرنے کے بعد واپس قندھار آ گیا۔اس کے بعد اس کی بیماری خطرناک صورت اختیار کر گئی۔اور وہ کئی سال تک مسلسل بیمار رہنے کے بعد جون ۱۷۷۳ء میں فوت ہو گیا۔

احمد شاہ کی وفات کے بعد وزیر اعظم شاہ ولی خان نے بادشاہ کے دوسرے بیٹے سلیمان شاہ، جو وزیر کا داماد بھی تھا، کو افغانستان کے تخت پر بٹھا دیا اور اس کی جانشینی کا اعلان کر دیا جبکہ بڑا شہزادہ تیمور شاہ اپنے باپ کی وفات کے وقت ہرات میں تھا۔جونہی شہزادہ تیمور شاہ کو اپنے باپ کی وفات اور سلیمان شاہ کی تخت نشینی کی خبر ملی تو وہ برق رفتاری سے قندھار پہنچا۔لیکن اس کے چھوٹے بھائی سلیمان شاہ نے خود ہی اپنے بڑے بھائی تیمور شاہ کے حق میں تخت سے دست برداری کا اعلان کرا دیا۔اور اس طرح ۱۷۷۳ء میں تیمور شاہ اپنے باپ کا جانشین ہوا۔

شخصیت و کردار

احمد شاہ ابدالی نے زندگی کی ابتداء نہایت معمولی حیثیت سے کی لیکن محض خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایک عظیم الشان بادشاہ کے مرتبے کو پہنچا۔نادر شاہ نے احمد شاہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ احمد شاہ جیسی شخصیت اور قابلیت کا انسان میں نے ایران، توران اور برصغیر میں کہیں نہیں پایا۔احمد شاہ ابدالی ایشیاء میں اپنے زمانے کا ایک ممتاز ترین بادشاہ تھا۔اس نے ایک طویل عرصے تک اپنے زیرِ اقتدار علاقوں کا انتظام نہایت کامیابی کے ساتھ چلایا۔اس نے زندگی میں بے شمار جنگیں لڑیں، لیکن ہر بار کامیابی سے ہمکنار رہا۔اس کی پوری زندگی مہمات سے عبارت ہے۔ جنہیں اس نے بڑی حوصلہ مندی اور جرأت کے ساتھ سر کیا۔اس کی زندگی انتھک جدوجہد کی درخشندہ اور قابلِ تقلید مثال ہے۔

احمد شاہ غریبوں اور ضرورتمندوں کا سہارا تھا۔وہ اپنی رعایا کا غمخوار اور ہمدرد تھا اور ہمیشہ ان کی خوشحالی کے لئے کوشاں رہتا تھا، لیکن دشمنوں اور باغیوں کے ساتھ اس کا سلوک رحم سے خالی ہوتا تھا۔مخالفین کے لئے عفو و عطا اس کے آئینِ جہانبانی میں شامل نہ

تھی۔ ایسے لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ نہایت سخت ہوتا تھا۔ برصغیر کے بعض غیر مسلم مورخین احمد شاہ ابدالی پر مذہبی تعصب میں مبتلا ہونے کی تہمت لگاتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ الزام تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے۔ سکھوں کے ساتھ احمد شاہ ابدالی کی مسلسل جنگوں کی وجہ خود سکھوں کا مسلم آبادی کے ساتھ غیر انسانی سلوک تھا۔ اس کے پنجاب پر حملے، سکھوں کی مسلم کش پالیسی کا ردِعمل تھے۔ اگر احمد شاہ ابدالی ایک متعصب بادشاہ ہوتا تو وہ کابلی مل کو ہرگز پنجاب کا گورنر مقرر نہ کرتا۔ مزید برآں اس نے راجا جوڑامل، سکھ جیون مل اور ہری سنگھ کے علاوہ دیگر کئی ہندوؤں کو اپنے مقبوضہ علاقوں میں اہم عہدوں پر فائز کیا۔ سکھ جیون مل کشمیر کا گورنر تھا۔ اور اس نے احمد شاہ کے ماتحت ہونے کے باوجود ابدالی کے خلاف ہی بغاوت کی تھی۔ احمد شاہ علماء، ہنرمندوں اور بہادروں کا قدردان تھا۔ خاصی بڑی تعداد میں علماء اور فضلاء اس کے دربار سے وابستہ تھے۔

بحیثیت سپہ سالار

احمد شاہ ابدالی، بادشاہ نادر شاہ کی فوج میں سپاہی تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اپنی خداداد قابلیت اور شجاعت کی وجہ سے نادری فوج کا ایک اعلیٰ افسر بن گیا۔ اس نے کئی معرکوں میں اپنی شجاعت اور جنگی سُوجھ بوجھ کا لوہا منوایا۔ احمد شاہ کو نہ صرف اپنے زمانے بلکہ ہر زمانے کے صفِ اول کے جرنیلوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مورخین نے احمد شاہ کو ایران کا نپولین لکھا ہے۔ اس نے بڑے بڑے جرنیلوں کو اپنی جنگی چالوں سے نیچا دکھایا۔ جنگ کے دوران احمد شاہ ہمیشہ صفِ اوّل میں ہوتا تھا۔ احمد شاہ جرأت اور شجاعت کے علاوہ ٹھنڈے دِل اور دماغ کا مالک تھا۔ وہ ایک دور اندیش اور صائب الرائے جرنیل تھا۔ ابدالی نے اپنی فوجی سُوجھ بُوجھ اور جنگی تدبر سے پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کے کثیر التعداد لشکر کو شکست فاش دی۔ اس نے مرہٹوں کی رسد اور کمک کے راستے بند کر کے کافی عرصے تک تصادم کو ٹالا۔ جس کی وجہ سے مرہٹہ لشکر خوراک کی قلت کا شکار ہو کر نیم مردہ ہو گیا۔ اس کے بعد احمد شاہ نے اس پر شدید حملہ کیا جس سے ناقابلِ تسخیر

مرہٹہ قوت پاش پاش ہوگئی۔ اس کی انہی صلاحیتوں کی وجہ سے سکھ اس کے خلاف کھلے میدان میں ٹکر لینے سے گھبراتے تھے۔ اگر سکھ اس سے کھلے میدان میں جنگ لڑتے تو ان کا انجام بھی یقیناً مرہٹوں سے مختلف نہ ہوتا۔

المختصر احمد شاہ ابدالی میں وہ تمام خوبیاں موجود تھی جو ایک بادشاہ اور ایک جرنیل کے لئے ضروری ہیں۔ اس کے کردار کی بلندی کی ایک ہی مثال کافی ہے کہ تختِ دہلی اس کے قدموں میں پڑا تھا اور وہ بڑی آسانی سے مغل حکومت کو ختم کر کے افغان حکومت کی بنیاد ڈال سکتا تھا۔ مگر اس نے کبھی ان خطوط پر سوچا تک نہیں تھا۔ اور ہر بار تختِ دہلی کو اس کے حقیقی وارثوں کے سپرد کر کے واپس چلا جاتا رہا۔

ابدالی کے حملوں کا پنجاب پر اثر

احمد شاہ ابدالی نے برصغیر پر آٹھ حملے کئے اور ان حملوں سے پنجاب پر کئی قسم کے اثرات مرتب ہوئے۔ یہاں چند اہم اثرات کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

ا۔ سیاسی اثرات

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات تک برصغیر میں مغلوں کے علاوہ کوئی سیاسی قوت موجود نہ تھی۔ مغل دربار ہی سیاسی اثرات کا منبع تھا۔ لیکن اورنگ زیب کے بعد مغلوں کا آفتابِ نصف النہار روبہ زوال ہوا اور آہستہ آہستہ ان کے اقتدار کی حدود محدود ہونا شروع ہوگئیں۔

برصغیر پر مغلوں کی سیاسی برتری قصہ ماضی بن گئی اور مغل دربار عظمتِ رفتہ کا عزاخانہ۔ اس دربار میں بادشاہ تھے مگر وہ ''جہاں پناہ نہ تھے'' یہ بادشاہ ایسے تخت پر جلوہ افروز تھے جس کا ''بخت'' ڈھل چکا تھا۔ ان کے سر پر تاج تو تھا، لیکن سایۂ ہُما رخصت ہو چکا تھا۔ اس دربار میں باتدبیر وزیر بھی تھے لیکن اب ان کے دماغ، دربار میں اپنے دھڑے کے استحکام کی تدابیر کے علاوہ کچھ سوچ نہ سکتے تھے۔ اس دربار سے ایک بڑی فوج وابستہ تھی لیکن اس کا مصرف محض اپنوں ہی کے گلے کاٹنا رہ گیا تھا۔

مرکز بے اختیار ہو چکا تھا۔ اور صوبے خود مختار۔ اس پر نادر شاہ کا حملہ ڈگمگاتی کشتی کے لئے طوفان کا آخری تھپیڑا ثابت ہوا۔ غرض مغلیہ سلطنت کے اضمحلال کے ساتھ ہی مختلف قوتیں ابھرنا شروع ہوئیں۔ بنگال میں انگریز، دکن میں مرہٹے اور پنجاب میں سکھ۔ ان قوتوں میں براہِ راست تصادم ایک فطری عمل تھا۔ لیکن اس مرحلے سے قبل ہی احمد شاہ ابدالی نے برصغیر پر حملوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ جس کی وجہ سے پنجاب کے سیاسی حالات نے یکا یک پلٹا کھایا۔ احمد شاہ ابدلی نے پنجاب پر آٹھ حملے کئے، جن میں سے اس کا پانچواں حملہ (۱۷۶۱ء) زبردست سیاسی اہمیت کا حامل تھا۔ اس حملے میں اس نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو فیصلہ کن شکست دی اور مرہٹہ قوت کا شیرازہ بکھر گیا۔ مرہٹوں کی شکست کی صورت میں قدرت نے مغلوں کو سنبھلنے کا ایک موقعہ دیا۔ مگر طاؤس و رباب کے دلدادے شمشیر وسناں کے وارث نہ بن سکے۔

اب برصغیر میں صرف دو سیاسی قوتیں رہ گئی تھیں۔ ایک انگریز اور دوسرے سکھ۔ پانی پت کی لڑائی کا سب سے زیادہ فائدہ انگریزوں کو ہوا۔ جنہیں دہلی تک روکنے والا اب کوئی نہ تھا اور پنجاب کی حد تک سکھوں کا سیاسی اقتدار مسلّم ہو چکا تھا۔ سکھ شروع میں تو محض ایک مذہبی قسم کا غیر منظم گروہ تھا، مگر چھٹے گورو ہرگوبند سنگھ نے سکھوں کو ایک منظم اور طاقتور سیاسی دھڑے میں تبدیل کر دیا۔ سکھوں نے اپنی کاروائیاں صرف عوام تک ہی محدود رکھیں۔ انہوں نے احمد شاہ ابدالی سے کھلی جنگ سے احتراز کیا، جس کی وجہ سے ان کی قوت محفوظ رہی اور بالآخر وہ پنجاب کا سیاسی اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا سب سے بڑا اثر جو پنجاب کے سیاسی اُفق پر نمودار ہوا، وہ یہ تھا کہ پنجاب میں مغل اقتدار قطعاً ختم ہو گیا۔ پنجاب کے نامور مغل گورنر معین الملک میر منو کو ابدالی کے کئی حملے روکنے پڑے۔ جس کی وجہ سے اس کی قوت جو وہ پنجاب میں مغل حکومت کے استحکام اور سکھ قوت کے استیصال کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا، ختم ہو گئی۔ بعض مؤرخین اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر ابدالی میر منو کی فوجی طاقت کو قائم رہنے دیتا تو بہت ممکن تھا کہ دم توڑتی ہوئی مغل سلطنت کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز میر منو کے

ہاتھوں پنجاب سے ہوتا۔ لیکن ابدالی کے پے در پے حملوں کے باعث پنجاب سے مغل حکومت کا خاتمہ وقت سے پہلے ہی ہو گیا۔ اور سکھوں کو بغیر کسی مزاحمت کے پنجاب میں اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کا سنہری موقع مل گیا۔

۲۔ معاشرتی اثرات

پنجاب ہندوستان کی شمالی سرحد پر آخری صوبہ تھا۔ اس لئے شمالی جانب سے وارد ہونے والے حملہ آوروں کا پہلا نشانہ پنجاب ہی بنتا تھا۔ سکندر یونانی سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک سب حملہ آوروں نے پہلے پنجاب کو مسخر کیا، پھر آگے بڑھے۔ اسی لئے پنجاب ''باب الہند'' کہلاتا تھا یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ برصغیر پر نازل ہونے والی ہر آفت کا اوّلین ہدف اہلِ پنجاب ہی بنے۔ اس لئے پنجاب کی تاریخ میں ایسے وقفے بہت کم نظر آتے ہیں جو پنجاب میں مکمل امن وسکون کی یادگار ہوں۔ ورنہ پنجاب کی معاشرتی زندگی تو ہمیشہ ہی اضطراب کا شکار رہی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے بعد اقتدار کے لئے اکثر جنگیں پنجاب ہی میں ہوئیں۔ جس کی وجہ سے پنجاب کی معاشرتی زندگی امن وسکون سے محروم ہو گئی۔ نادر شاہ کے حملے نے سارا معاشرتی ڈھانچا درہم برہم کر دیا اس کے بعد مرہٹے وحشت و بربریت کی علامت بن کر آئے اور اہل پنجاب کی زندگی کی تلخیوں میں اضافے کا باعث بنے۔ اور اب احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی وجہ سے عمل اور ردِ عمل کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ یعنی سکھ لوٹ مار کرتے اور احمد شاہ ابدالی ان کی سرکوبی کے لئے پنجاب میں آتا۔ تو وہ پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپ جاتے اور جب احمد شاہ ابدالی واپس چلا جاتا تو پھر اپنی کمین گاہوں سے نکل کر لوٹ مار شروع کر دیتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ لاہور کی حکومت کے کارندے آس پاس کے دیہاتوں سے محصولات وصول کر لیتے، لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد سکھ آدھمکتے کہ ہمیں لگان مالیہ ادا کرو۔ جب غریب عوام نہ دے پاتے تو وہ ان پر ظلم کرتے۔ یوں یہ تمام عرصہ پنجاب کے مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان زندگی گزارتے تھے۔ معاشرتی

زندگی میں امن وسکون واطمینان نام کو بھی نہ تھا۔ ان حالات میں اکثر لوگ پنجاب چھوڑ کر نسبتاً پرامن علاقوں میں چلے گئے۔ بہت عرصہ کے بعد سکھوں کی حکومت مستحکم ہوئی اور رنجیت سنگھ پنجاب کا حکمران ہوا، تب کہیں معاشرتی زندگی معمول پر آئی۔

۳۔ اقتصادی اثرات

سرزمینِ پنجاب دنیا کے چند زرخیز ترین خطوں میں سے ہے۔ متحدہ ہندوستان کی تمام غذائی ضروریات پنجاب کی زرعی پیداوار سے پوری ہوتی تھیں۔ یہ تو زمانہ امن کی بات ہے۔ لیکن جب عوام ہی غیر تسلی بخش صورتِ حال کا شکار ہوں اور ہر وقت انہیں اپنی جان و مال کا دھڑکا لگا ہوا ہو تو اس عالم میں وہ زراعت پر کس طرح توجہ دے سکتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، اٹھارہویں صدی میں پنجاب کے عوام ایک اضطرابِ مسلسل میں مبتلا رہے۔ مغلوں کی خانہ جنگی، نادر شاہ کا حملہ، مرہٹوں کی یلغار، احمد شاہ کی یورش اور سکھوں کی غارت گری کی وجہ سے پنجاب کی اقتصادی حالت بالکل تباہ ہوگئی۔ ان کے علاوہ اٹھارہویں صدی میں پنجاب میں دو خوفناک قحط بھی رونما ہوئے جن کے نتیجے میں زندگی سے معمور ہزاروں بستیوں پر موت کا سناٹا طاری ہوگیا۔ ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ ایسے میں زراعت جس پر کہ پنجاب کی خوشحالی کا دارومدار تھا، کا ہوش کسے ہوتا۔

پنجاب کی معاشی بدحالی کی ایک اور وجہ برصغیر میں یورپی مال کی آمد تھی۔ اِس سے قبل برصغیر کی کئی مصنوعات خصوصاً کپڑا برآمد کیا جاتا تھا، جس کی بیرونی منڈیوں میں بڑی مانگ تھی۔ لیکن جب انگریزوں کو برصغیر میں اثر و نفوذ حاصل ہوا اس وقت یورپ میں صنعتی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ جب مشینی مصنوعات برصغیر میں آئیں تو پنجاب کا دستکار اور ہنرمند طبقہ بحران کا شکار ہوگیا۔ جس سے بحیثیت مجموعی پنجاب کی حالت مزید دگرگوں ہو گئی۔

احمد شاہ ابدالی اور سکھوں کی طویل چپقلش کی وجہ سے پنجاب کے عوام کی پریشان حالی میں بہت اضافہ ہوگیا۔ جب سکھ غارت گری کرتے تو احمد شاہ آجاتا جس پر

سکھ بھاگ جاتے اور جب احمد شاہ واپس جاتا تو سکھ دوبارہ اپنی کاروائیاں شروع کر دیتے۔لوٹ ماران کا معمول بن گیا۔کھڑی فصلوں کو تباہ کر دیتے۔باہر کھیتوں میں پڑے ہوئے غلّے کے ڈھیر اٹھا کر لے جاتے۔مروّجہ محصولات کے علاوہ انہوں نے ایک اور نیا ٹیکس بھی عوام پر عائد کیا جسے وہ ''راکھی'' کہتے تھے۔زرعی پیداوار پر بھی انہوں نے پانچواں حصّہ مرہٹوں کے ''چوتھ'' کی طرح وصول کرنا شروع کر دیا۔

ان تمام عوامل نے پنجاب کی معاشی حات پر بہت بُرا اثر ڈالا۔اور پنجاب کے عوام غربت اور افلاس کے گرداب میں پھنس گئے۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ جہاں آج تک سود کا نام تک نہ تھا وہاں بھی سودی کاروبار شروع ہو گیا۔کاشتکار طبقے نے مجبور ہو کر ہندو بنیوں سے سود پر قرض حاصل کر کے اپنی مالی حالت کو سہارا دینا چاہا۔لیکن وہ ایک مشکل سے نکلنے کی کوشش میں دوسری مشکل میں گرفتار ہو گئے۔جو پہلی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔سودی کاروبار کے عام ہونے کی وجہ سے پنجاب کی اقتصادیات مکمل طور پر مہاجنوں کے قابو میں آ گئی۔اور مسلمانوں کی معاشی پسماندگی میں اضافہ ہو گیا۔

سکھّوں کی کامیابی کی اہم وجوہات

علامہ ابنِ خلدون کا یہ قول سکھوں پر مکمل طور پر صادق آتا ہے کہ اگر کوئی قوم باہمی اتفاق اور عصبیت کے جذبہ سے سرشار ہو کر کسی بھی بیرونی یا اندرونی طاقت کے خلاف برسرِ پیکار ہو تو یقیناً وہی کامیاب ہو گی۔لیکن اس قوم کو اقتدار بھی اس وقت تک حاصل رہے گا جب تک ان میں عصبیت کا جذبہ کارفرما رہے گا۔لیکن اگر یہ تعصب مذہبی نوعیت کا ہو تو اس قوم کی طاقت دوگنا ہو جائے گی۔سکھ مت کو قبول کرنے والے زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ہندو معاشرے میں گھٹیا اور حقیر متصور ہوتے تھے۔یعنی شودر وغیرہ اور جب انہوں نے آزادی کی فضا میں سانس لی اور برابری کے ثمرات چکھے تو ان کی دنیا ہی بدل گئی۔اور وہ اپنے مسلک اور اس کے رہنماؤں کی ناموس کی حفاظت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہو گئے،جس کی بدولت انہیں زندگی کی نعمتیں حاصل ہوئیں۔لہٰذا جب

سکھوں نے سیاسی برتری حاصل کرنے کے لئے کوششیں شروع کیں تو یہ مذہبی تعصب اور جذبہ قربانی ان کی کامیابی کی دلیل محکم بن گیا اور بالآخر وہ کامیاب ہوئے۔ دہلی کے نااہل حکمرانوں کی بے راہرویوں کی وجہ سے سکھوں کو ان کا مقصد جلد ہی حاصل ہو گیا۔ مغل حکمران عیش کوشی میں مصروف رہے اور سکھ اپنی طاقت بڑھاتے رہے اور وہ اِس حد تک طاقتور ہو گئے کہ دلی کی کمزور حکومت ان کے سامنے بے بس ہو گئی۔ سکھ پنجابی عوام کے ساتھ جو چاہتے سلوک کرتے لیکن تاجِ دہلی کے نمائندے صرف حسرت سے ان واقعات کو دیکھتے رہتے اور عملاً کچھ نہ کر سکتے۔

جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب کے زمانے میں سکھوں اور مسلمانوں میں نفرت کی ایسی خلیج حائل ہو گئی جس کا پاٹنا ناممکن ہو گیا۔ ان بادشاہوں کے زمانے میں اس پنتھ کے گوروؤں اور ان کے خاص چیلوں پر کافی زیادتیاں ہوئیں، جبکہ تدبّر کا تقاضا یہ تھا کہ سکھوں کو طاقت کی بجائے حکمت سے رام کیا جاتا۔ طاقت کے غیر ضروری استعمال کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے کی اصلاح کا داعی اور امن و صلح کا پرچارک یہ گروہ وحشت و بربریت اور بہیمانہ عزائم کا مالک ایک کثیر التعداد ''دَل'' میں تبدیل ہو گیا اور پنجاب کے مسلمان ایک لمبی مدّت تک سکھوں کی غارت گری کا شکار رہے۔ جبکہ مرکز ان کی کوئی مدد نہ کر سکا۔

احمد شاہ ابدالی کے مسلسل حملوں کی وجہ سے بھی پنجاب کی انتظامی اور معاشرتی صورتِ حال مزید بدتر ہو گئی۔ احمد شاہ لوٹ مار کر کے جاتا تو سکھ کمین گاہوں سے نکل کر اپنی بہیمانہ کاروائیاں شروع کر دیتے۔ جس سے ہر طرف ایک شدید بے چینی پھیل گئی اور لوگ پنجاب سے ترکِ وَطن کر کے دوسرے صوبوں میں جانے لگے۔ کئی سربرآوردہ مسلمان گھرانے تو بھاگ گئے اور جو باقی بچے انہوں نے طوعاً و کرہاً سکھوں کی سرداری قبول کر لی۔ یوں سکھوں کے لئے میدان ہموار ہو گیا۔ عوام بھی اِس طوائف الملوکی سے تنگ آ چکے تھے۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ حالات کا کوئی رخ تو متعین ہو۔ چونکہ دہلی کے حکمران تو پنجاب میں پہلے ہی بازی ہار چکے تھے۔ اب کابل میں احمد شاہ ابدالی کے جانشین بھی کسی قابل نہ تھے اور میدان سکھوں کے لئے خالی تھا۔

سکھوں میں اس جدوجہد کے آغاز سے لے کر آخر تک مکمل وحدتِ فکر و عمل کارفرما رہی۔ اس تمام عرصے میں انہوں نے کہیں بھی اپنے اتحاد میں رخنہ نہیں پڑنے دیا۔ ان کا آپس میں تعاون مثالی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے سکھ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اور مسلمان اپنی باہمی نااتفاقی کی وجہ سے قعرِ مذلت میں گر گئے۔

سکھوں کی کامیابی کا ایک اور اہم سبب ان کا گوریلا طریقِ جنگ تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اس حکمتِ عملی کو اختیار کیا۔ اِس سے فائدہ یہ ہوا کہ کھلے میدان میں ان کی قوت تباہ ہونے سے بچ گئی۔ مسلمانوں کو اس طریق جنگ میں مہارت نہ تھی۔ وہ صرف کھلے میدان میں جم کر لڑنا جانتے تھے۔ لیکن سکھوں نے اس بات کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا کہ عام تصادم کی نوبت کبھی بھی نہ آئے اور جب احمد شاہ ابدالی ان کی سرکوبی کے لئے آتا تو وہ فوراً جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ جاتے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر سکھ کھلے میدان میں احمد شاہ کے مقابل آتے تو ان کا انجام بھی مرہٹوں جیسا ہوتا۔ مرہٹے بھی ہمیشہ گوریلا لڑائیاں لڑتے رہے، لیکن ۱۷۶۱ء میں پہلی بار کھلے میدان میں آئے اور ایسی شکست کھائی کہ پھر نہ اٹھ سکے۔

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ اِس نازک دَور میں مسلمانوں کی قیادت انتہائی درجے کی نااہل، خودغرض اور ہر قسم کی دوسری معاشرتی برائیوں میں ملوث تھی۔ جبکہ سکھوں کی قیادت حقیقتاً اعلیٰ صلاحیتوں کی مالک، بے غرض اور بے لوث تھی۔ یہ بھی ان کی کامیابی کی ایک وجہ تھی۔

سکھوں نے جدید سیاسیات کے اصولوں کے مطابق اپنی تحریک کو چلایا۔ انہوں میں مکمل فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اپنے مرکز امرتسر میں کئی اجلاس کئے۔ اور اپنا لائحہ عمل طے کیا۔ یوں سکھوں کی اتحاد کی صورت ایک ''وفاق'' کی طرح ہو گئی۔ بعد میں سکھوں کی خودمختار حکومتیں قائم ہوئیں تو تب بھی ان میں مکمل اتحاد رہا۔ کیونکہ اس اتحاد کی بنیاد مثبت، واضح اور سب کے لئے ایک جیسی اہمیت کی حامل تھی۔

سلطنت مغلیہ

۱۵۲۰ء سے ۱۵۲۵ء کے درمیانی عرصہ میں ظہیر الدین محمد نے جس کا لقب بابر (شیر) تھا ہندوستان کے خلاف پانچ مہمات کی قیادت کی۔ ۱۵۶۲ء میں بالآخر اس نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست فاش دی۔ اس طرح منگولوی سلاطین کے دور کا ہندوستان میں آغاز ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں آخری مغل شہنشاہ کے زوال تک سلطنت مغلیہ برصغیر کی تاریخ کا ایک بہت اہم اور نمایاں باب بنی رہی۔ بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو آگرہ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا جہاں مہاراجہ گوالیار نے اس کے عمدہ اور نرم سلوک کو دیکھ کر مشہور ومعروف ہیرا ''کوہ نور'' اس کو تحفتاً پیش کیا۔ ۱۵۳۰ء کے آخر میں ہمایوں بیمار ہوا اور اس کی حالت بے حد نازک ہوگئی۔ بابر نے ایک منت مانگی کہ اگر خداوندِ قدوس اس کے بیٹے کو بیماری سے نجات عطا کردے تو وہ اس کے عوض اپنی زندگی خدا کے حضور میں نذر کر دے گا۔ چنانچہ ہمایوں کو صحت عطا ہوئی اور بابر بیماری میں مبتلا ہو کر جان بحق ہو گیا۔ ہمایوں اس کا جانشین بنا لیکن اسے اپنے تاج وتخت کی حفاظت میں بڑی دشواریاں پیش آئیں حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسے ملک چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ ۱۵۵۶ء میں اس کا لڑکا اکبر جس کی عمر محض ۱۵ سال تھی تخت نشین ہوا۔ نصف صدی تک جنگ وجدال، الحاق وانضمام کے نتیجہ میں وہ بالآخر اس قابل ہوا کہ برصغیر کے سارے علاقے اور دکن کے متعدد رجواڑے اس کے مطیع ہو گئے۔ اس نے ایک نیا نظام حیات ''دین الٰہی'' کے نام سے متعارف کرانے کی کوشش کی۔ ۱۶۰۵ء میں اس کے لڑکے جہانگیر نے زمامِ سلطنت ہاتھ میں لی۔ ایک مینا بازار میں وہ ایک حسینہ مہر النساء کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوا اور اس سے شادی کر لی۔ یہی وہ مہر النساء تھی جو نور جہاں (عالم کا حسن) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اکتوبر ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کا

انتقال ہوا۔ اور لاہور کے قریب راوی کے کنارے ایک خوبصورت مقبرے میں اسے دفن کر دیا گیا۔ ۱۲۶۸ء میں شاہجہاں کے سر پر تاجِ شاہی رکھا گیا۔ وہ ایک عظیم المرتبت شہنشاہ تھے جسے تعمیرات سے بے پناہ شغف تھا۔ اس کا شاہکار ''تاج محل'' ہے جو اس نے اپنی محبوب بیگم ممتاز محل کی یادگار کے طور پر سفید سنگِ مرمر سے تعمیر کرایا تھا۔ تاج محل کے علاوہ اس کے دورِ حکومت میں لال قلعہ، جامع مسجد اور دہلی کی موتی مسجد بھی تعمیر ہوئی۔ ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کے تقریباً ۵۰ سالہ دور حکومت میں سلطنت مغلیہ وسعت اور قوت کے بام عروج پر جا پہنچی تھی۔ اس کی حکمرانی کے دوران مرہٹہ تحریک نمودار ہوئی۔ اس تحریک کی نمایاں شخصیت شیواجی کی ذات تھی جسے رابن ہڈ کی ہندوستانی نقل کہا جاسکتا ہے۔ پرتاپ گڑھ کے نیچے ایک وادی میں شیواجی نے ایک مسلمان سپہ سالار افضل خان کو اس بات پر آمادہ اور ہموار کیا کہ وہ مقابلہ کرنے والی افواج کے درمیانی فاصلہ پر ایک جگہ اس سے پر امن انداز میں صلح و دوستی کی گفت وشنید کرے۔ پھر جونہی وہ اپنے مہمان کا خیر مقدم کرنے کے لیے جھکا تو شیواجی نے افضل خان کے زیر ناف مشہور ومعروف ہتھیار ''شیر پنجہ'' گھونپ دیا۔ شیر پنجہ ایک قسم کا تیز دھار والا اور نوکدار آہنی دستانہ ہوتا تھا۔ شیواجی ۱۶۸۰ء میں فوت ہوا۔ ۱۶۹۰ء میں وسطی اور جنوبی ہندوستان کو جب اورنگزیب نے فتح کیا تو ہندوستان کی پوری تاریخ میں یہ برصغیر پہلی مرتبہ۔ ایک اقتدار اعلیٰ کے ماتحت آ گیا تھا۔ اورنگزیب اپنی اسلامی تعلیمات، دینیات اور فقہ پر کامل دستگاہ رکھنے کے لیے مشہور ہے۔ اورنگزیب کا ۱۷۰۷ء میں انتقال ہوا۔ اس نے تین بیٹے چھوڑے تھے۔ معظم، اعظم اور کام بخش۔ باپ کی جانشینی کے سلسلہ میں وہ تینوں آپس میں خوب لڑے۔ شہزادہ معظم نے بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے شہنشاہ کی حیثیت سے اپنی تاجپوشی کر لی۔ شہزادہ اعظم نے اپنی بادشاہت کا دعویٰ کیا۔ دونوں بھائیوں کی افواج ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئیں جس کے نتیجہ میں اعظم ہلاک ہو گیا۔ ۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ کا انتقال ہوا اس نے اپنے پیچھے چار بیٹے چھوڑے۔ جو باپ کے مرنے کے بعد جانشینی کے مسئلہ کو حل کرنے کی خاطر ایک دوسرے سے لڑ پڑے۔ انجام کار جہاندار شاہ تخت پر بیٹھا لیکن ۱۷۱۳ء میں اس کے چچازاد بھائی فرخ سیر نے اس سے تاج وتخت چھین لیا۔ فرخ سیر کو سید برادران نے معزول کر دیا اور رفیع

الدرجات کو ہٹا کر اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر لا بٹھایا۔ رفیع الدولہ کی وفات کے بعد بہادر شاہ کے ایک پوتے روشن اختر کو تخت نشین کیا گیا جس نے اپنا لقب محمد شاہ اختیار کر لیا۔ سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور اس کی ساری بنیادیں ہل چکی تھیں۔ چنانچہ عالم یہ تھا کہ ایک طرف تو تخت دہلی پر تاج شاہی پہنے ایک ہستی بیٹھی ہوئی تھی اور دوسری طرف مختلف صوبوں کے گورنروں (صوبہ دار) نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے اپنی علیحدہ علیحدہ ریاستیں قائم کر لیں۔ شاہی صوبہ داروں میں سے ایک ۱۷۲۴ء میں حیدر آباد کا نظام بن گیا۔ میسور حیدر علی اور اس کے بیٹے سلطان ٹیپو کے قبضہ و تصرف میں آ گیا۔ بنگال اور اودھ، روہیلکھنڈ اور مرہٹہ ریاستیں آزاد اور خود مختار مملکتیں بن گئیں۔ شمال مغرب میں سکھ طاقت اپنا لوہا منوا رہی تھیں جو دراصل گرونانک کی تعلیمات کی پیداوار تھی۔ ابھی ۱۷۴۰ء ختم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ سلطنت مغلیہ پر نزع کا عالم طاری ہو گیا۔ صرف ایک سال پہلے نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا اور دہلی کو لوٹ کر اپنے ساتھ شہرہ آفاق تختِ طاؤس بھی لے گیا تھا۔ ۱۷۴۸ء میں محمد شاہ فوت ہوا۔ اس کی وفات کے بعد جہاندار شاہ کی اولاد میں سے ایک لڑکا عالمگیر ثانی کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا۔ دہلی کو احمد شاہ ابدالی کی جارحانہ پیش قدمی اور حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ عالمگیر ثانی کو قتل کر دیا گیا اور شاہجہاں ثالث کو تخت نشین کیا گیا۔ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے مقام پر مرہٹوں کو شکست فاش دی لیکن اس نے عالمگیر ثانی کے بیٹے شاہ عالم کے وارث تخت کے دعوے کو تسلیم کر لیا۔ ۱۷۶۳ء میں احمد شاہ ابدالی دوبارہ آیا اس نے پنجاب میں سکھوں کی خوب گوشمالی کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو پیر جمانے کا موقع حاصل ہو ہی چکا تھا۔ ۱۷۵۷ء میں کلایو نے جنگ پلاسی جیت لی تھی سندھیا نے جو ایک مرہٹہ سردار تھا۔ دہلی پر تصرف و اختیار حاصل کر لیا۔ اور شاہ عالم اس کا وظیفہ خوار بن گیا لیکن اس کے باوجود شہنشاہ بلا شرکت غیرے صدر ریاست تھا اور سارے ہندوستان میں اعزاز و افتخار کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ ۱۷۹۴ء میں سندھیا فوت ہو گیا اس کا جانشین اس کا اپنا چچا زاد بھائی ہوا۔ برطانوی افواج نے لیک کی سرکردگی میں سندھیا کی فوجوں کو شکست دی اور ۱۸۰۳ء میں دارالسلطنت میں داخل ہو گئیں۔

شاہ عالم نے ولزلی سے اصولی طور پر اپنی اعلیٰ اور برتر رسمی حیثیت کو تسلیم کرنے اور

دربار میں کمپنی کے نمائندوں اور کارندوں کو شاہی روایتی آداب کو ملحوظ رکھنے کا تیقن حاصل کرنے کی کوشش کی۔ کمپنی کے ملازمین نے بادشاہ کی عزت وتوقیر اور تعظیم وتکریم کے سلسلہ میں ان تمام معمولات کو ملحوظ رکھا جو بادشاہ کے اسلاف اپنی سلطنت کے عہد شباب میں روا رکھتے تھے اور جن پر وہ عمل درآمد کرایا کرتے تھے۔ جب کوئی گورنر جنرل شاہی دارالسلطنت میں سے گزرتا تو اس کا نمائندہ تخت شاہی کے سامنے ننگے پیر کھڑا ہو جاتا اور بے حد عجز و انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے والا جاہ کی صحت وتندرستی کے بارے میں استفسار کیا کرتا۔ بعدازاں ''حاکم دوران'' کی خدمت میں انتہائی تابعدارانہ طریقے پر نذر (تحائف) پیش کیا کرتا تھا۔ ایڈورڈس اپنی کتاب ''بنگالی تہذیب کی یادیں'' میں کہتا ہے کہ ہمیں شہنشاہ کے حضور میں حاضری دینے کے لیے ننگے پیر جانا ضروری تھا۔ یہ طریقہ ہندوستان میں ہر دور میں رائج رہا۔ یہ بالعموم ادنیٰ کا اپنے اعلیٰ کے قریب جاتے وقت تعظیم وتکریم کا مظاہرہ سمجھا جاتا تھا۔ ہم جھک کر شہنشاہ کی تعظیم کیا کرتے تھے اور تختِ شاہی کے قریب پہنچنے پر یکے بعد دیگرے سونے کی مہروں سے بھری ہوئی ایک بڑی تھیلی نذر کیا کرتے۔ پھر والا جاہ کی صحت و تندرستی کے بارے میں استفسار کر کے شہنشاہ کی ترقی وخوشحالی کی دعا مانگا کرتے تھے۔ بادشاہ اس کے جواب میں انہیں خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا کرتا تھا۔ تخت دہلی سے ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ کی وابستگی اور تعلق کو عملاً کمپنی تسلیم کرتی تھی۔ واقعات اور حادثات سے بھرپور ۴۷ سال تخت نشین رہنے کے بعد شاہ عالم ۱۸۰۶ء میں فوت ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بقید حیات لڑکوں میں جو سب سے بڑا لڑکا تھا وہ تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنا لقب اکبر شاہ ثانی اختیار کیا۔ ۱۸۳۷ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو مرزا عبدالمظفر سراج الدین محمد اس کے جانشین کی حیثیت سے بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا۔ وہ ایک منفرد اور غیر معمولی قسم کا شاعر تھا۔ اس کی غزلیں بے حد پروقار، سنجیدہ، یاس انگیز اور پردرد ہونے کی وجہ سے بہت مقبول ومعروف ہیں۔

بہادر شاہ ظفر آخری مغل تاجدار تھا چنانچہ مغلیہ سلطنت ایک ظاہری اور نمائشی سلطنت کے روپ میں ۱۸۵۷ء تک چلتی رہی۔ ڈاکٹر قریشی بڑی خوش اسلوبی سے واضح الفاظ میں تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مد کے بعد جب سمندر میں جزر آتا ہے تو بعض

نشیبی حصوں میں کچھ پانی رہ جاتا ہے۔ بعینہ جب سلطنت مغلیہ کا زوال ہوا تو کچھ عرصہ تک کے لیے مسلم اقتدار کے چند مراکز باقی رہے ان میں نمایاں اور اہمیت کی حامل بنگال، اودھ، میسور اور حیدر آباد کی ریاستیں تھیں۔ بنگال کی ریاست بہت پہلے مغلوب ہو کر ختم ہو گئی۔ ۱۷۹۹ء میں میسور ایک مسلم ریاست کی حیثیت سے معدوم ہو گیا۔ اودھ نے پہلے تو جاگیر کی ہیئت اختیار کی اور پھر ۱۸۵۶ء میں اس کا انضمام عمل میں آ گیا۔ حیدر آباد ایسٹ انڈیا کمپنی کی کفالت میں آ گیا اور اسی پر تکیہ کرنے لگا۔ سلطنت مغلیہ کا پر شکوہ ایوان اقتدار خاک کا تودہ بن گیا۔ اس راکھ میں دبی ہوئی چند چنگاریاں باقی رہ گئی تھیں جو کچھ عرصہ تک سلگتی رہیں۔ لیکن پھر جیسا کہ قاعدہ ہے یہ بقیہ چنگاریاں بھی ایک ایک کر کے بجھتی چلی گئیں۔ پیشوا باجی راؤ نے سلطنت مغلیہ کے خلاف اپنی فوجی حکمت عملی کے بارے میں جو بات کہی تھی وہ بڑی حد تک درست تھی کہ "شاخوں کی قطع برید سے کیا فائدہ؟ تنے پر وار کرو، شاخیں خود بخود نیچے آ گریں گی۔" سلطنت مغلیہ کا شیرازہ پوری طرح بکھر گیا تھا۔ زوال پذیر دور میں روشنی کی کچھ کرنیں اگر نظر بھی آ رہی تھیں تو وہ محض شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۲ء۔۱۷۰۳ء) ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز (۱۸۲۴ء۔۱۷۴۶ء) اور ان کے پوتے مولانا اسمٰعیل (۱۸۳۱ء۔۱۷۸۱ء) کی تحریکات "تطہیر" اور "اصلاح" تھیں اور سید احمد بریلوی کا بہادرانہ اور سرفروشانہ مقابلہ تھا۔

اہلِ برطانیہ

بارٹولومیوڈیس (Bartalomu Dias) کے "راس الامید" کا گشت لگانے کے گیارہ سال بعد مئی ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما تین چھوٹے جہازوں اور ایک سو ساٹھ افراد پر مشتمل ایک پرتگالی بیڑے کو لے کر سلطنت دہلی کے دور میں کالی کٹ کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ ستمبر ۱۴۹۹ء میں مصالحوں سے لدے ہوئے بحری جہازوں کے ہمراہ اس کی لزبن کی جانب واپسی نے ہندوستان سے یورپی ربط وضبط کے دور کا آغاز کیا۔ ایک قلیل عرصے کے اندر ہی اندر پرتگالیوں نے گوا میں اپنی بود و باش کے لیے ایک مرکز قائم کر لیا۔ ۱۵۹۶ء اور ۱۶۰۳ء کے درمیان ولندیزی مہمات بھی روانہ کی گئیں اور ولندیزی

ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی منظم کیا گیا۔ ۱۹۶۲ء سے قبل ولندیزی تجارتی منڈیاں۔ سورت سالی پٹم اور پلی کٹ کے مقامات پر کھول دی گئیں۔

سب سے پہلا انگریز جو ہندوستان آیا وہ پادری تھامس اسٹیونس ایک عیسائی فرقے جیسوایٹ (Jesuit) کا پیرو تھا اور پناہ گزین بھی تھا۔ وہ ۱۵۷۹ء میں سرزمین گوا پر آ کر اترا۔ اکبر کے دور حکومت میں تین انگریز جان نیوبری، ولیم لیڈس اور رالف فچ ہندوستان آئے تھے۔ ہندوستان اور مشرق بعید سے انگریزوں کے تجارتی تعلقات قائم کرنے کی خواہش ان مصالحوں کی خاطر تھی جو ان کی غذا کو لذیذ اور خوش ذائقہ بناتے تھے۔ ماقبل انگریز ان مصالحوں کو ولندیزیوں سے حاصل کر لیا کرتے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ولندیزیوں نے انگریزوں سے ان مصالحوں کی بہت گراں قیمت وصول کرنی شروع کر دی۔ نتیجتاً ۲۲ ستمبر ۱۵۹۹ء کو لارڈ میر کی صدارت میں ایک جلسہ کے دوران یہ قرارداد پاس کی گئی کہ انگریزوں کی ایک انجمن کی تشکیل کی جائے جو ہندوستان سے براہ راست تجارت کرے۔ ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبتھ نے ایک کمپنی کو جس کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی تھا۔ شاہی پروانہ عطا کیا چنانچہ سب سے پہلی بار کپتان ولیم باکسنس ۱۶۰۹ء میں ایک جہاز کے ذریعے سورت کی بندرگاہ میں داخل ہوا اور ہندوستان میں آن پہنچا۔ آگرہ میں جہانگیر کے دربار تک شہنشاہ کی خدمت میں ایک انتہائی عاجزانہ معروضہ پیش کر کے رسائی حاصل کرنے کے بعد اس نے سورت میں ایک کارخانہ قائم کرنے کی اجازت طلب کی جو نامنظور کر دی گئی جس میں جیمس اول کے ایلچی کی حیثیت سے سر تھامس رو آیا تاکہ مراعات حاصل کر سکے۔ ۱۶۱۳ء میں ایک فرمان شاہی کے ذریعہ انگریزوں کو سورت میں ایک کارخانہ قائم کرنے کی اجازت عطا کر دی گئی۔ مغل حکام سے آگرہ، احمد آباد، بروچ اور سولی پٹم میں کارخانے قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی گئی۔ ۱۶۳۳ء میں بلاسپور اور ہری ہار پور میں کارخانے قائم کیے گئے۔ ۱۶۳۹ء میں ایک شخص فرانس ڈے نے ساحل کورومنڈل پر چندراگری کے نائک سے زمین کا پٹہ حاصل کر لیا۔ کوم ندی کے قریب اس قطعہ زمین پر سنٹ جارج نامی ایک قلعہ تعمیر کیا گیا۔ اس کی توسیع و ترقی ہونے کے بعد بالآخر اسے جدید شہر مدراس بننا تھا۔

۱۶۴۴ء میں شہنشاہ شاہجہاں کی جس کا ان دنوں دور حکومت تھا۔ ایک بے حد عزیز

اور منظور نظر لڑکی جہاں آراء جل گئی۔ علاج کے لیے سارے ملک کے نامور اور حاذق اطباء کو طلب کیا گیا۔ جبریل بفٹن ایک انگریز ڈاکٹر بھی علاج کرنے کے لیے قصر شاہی میں پہنچا۔ فن طب و جراحت کو مطلق کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ایک غلام نے جس کا نام عارف تھا ایک مرہم تیار کیا جس کے استعمال سے کامل صحت نصیب ہوئی۔ شہنشاہ نے ہر شخص کو خوب انعام و اکرام سے نوازا۔ جب انگریز طبیب سے کہا گیا کہ وہ جو بخشش طلب کرنا چاہے طلب کرے تو اس نے بنگال میں ایک کارخانہ قائم کرنے اور تجارتی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے ایک فرمان شاہی کی درخواست کی۔ فرمانِ شاہی عطا کر دیا گیا۔ ۱۶۵۱ء میں شہزادہ شجاع کی ایک بیگم کی سخت علالت نے ایک اور موقع عطا کیا۔ بفٹن نے شاہی محل کی بیگم کا علاج کیا اور اپنی خدمت کے صلہ میں شہزادہ سے ہیگلی میں کارخانے اور پٹنہ، قاسم بازار، ڈھاکہ اور بلاسور میں ایجنسیاں قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔

۱۶۶۰ء میں جب چارلس دوم برطانوی شہنشاہ کی شادی پرتگالی شہزادی کیتھرائن برگانزا سے ہوئی تو بمبئی اپنی پرشکوہ اور عظیم بندرگاہ کے ساتھ بطور جہیز چارلس دوم کو مل گئی۔ ۱۶۶۸ء میں چارلس نے بمبئی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا۔ ۱۶۷۲ء میں کمپنی نے بنگال کے مغل صوبہ دار شائستہ خاں سے محاصل کی ادائیگی سے معافی کا فرمان حاصل کر لیا۔ ۱۶۸۰ء میں شہنشاہ اورنگزیب نے ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے کمپنی کی تجارت اور انگریز قوم کے کاروبار میں کسی کو مزاحم ہونے کی اجازت نہیں دی گئی اور نہ کوئی ٹیکس عاید کیا گیا بجز اس دو فیصدی ٹیکس کے جو رواجاً ان کے مال تجارت پر بطور چنگی وصول کیا جاتا تھا۔ کلکتہ کی جسے اس پایۂ میز کے تیسرے پیر کا درجہ دیا جاتا ہے جس پر انگلستان کے اقتدار اعلیٰ کا نقشہ مرتب کیا گیا تھا۔ کمپنی کے ایک افسر جاب چرنوک نے گنگا کے کنارے ایک دور افتادہ ویران مقام پر ۱۶۹۰ء میں بنیاد رکھی۔ فروری ۱۶۹۱ء میں شہنشاہ کی جانب سے ایک تازہ فرمان جاری ہوا جس کی رو سے کمپنی کو تین ہزار روپیہ سالانہ ادائیگی کے عوض چنگی و محصول کی ادائیگی سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا۔ ضلع بنداون کے ایک زمیندار سوبھا سنگھ کی لوٹ مار اور ہنگامہ آرائی کی وجہ سے ۱۶۹۶ء میں انگریزوں کو ایک اور موقع ہاتھ لگا اور انہوں نے نئے کارخانے کو فوجی طور پر مضبوط اور مسلح بنانے کی اجازت حاصل کر لی۔ ۱۶۹۸ء میں مغل

حکومت نے ستونتی' کالی کتا (کلکتہ) اور گوبند پور کے قصبوں کا قطعی پٹہ سابقہ مالکان کو بارہ سو روپیہ کی ادائیگی کے عوض عطا کر دیا۔

۱۷۱۵ء میں شہنشاہ فرخ سیر علیل ہوا اور اس کا علاج انگریز ڈاکٹر ہملٹن نے کیا۔ ۱۷۱۷ء میں ایک فرمان بطور انعام جاری کیا گیا جس کی رو سے تمام سابقہ منظوریوں اور امداد کی توثیق کی گئی اور ان کے مال و اسباب پر محصول اور معائنہ کی پابندی کو بھی ختم کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں کلکتہ کے گرد و نواح میں ۳۸ قصبے انہیں بخش دیئے گئے۔ اہلِ برطانیہ تجارت سے رفتہ رفتہ تسخیر کی جانب راغب ہوئے۔ ۱۷۴۴ء سے ۱۷۶۰ء کے درمیان کرناٹک کی جنگیں لڑی گئیں۔ جس کے نتیجہ میں شمالی سرکار کے علاقوں پر تصرف حاصل ہو گیا۔ ۱۷۵۷ء یا اس کے قریب سراج الدولہ سے معرکہ آرائی ہوئی اور میر جعفر کی غداری' ہندوستانیوں کی عدم وفاداری اور کلایو کی مکارانہ سازشوں کی وجہ سے پلاسی کے میدان میں نواب کو شکست ہوئی اسی سال میر جعفر نے کمپنی کو آٹھ سو بیاسی (۸۸۲) مربع میل کا ایک بڑا وسیع رقبہ جس کو چوبیس پرگنہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے' بخش دیا۔ ۱۷۶۰ء میں میر قاسم نے کمپنی کے برادوان، مدنا پور اور چٹاگام کے اضلاع بھی عطا کر دیئے۔

یہ دور "دو عملی" اور کلایو کی "دوغلی" حکمتِ عملی کا دور تھا۔ بنگال ایک خوشحال اور مرفہ الحال منطقہ تھا۔ زرعی پیداوار اور ڈھاکہ کی ململ اور صنعتِ پارچہ بافی (ریشم) کی وجہ سے بے حد مالا مال۔ کمپنی کے افسروں نے اسے لوٹ کھسوٹ کر تباہ و برباد کر دیا۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ۱۷۵۷ء اور ۱۷۶۴ء کے درمیان کمپنی کے افسروں نے غیر قانونی رشوت کے طور پر جو تحفے تحائف وصول کیے تھے ان کی قیمت ۵۰ لاکھ پاؤنڈ تک پہنچتی ہے۔ ۱۷۶۴ء میں شہنشاہ شاہ عالم سے جنگ بکسر لڑی گئی۔ جس کے نتیجے میں ایک معاہدہ طے کیا گیا کہ بنگال کی آمدنی میں سے ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ شہنشاہ کو ادا کیا جائے گا۔

شہنشاہ کو کورہ اور الہ آباد کے صوبے سپرد کر دیئے گئے اور اس کے عوض کمپنی کو ایک دیوانی فرمان عطا ہوا جس کی رو سے بہار' بنگال اور اڑیسہ کے محاصل کی وصولی' انتظامی امور شمول دیوانی مقدمات کے فیصلے وغیرہ کمپنی کا حق قرار دیئے گئے۔ ۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۵ء تک رن ہیسٹنگز منظر پر چھایا رہا۔ یہ بالآخر بڑے بڑے جرائم اور غلط قسم کی حکمت عملی اور

سیاست کو روا رکھنے کی پاداش میں معزول و ماخوذ ہوا۔ ۱۷۹۸ء اور ۱۸۰۵ء کے درمیان نپولین کے مصر میں پہنچنے کے بعد اور ہندوستان میں برطانیہ کے بعض مدمقابل افراد سے رابطہ قائم کرنے کے بعد لارڈ ولزلی نے میسور میں ٹیپو سلطان کی قوت کو تباہ کر دیا۔ ۱۸۱۴ء اور ۱۸۱۸ء کے درمیان نیپال کے گورکھوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور اس وقت کے بعد سے یہ گورکھے برطانوی فوج میں شامل ہو کر برطانوی مفادات کے لیے لڑنے لگے۔ ۱۸۲۳ء تک مرہٹوں کا قلع قمع ہو گیا۔ ۱۸۴۰ء سکھوں کو زیر کر لیا گیا اور ان کے علاقوں پر لارڈ ڈلہوزی نے تصرف حاصل کر لیا۔ ۱۸۴۳ء میں فوجی کارروائیوں کے ذریعے سندھ کو میروں کے ہاتھوں سے چھین کر غصب کر لیا گیا۔ چارلس نیپر کے تار (Peccavi) نے اس امر کی تصدیق کی کہ اس نے گناہ کیا تھا (یہاں انگریزی کا لفظ (Sinned) استعمال کیا گیا ہے جو ذو معنی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے سندھ حاصل کر لیا۔ بجائے (Sind) کے اس نے "Sinned" لکھا تھا۔ دوسرے لغوی معنی جو ہو سکتے ہیں وہ یہ کہ اس نے گناہ کیا ہے۔ ۱۸۵۲ء کی جنگ میں انگریزوں نے برما کے ایک معتدبہ حصہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۵۶ء تک یہ ''سوداگر'' (یعنی انگریز) عملاً بلا شرکتِ غیرے سارے ہندوستان کے آقا اور مالک بن چکے تھے۔ انہوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ ہندوستان کی تمام سلطنتوں کو معدوم کر دیا اور ان سلطنتوں کے حقیقی اور قانونی ورثاء اور جانشینوں کو ان کے ان مقامات سے جہاں انہیں قوت واقتدار حاصل تھا۔ بہت دور لے جا کر رکھا۔ پیشوا کو جو مرہٹوں کی وفاداریاں حاصل کرنے پر قدرت رکھتا تھا۔ شمالی ہندوستان کے ایک دورافتادہ گاؤں میں بھیج دیا گیا۔ ٹیپو کے ورثاء کو ویلور سے کلکتہ میں منتقل کر دیا گیا۔ رنجیت سنگھ کے بیٹے کو برطانوی جزائر میں جگہ ملی جہاں کسی قسم کے فتنہ وشر کی رسائی کا امکان نہ تھا۔ کٹھ پتلی شہنشاہ قلعہ شاہجہاں میں محفوظ و مامون تھا۔ بہر طور مئی ۱۸۵۷ء میں عام بغاوت وسرکشی کا آغاز ہوا۔ جسے سپاہیوں کے غدر کا فرضی لقب دیا جاتا ہے۔ کارتوسوں کی تیاری میں جو چکنائی استعمال کی جاتی تھی وہ گائے اور سور کی چربی تھی جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ یہی اس آگ کا سبب بنی جو ''غدر'' کی صورت میں بھڑک اٹھی تھی۔ ہندوؤں کے لئے گائے ایک مقدس جانور ہے اور سور کا گوشت اسلام میں حرام ہے اس مبینہ چکنائی کے بارے میں یہ شبہ ظاہر کیا گیا کہ اس کی آڑ میں تبدیلی مذہب کی

کوشش کی جارہی ہے اور اس کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا جارہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ چنگاری افواہوں، معاندانہ باتوں اور نام نہاد ''سازشیوں'' کے ہاتھوں ''چپاتیوں'' کی گشت کی وجہ سے ایک خوفناک آگ کی طرح چہار سو پھیل گئی۔ شہزادہ فیروز بخت' سپہ سالار بخت خان' مولوی احمد اللہ' نانا صاحب اور لکشمی بائی (جھانسی کی رانی) اس جنگ آزادی کے اہم اور اصل شرکاء تھے لیکن اس آگ پر برطانوی بریگیڈوں نے قابو پالیا۔

۲۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ نے ہڈسن کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ شہنشاہ کے ساتھ ایک گھٹیا مجرم جیسا سلوک کیا گیا۔ انہیں بڑی کسمپرسی کے عالم میں نہایت تکلیف دہ مقام پر رکھا گیا چنانچہ ہر وہ انگریز مرد یا عورت جو دہلی سے گزرتا۔ جب بھی اس کا دل چاہتا شہنشاہ کے تخلیہ میں مخل ہو کر ان پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالنے کے لیے بغیر اجازت اور بلا کسی پس و پیش کے جا گھستا۔ گرفتھ جس نے شہنشاہ کو ۲۲ ستمبر کو دیکھا تھا لکھتا ہے: ''ایک عام دیسی چارپائی پر ایک تکیہ کا سہارا لیے آلتی پالتی مارے جو شخص بیٹھا نظر آرہا تھا وہ عظیم الشان سلطنت مغلیہ کا آخری نمائندہ تھا۔ میانہ قد اور ۷۰ سال سے زائد عمر کا وہ ضعیف شخص سفید لباس میں ملبوس تھا اور اسی کپڑے اور رنگ کا مخروطی شکل کا عمامہ باندھے ہوئے تھا۔ اس کے لبوں کو مطلق جنبش نہیں ہوئی۔ نہایت خاموشی کے ساتھ وہ گم سم زمین کی جانب نظریں کیے رات دن بیٹھا رہتا تھا اور اس طرح جیسے وہ اس ماحول سے قطعی بے نیاز ہو جس میں اسے لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ شاہ سے کوئی تین فٹ کے فاصلے پر ایک دوسری چارپائی پر ایک محافظ (پہریدار افسر) بیٹھا ہوا تھا۔ حالانکہ دو بے حد چاق و چوبند یورپی سنتری سنگین لگائے ہوئے دونوں جانب کھڑے ہوئے تھے انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ اگر بادشاہ کو نکال لے جانے کی کوئی کوشش کی جائے تو وہ اپنے ہاتھوں سے بادشاہ کو گولی مار دیں۔''

۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو لال قلعہ دہلی میں برطانوی فوجی کمیشن کے سامنے بادشاہ پر نام نہاد ''مقدمہ'' کی کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ شہنشاہ کے خلاف چار الزامات عائد کیے گئے۔ تیسرے نمبر پر جو الزام تھا وہ انتہائی مضحکہ خیز اور دلچسپ تھا۔ ''اور اس لیے کہ ملزم نے (شہنشاہ) ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی رعیت میں ہوتے ہوئے اور اپنی وفاداری کے

فرائض وشرائط کا خیال نہ رکھتے ہوئے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یا اس کے قریب قریب کسی دن ایک غدار کی حیثیت سے بمقام دہلی اپنے حکمران ہونے اور ہندوستان کا مقتدر اعلیٰ ہونے کا اعلان کیا۔ اور پھر غداری کر کے شہر دہلی پر غیر قانونی طور پر قبضہ کر لیا اور اپنا تصرف جما لیا۔"
کس کو کس کا وفادار ہونا چاہیے تھا یا کون کس کی وفاداری کا استحقاق رکھتا ہے۔ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی بہت بڑی دستوری اہمیت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہی الزام اس سے کہیں زیادہ شدومد کے ساتھ ان پر لگایا جا سکتا تھا جو غیر قانونی طور پر مقدمہ چلانے کے ذمہ دار تھے۔
بہر نوع اس کے باوجود دیگر الزامات کی صحت کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ چنانچہ مقدمہ چلانے والوں نے اس کا اعتراف کر لیا تھا کہ "یہ واضح طور پر سمجھ لینا ضروری ہے کہ تحقیقات وتفتیش کے دائرہ کو کسی صورت سے ان فنی نکات کو ملحوظ رکھنے کی حد تک محدود نہ ہونا چاہیے جو ایک سے کہیں زیادہ رسمی اور باقاعدہ مقدمے کے لیے ضروری ہے" مقدمہ کے وقت جج اور استغاثے کے وکلاء بادشاہ سے اس خوش خلقی تک سے پیش نہ آئے جو بالعموم عام آدمیوں تک سے برتی جاتی ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود شہنشاہ اپنی توجہ ہٹانے کے لیے اپنے مرغوب مشغلے میں مہنمک ہو جایا کرتا تھا۔ کاغذ اور قلم کی عدم موجودگی میں وہ اپنی زندان کی دیوار پر تیلی سے لکھا کرتا تھا۔ ۱۸۵۸ء میں ۹ مارچ کو مقدمہ کی کارروائی ختم ہوئی۔ ایک موقع پر یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ شہنشاہ کو سزا یافتہ مجرموں کے جزیرہ انڈیمان میں بھیج دیا جائے۔ افریقہ کو بعض دفعہ ان کی جلاوطنی کے لیے مناسب وموزوں ملک سمجھا گیا۔ سیسل بیڈن نے چینی ساحل کے شہر ہانگ کانگ بھیجنے کی رائے دی مگر بالآخر شہنشاہ کو برما کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ ان دنوں کوئی انجمن اقوام متحدہ یا سلامتی کونسل نہیں تھی جو اس معاملے میں دخل دے سکتی اور نہ کوئی بین الاقوامی عدالت انصاف کرنے کے لیے موجود تھی جس سے رجوع کیا جا سکتا۔
قانونی کثرت آراء کا یہ حتمی فیصلہ ہے کہ جائز اور قانونی مقتدر حکمران واجب التعظیم تھا اور یہ کہ مقدمہ کی کارروائی نے انصاف' عدل اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی خلاف ورزی کی تھی اور اصولوں کو توڑا تھا اور وہ نام نہاد مقدمہ بذاتِ خود ہی خارج از اختیار' دائرہ قانونی سے باہر اور ابتداء ہی سے غلط اور ناجائز تھا آخری مغل حکمران کا جلاوطنی کے عالم میں رنگون میں ۱۸۶۲ء میں انتقال ہوا۔

شاہ عالم دوم

(۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء)

شہنشاہ عزالدین عالمگیر دوم نے اپنے بڑے بیٹے شہزادہ علی گوہر کو ایک بڑی فوج کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کی دھاندلیوں کو روکنے کے لیے ۱۷۵۹ء میں بنگال کی طرف روانہ کیا چونکہ انگریزوں نے نواب سراج الدولہ کی شکست کے بعد اس کے غدار سپہ سالار میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا تھا اور کمپنی نے اس تمام کارروائی میں شاہِ دہلی کو درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر بادشاہ عالمگیر دوم نے شہزادہ علی گوہر کو بنگال کی طرف بھیجا۔ راستے میں نواب شجاع الدولہ والیِ اودھ بھی شہزادہ علی گوہر کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس طرح یہ متحدہ لشکر انگریزوں اور بنگال کے نواب میر جعفر کے خلاف روانہ ہوا۔ میر جعفر اس عظیم لشکر کی آمد کا سن کر گھبرا گیا اور اس نے انگریز گورنر لارڈ کلائیو سے رابطہ قائم کیا۔ جس نے میر جعفر کو تسلی دی اور اپنی بھرپور مدد کا وعدہ کیا۔ لیکن بنگال پہنچنے سے قبل ہی نواب شجاع الدولہ انگریزوں کی سازش کا شکار ہو گیا اور اس نے شہزادہ علی گوہر کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس صورت میں شہزادے کی فوجی قوت میں کمی آ گئی پھر بھی انگریزوں اور میر جعفر کی متحدہ فوج سے شہزادے کی فوج زیادہ تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ فوج ایک ایسی قیادت کے ماتحت تھی جس نے کاہلی اور سستی کو ہی اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ چنانچہ شہزادے نے بھی لڑے بغیر اپنے آپ کو لارڈ کلائیو کے سپرد کر دیا۔ اس مدبر سیاستدان نے شہزادہ سے بہت اچھا سلوک کیا اور ملاقات کے وقت شہزادے کے حضور میں پانچ سو اشرفیاں بطور نذرانہ پیش کیں۔ اسی اثناء میں شہزادے کو اطلاع ملی کہ شاہ عالمگیر دوم کو قتل کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس نے ایسٹ

انڈیا کمپنی کا تحفظ حاصل کر لیا اور وہیں رہائش اختیار کر کے مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔

ادھر دہلی میں وزیر غازی الدین عماد الملک نے شہزادہ علی گوہر کو نظر انداز کر کے کام بخش کے پوتے اور شہنشاہ اورنگ زیب کے پڑپوتے شہزادہ محی الملت کو تخت پر بٹھا دیا مگر اس نئے بادشاہ کو کسی نے بھی بادشاہ تسلیم نہ کیا اور صورتِ حال وزیر غازی الدین کے خلاف ہو گئی اور اسے اپنا انجام صاف نظر آنے لگا۔ ان حالات کو سنبھالنے کے لیے اس نے تدبیریں شروع کیں۔ اپنے قریبی ساتھیوں سے بھی مشورہ طلب کیا اور اپنا اقتدار بچانے کے لیے کافی دوڑ دھوپ کی۔ چنانچہ وہ دوآبہ اور آگرہ کے جاٹوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن احمد شاہ ابدالی کے ۱۷۶۱ء کے حملے کے وقت سے جاٹ اس کے تحفظ کی ذمہ داری سے دست بردار ہو گئے تھے۔ غازی الدین احمد شاہ کے خوف سے دکن کی طرف بھاگ گیا۔ بقیہ عمر اس نے وہیں گزاری۔ اور وہ ۱۸۰۰ء میں دکن میں فوت ہوا۔

جب شہزادہ علی گوہر کو بنگال میں اپنے باپ شاہ عالمگیر دوم کے قتل کی اطلاع ملی تو اس نے کلائیو کے مشورے سے بنگال میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور شاہ عالم دوم کا لقب اختیار کیا اور اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ لارڈ کلائیو نے دہلی کا تخت حاصل کرنے کے لیے شہزادہ علی گوہر کی ہر طرح سے مدد کرنے کا یقین دلایا۔ یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ عالم دوم کو برصغیر پاک و ہند میں خاندان مغلیہ کے جائز وارث کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔

جنگ بکسر

لارڈ کلائیو نے ۱۷۶۱ء میں بنگال کے نواب میر جعفر کو برطرف کر کے اس کی جگہ اس کے داماد میر قاسم کو بنگال کا نواب بنا دیا تھا۔ میر قاسم چونکہ بڑا مدبر اور بہترین منتظم تھا۔ اس نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط کو روکنے کی کوشش کی۔ اس نے دکن میں انگریزوں کی دھاندلیوں کا مفصل جائزہ لیا کہ وہاں کے باشندوں کے خون کو کس طرح نچوڑ رہے ہیں اور مقامی حکمرانوں کی کمزوریوں کی وجہ سے وہ کس حد تک معاملاتِ حکومت میں مداخلت کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے بنگال کو انگریزوں کی دسترس سے بچانے کے لیے کچھ اقدامات کیے۔ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ملی ہوئی تجارتی مراعات ختم کر دیں۔ اس میں

سب سے اہم اس محصول کا دوبارہ نفاذ تھا جو ۱۷۱۷ء سے کمپنی کو معاف کر دیا گیا تھا اور جس سے ملکی تاجروں اور حکومت کو زبردست نقصان برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ اس رعایت کو نواب میر قاسم نے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد کالعدم قرار دے دیا اور کمپنی کو محصول ادا کرنے کا حکم دیا۔ اس پر لارڈ کلائیو اور کمپنی کے دوسرے کارپرداز تلملا اٹھے کہ ان کا مقرر کردہ نواب ان کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ لہٰذا کلکتہ کونسل نے جنوری ۱۷۶۳ء کو نواب میر قاسم کو معزول کر کے دوبارہ میر جعفر کو بنگال کا حکمران بنا دیا۔ میر قاسم انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور ان کے انتقام کا نشانہ بننے سے بچنے کے لیے اپنے چند وفاداروں کے ساتھ پٹنہ پہنچا اور اس نے اپنے ایک جرمن ملازم میجر سمرو کی مدد سے ۱۲ جولائی ۱۷۶۳ء کو پٹنہ کے انگریز فوجدار ایلس اور اس کے دو سو انگریز سپاہیوں کو قتل کر دیا اور خود نواب شجاع الدولہ والئ اودھ کے پاس چلا گیا لیکن وہ اس وقت بھی انگریزوں کے ہی تحفظ میں تھا۔ نواب میر قاسم اودھ آیا تو اس نے اپنے فہم و فراست سے نواب شجاع الدولہ اور شاہ عالم دوم کو انگریزوں کے خلاف محاذ قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ ان واقعات سے قبل شاہ عالم دوم بھی نواب شجاع الدولہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ لہٰذا ان تینوں مسلمان حکمرانوں کی متحدہ فوجیں انگریزوں کے خلاف روانہ ہوئیں اور بکسر کے میدان میں ۱۷۶۴ء میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ اس جنگ میں بھی انگریزوں کو فتح ہوئی۔ نواب میر قاسم میدان سے بھاگ گیا۔ اور شاہ عالم دوم نے دوبارہ اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ لیکن نواب شجاع الدولہ والی اودھ انگریزوں کے سامنے نہ جھکا اور ایک بار پھر منظم ہو کر ''کڑا'' کے مقام پر انگریزوں کے مقابلہ پر آیا لیکن انگریز سپہ سالار میجر منرو نے اس بار بھی نواب کو شکست فاش دی۔

اس جنگ میں فتح کے بعد برصغیر میں کمپنی بہادر کی سیادت مسلم ہوگئی اور اس جنگ کے نتیجے کے طور پر الہ آباد کے مقام پر اگست ۱۷۶۵ء میں لارڈ کلائیو نواب شجاع الدولہ اور شاہ عالم دوم میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے کمپنی کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل ہوگئی اور کمپنی نے چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ بادشاہ شاہ عالم دوم کو ادا کرنا منظور کیا اور الہ آباد اور کڑا کے اضلاع بادشاہ کے ذاتی تصرف میں دے دیے۔ نواب شجاع الدولہ کو پچاس لاکھ روپیہ تاوانِ جنگ ادا کرنا پڑا۔ اسے اودھ میں انگریز فوج کو مستقل طور پر رکھنا پڑا اور

انگریزوں نے اس کے عوض نواب کو اس کا علاقہ واپس کر دیا۔ کمپنی نے شاہ عالم دوم کو بھی ہند کا بادشاہ تسلیم کر لیا۔

شاہ عالم دوم، وزیر غازی الدین اور دہلی دربار کے امرا کی سازشوں سے اس قدر خوف زدہ ہو گیا تھا کہ وہ ۱۷۵۹ء سے ۱۷۷۲ء تک بنگال ہی میں رہا اور اس نے دہلی کی طرف آنے کی جرات نہ کی۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کے خلاف پانی پت کے میدان میں شاندار فتح حاصل کی تو اس نے بادشاہ شاہ عالم دوم کو دہلی کا بادشاہ مقرر کر دیا تھا لیکن وہ پھر بھی دہلی نہ آیا تھا۔ جب دہلی کے عوام اور دیگر امراء نے جو اس کے وفادار تھے اس کو لاتعداد خطوط لکھے اور سیاسی حالات بھی اس کے حق میں سازگار ہو گئے تھے تو بادشاہ نے دہلی آنے کا ارادہ کیا۔ وہ ۱۳ جنوری ۱۷۷۲ء کو دہلی میں واپس آیا۔ وہ تقریباً بارہ سال دربار سے دور رہا۔ ۱۸۰۳ء میں ایک مرہٹہ سردار مادھو سندھیا نے دہلی پر حملہ کر دیا۔ لارڈ لیک نے اس کو شکست دے کر شاہ عالم کو اپنی پناہ میں لے لیا اور براہِ راست دہلی کا نظم ونسق سنبھال لیا۔ اس واقعہ سے مغل دربار کی سیاسی برتر مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ بادشاہ کی سالانہ پنشن مقرر کر دی گئی۔ اور برصغیر میں انگریزوں کی عملداری قائم ہو گئی۔

شاہ عالم دوم تین سال (۱۸۰۳ء تا ۱۸۰۶ء) انگریزوں کا وظیفہ خوار رہنے کے بعد ۲۷ دسمبر ۱۸۰۶ء کو اکیاسی سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد انگریزوں نے اس کے بیٹے معین الدین کو ابوالناصر اکبر شاہ دوم کے لقب سے تخت نشین کیا۔ اور اب بادشاہ کے اختیارات صرف لال قلعہ تک ہی محدود تھے۔ آمدنی کا ذریعہ صرف وہ پنشن تھی، جو انگریزوں نے مقرر کر رکھی تھی۔ اکبر شاہ ثانی تیس برس برائے نام بادشاہت کرنے کے بعد فوت ہوا تو ۱۸۳۸ء میں سراج الدین ظفر ابوالناصر بہادر شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ جسے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی قیادت کرنے کے الزام میں قید کر کے رنگون جلاوطن کر دیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر اس حسرت و یاس کے عالم میں ۱۸۶۲ء میں بندِ حیات اور بندِ قفس دونوں سے آزاد ہو گیا۔ بہادر شاہ کی معزولی کے ساتھ ہی برصغیر سے مغل خاندان کا آخری نشان بھی مٹ گیا اور تمام برصغیر پر انگریزوں کا اقتدارِ عالی قائم ہو گیا۔

5- شوکت پلازہ 16/B ٹیمپل روڈ صنانوالہ چوک لاہور
فون: 042-6302904 - 7005287
ای میل: alasrpublications@yahoo.com